مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

سیارہ ڈائجسٹ

جولائی 2015

رمضان رحمت

رمضان ۔۔۔ گناہوں کی تلافی کا مہینہ

روزے کی حکمت

القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانعام

اے محمدؐ! ان سے پوچھو کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان اور جبکہ اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اب ہم الٹے پاؤں پھر جائیں؟ کیا ہم اپنا حال اس شخص کا سا کرلیں جسے شیطانوں نے صحرا میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران و سرگرداں پھر رہا ہو۔ درآں حالے کہ اس کے ساتھی اسے پکار رہے ہوں کہ ادھر آ یہ سیدھی راہ موجود ہے؟ کہو حقیقت میں صحیح رہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے اور اس کی طرف سے ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ مالک کائنات کے آگے سر اطاعت خم کردو نماز قائم کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور جس دن وہ کہے گا کہ حشر ہو جائے اسی دن وہ ہو جائے گا۔ اس کا ارشاد عین حق ہے اور جس روز صور پھونکا جائے گا اس روز بادشاہی اسی کی ہوگی وہ غیب اور شہادت ہر چیز کا عالم ہے اور دانا اور باخبر ہے۔

(آیات ۷۱ تا ۷۳) (حوالہ تفہیم القرآن از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

الحدیث

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محض بھوکے پیاسے رہنے کا نام روزہ نہیں

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے جس شخص نے (روزہ رکھنے کے باوجود) جھوٹ بات کہنا اور اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑا تو اللہ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ بھوکا اور پیاسا رہتا ہے۔

تشریح: یعنی روزہ رکھوانے سے اللہ تعالیٰ کو مقصود انسان کو نیک بنانا ہے اگر وہ نیک ہی نہ بنا اور سچائی پر اس نے اپنی زندگی کی عمارت نہیں اٹھائی رمضان میں بھی باطل اور ناحق بات کہتا اور کرتا رہا اور رمضان کے باہر بھی اس کی زندگی میں سچائی نہیں دکھائی دیتی تو ایسے شخص کو سوچنا چاہیے کہ وہ آخر کیوں صبح سے شام تک کھانے اور پینے سے رُکا رہا۔

اس حدیث کا مقصود یہ ہے کہ روزہ دار کو روزہ رکھنے کے مقصد اور اس کی اصل روح سے واقف ہونا چاہیے اور ہر وقت اس بات کو ذہن میں تازہ رکھنا چاہیے کہ کیوں کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔

(بحوالہ: فرمان رسولؐ نمبر۔ سیارہ ڈائجسٹ)

اس شمارے میں......

خواتین کارنر

www.facebook.com/sayyaradigest
Email:editorsayyara@yahoo.com
sayyaradigest@gmail.com
editorsayyara@hotmail.com
Phone:92-042-37245412
Mobile:0300-9430206

جلد 52 - شمارہ 7 - جولائی 2015ء

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

ماہنامہ سیّارہ ڈائجسٹ لاہور

مدیر اعلیٰ
امجد رؤف خان

مدیر منتظم
کامران امجد خان

مدیر : محمد ثاقب

معاون مدیران : جویریہ کامران ۔ رؤفی خان ۔ فرحان امجد

سرکولیشن منیجر : بشیر احمد

مارکیٹنگ منیجر : خرم احمد خان ۔ 0333-4207684

گرافک ڈیزائنر : عماد رزاق

نگران پرنٹنگ : خالد محمود ۔

طابع : اللہ والا پرنٹرز شاہراہِ قائد اعظم لاہور

شعبہ اشتہارات :
لاہور — خرم احمد خان ۔ 0333-4207684
طارق محمود ۔ 0300-4144781
کراچی — محمد عابد مرزا ۔ 0321-3758492

مجلس مشاورت
شوکت افضل، رفیق غوری
ریاض آفندی، فیاض عمر، عارف محمود ایل

قیمت 80 روپے

امجد رؤف خان پبلشر نے اللہ والا پرنٹرز سے چھپوا کر
240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور سے شائع کیا۔

اظہار خیال

جان کا نذرانہ دینے والے

محترم جناب مدیر اعلیٰ صاحب

السلام علیکم!

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حفظ و امان میں رکھے (آمین) اور شکر گزار ہوں کہ تحریروں کو اشاعت کا موقع نصیب ہو رہا ہے۔ سانحہ صفورا گوٹھ نے ہر پاکستانی کیا ہر درد مند دل رکھنے والے کو لرزہ دیا تھا اس سے قبل بھی کئی لرزہ خیز واقعات رونما ہو چکے ہیں لیکن بحیثیت قوم ہم پاکستانی ہر سانحہ پر اتحاد و تنظیم و ضبط کا مظاہرہ کرتے آئے ہیں کیونکہ دشمن ہماری تاریخ سے ناواقف ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ پاکستان بنانے والوں کی اولادیں پاکستان کی تعمیر و ترقی کے لئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرنے کو تیار ہیں۔

انشاء اللہ قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی ہم سرخرو ہوں گے اور بہت جلد سرخرو ہوں گے۔ دشمن کے ناپاک عزائم جلد خاک میں ملنے والے ہیں انشاء اللہ۔ سلام ان ماؤں کو جن کے سرفروش بیٹے وطن کی حفاظت میں جانوں کے نذرانے پیش کر رہے ہیں۔ سلام ان پر جو دشمن کے ناپاک عزائم ناکام بناتے ہوئے جام شہادت نوش کر رہے ہیں۔

ایک تحریر اور ارسال کر رہا ہوں امید ہے شائع ہو جائے گی۔

(نیئر رضاوی)

تنقیدی خطوط

محترم جناب امجد رؤف خان صاحب

السلام علیکم!

بعد آداب کے عرض یہ ہے کہ ماہ اپریل 15ء کے شمارہ میں آپ کے ایڈیٹر صاحب کو ایک خط لکھا تھا جس میں صغیرہ بانو شیریں کے انتقال کی خبر دی تھی کیونکہ ان کا نام برابر مجلس مشاورت میں چھپ رہا تھا۔ نام تو ان مرحومہ کا مجلس مشاورت سے خارج کر دیا گیا مگر آپ لوگوں کو چاہئے تھا کہ ان کی مغفرت کے دو الفاظ چھاپ دیتے۔ اب معلوم ہوا کہ آپ کے ڈائجسٹ میں صرف آپ کی تعریف اور خوشامد کے خطوط چھاپے جاتے ہیں کیونکہ میں نے آج تک کوئی تنقیدی خط نہیں پڑھا۔ کیونکہ میں نے ایڈیٹر صاحب کو جو خط لکھا تھا اس میں کتابت کی بے شمار غلطیوں کی نشاندہی کی تھی۔

اب آئیے کہ بہت اہم مسئلہ پر پروفیسر غلام رسول صاحب صفحہ نمبر 133 پر ابراہیمی تبولی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے مرید کے باپ کو آواز دیتے ہیں تو وہ قبر سے باہر آ کر کھڑا ہو جاتا ہے یہ معجزہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے عطا کیا تھا۔

ایک پیر خواہ وہ کتنی بھی طاقت و ریاضت رکھتا ہو کسی مردے کو زندہ نہیں کر سکتا ایسا ایک واقعہ انہوں نے اپنے پچھلے ماہنامہ میں بھی لکھا تھا پتہ نہیں وہ کہاں سے یہ معلومات حاصل کرتے ہیں نہ ہی کوئی کتاب کا حوالہ دیتے ہیں یاد رکھیں کہ روح جسم سے نکلی ہوئی زبان سے نکلی بات اور کمان سے نکلا تیر بھی واپس نہیں آتے میں اس سلسلہ میں ہیں مفتی صاحبان سے رجوع کر رہا

ہوں آپ سے گزارش ہے کہ بغیر تحقیق ایسے واقعات چھاپنے سے گریز کریں۔ شکریہ۔

(سید شاہد علی)

☆محترم شاہد علی صاحب! سب سے پہلے تو یہ غلط فہمی دُور کر لیجئے کہ ہم محض تعریفی خطوط شائع کرتے ہیں جس کا ثبوت آپ کے خط کا شامل اشاعت ہونا ہے۔ جہاں تک صغیرہ بانو شیریں صاحبہ کے حوالے سے تعزیت کا تعلق ہے تو انہی سطور پر شائع ہو چکی ہے غالباً آپ کی نظروں سے نہیں گزری۔ حضرت ابراہیم تبولیؒ کے بارے میں مضمون کا حوالہ دیگر اہل تصوف کے عقائد اور اولیائے کرام کے مقام و مرتبہ کے بارے میں جو بات آپ نے کی ہے اس بارے میں علمائے کرام اور اہل تصوف کی کتابیں موجود ہیں۔ آپ ضرور علمائے کرام سے رجوع کیجئے۔

رمضان مبارک

کامران امجد خان صاحب۔ السلام علیکم!

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے ماہ جون کا شمارہ سامنے ہے خوبصورت سرورق کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ تحریریں شائع کرنے کا شکریہ۔ مزید تحریریں ارسال خدمت ہیں پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں آپ کو اور دیگر سٹاف اور سیارہ ڈائجسٹ کے تمام لکھنے والوں اور تمام قارئین کو ماہ رمضان بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ کرے کہ یہ بابرکت مہینہ ہم سب کے لیے گناہوں سے نجات اور نیکیوں میں اضافے کا سبب بنے۔ خیر اندیش

(انیس احمد [illegible] کراچی)

دل کہتا ہے!

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! سدا خوش

رہیں!!! السلام علیکم!

دیگر احوال یہ ہے کہ جون کا سیارہ نظر نواز ہوا۔ ''قصے لاہور کے'' سرورق پر عنوان مع تصویر منفرد لگا۔ لاہور تو کافی بدل گیا ہے ہاں اب بھی کئی علاقے بالکل اسی تصویر کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ ماہ رمضان کی آمد آمد ہے اس حوالے سے سید عبدالرحمان کی تحریر متاثر کن رہی انشاءاللہ بہت سے قارئین استفادہ کریں گے۔

بزم شاعری میں غزل شامل کرنے کا شکریہ پتہ نہیں کب کی بھجوائی ہوئی ہے تین چار ماہ سے ناگزیر وجوہات کی بنا پر سیارہ کو خط نہیں لکھ سکی جس کا افسوس ہے۔ ''میں اور میں'' کیپٹن لیاقت ملک کی اچھی تحریر تھی ''بے اعتباری'' اور ''کسی قیمت'' نے بھی متاثر کیا۔

اردو کے پہلے شاعر ''قلی قطب شاہ'' کی بابت تحقیقی تحریر پسند آئی۔ آم کے بارے میں معلومات اچھی لگیں۔

قلندر حسین صاحب کا گلدستہ تمام تحریروں پر سبقت لے جاتا ہے کیونکہ اس میں مختلف پھولوں کی خوشبو شامل ہوتی ہے۔ نواز خان کی کہانی بھی منفرد تجسس لیے ہر ماہ سے پڑھنی پڑھتی ہے کمال کا لکھتے ہیں نواز صاحب!

ہماری سب کی پسندیدہ اور ہر دلعزیز مصنفہ شوکت افضل صاحبہ کی نئی کہانی لے کر انشاءاللہ [illegible]

(‏[illegible] ۔ پسرور)

[illegible]

[illegible] کامران [illegible]

السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ کا شمارہ جون ملا۔ خوشی ہوئی۔ جناب امجد رؤف خان صاحب دستک کے صفحات پر جن حقائق کا احاطہ کرتے ہیں وہ ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہوتے ہیں لیکن ان پر کون کان دھرتا ہے۔ حکومت اپنے اقتدار میں مگن سب اچھا ہے کا راگ الاپ رہی ہے۔ عوام بیچاری جائے بھاڑ میں۔ مسلم لیگ ن پہلے بھی دو دفعہ اقتدار میں آچکی ہے لیکن اپنی ناکام پالیسیوں کی وجہ سے اپنی مدت حکومت پوری کرنے سے پہلے کسی دوسری قوت نے آکر اس کو گھر بھیج دیا آخر کیوں؟ ملک میں آج بھی وہی حالات ہیں مہنگائی' لوڈشیڈنگ' کرپشن' دہشت گردی نے ایک عام آدمی سے جینے کا حق بھی چھین لیا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ڈسکہ میں پولیس نے دو وکیلوں کو فائرنگ کرکے مار دیا ان میں ایک تو وہاں بار کا پریذیڈنٹ تھا اس سے پورے ملک میں احتجاج کی آگ بھڑک اٹھی۔ حکومت نے انکوائری کمیشن بنا دیئے بھلا پہلے انکوائری کمیشنوں کا کیا بنا؟ 1971ء میں سقوط ڈھاکہ ہوا کمیشن بنے پھر کیا ہوا......؟

چانکیہ نے کہا تھا کہ ''اگر کسی سنگین مسئلہ کو دبانا مقصود ہو تو اتنی گرد اڑاؤ کہ مسئلہ اس گرد کی تہہ میں دب کر نگاہ سے اوجھل ہوجائے۔'' ہمارے ہاں روز ایک نیا سکینڈل ہوتا ہے آج کل جعلی ڈگریوں کے سکینڈل کا ٹریلر چل رہا ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا......؟

جب مشرف دور میں ممبر اسمبلی بننے کے لئے بی اے ڈگری کی شرط عائد کی گئی تو بہت سے سیاستدان جعلی ڈگریاں حاصل کرکے اسمبلیوں میں پہنچے مگر جب ڈگریاں چیلنج ہوئیں اور تحقیقات کی گئی تو بہت سے شرفا کے چہرے بے نقاب ہوگئے۔ اسی وجہ سے بعدازاں سیاستدانوں نے مل کر ممبر اسمبلی بننے کے لئے عائد بی اے ڈگری کی شرط ختم کردی مجھے یہ بات ہضم نہیں ہورہی کہ درجہ چہارم کے ملازم کے لئے تو تعلیم کی شرط عائد ہے مگر جن لوگوں نے قانون سازی کرنی ہے ملک کا نظم ونسق چلانا ہے خارجہ پالیسی ترتیب دینی اور پالیسیاں بنانی ہیں ان کے لئے تعلیم کی کوئی شرط نہیں...... کیوں؟ ہمارے ہاں جاہل پڑھے لکھوں پر حکومت کررہے ہیں ایک لطیفہ ہے کہ ایک حاجی ممبر اسمبلی بن گئے تو ان کے پاس بہت سی فائلیں آئیں وہ گھبرا گئے اور جا پہنچے اپنے ایک دوست سے مشورہ لینے۔ دوست نے کہا کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی آپ کے پاس جو بھی فائل آئے آپ اس پر محض سین (Seen) لکھ دیا کریں۔ دوست نے دوست کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے تمام فائلوں پر ''س'' لکھ دیا اب آگے جو کچھ ہوا وہ مخفی نہ ہے۔ یہ ملک اسی طرح چلتا رہے گا۔

اب تاریخ جنرل راحیل کو تک رہی ہے وقت فوج کے ہاتھ میں ہے مخلوق خدا ان کے لئے بدست دعا ہے تاخیر نہ کریں کچھ کر گزریں ملک داؤ پر لگا ہے اظہار خیال کے صفحات پر صغیرہ بانو شیریں صاحبہ کے متعلق پڑھا کہ وہ انتقال کرگئیں ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پھر یہ پڑھ کر چونکا کہ وہ تو ابھی تک سیارہ ڈائجسٹ کی مجلس مشاورت میں فعال ہیں۔ ہاں! شہریار اسلم نے نواز خان اور میرے سلسلے کو خوب سراہا ہے میں الفاظ کا متلاشی ہوں کہ ان کا شکریہ ادا کروں لیکن اتنی بساط کہاں۔ ان کے لئے نیک خواہشات۔

(قلندر حسین سید)

رمضان مبارک

اوقات سحر و افطار ۱۴۳۶ھ
جون / جولائی 2015

سیارہ رمضان کیلنڈر

پہلا عشرہ رحمت

نام ایام	رمضان المبارک	جون	منتہائے سحر	وقت افطار
جمعہ	یکم رمضان	19	3:17	7:11
ہفتہ	2	20	3:17	7:11
اتوار	3	21	3:17	7:11
سوموار	4	22	3:17	7:12
منگل	5	23	3:17	7:12
بدھ	6	24	3:17	7:12
جمعرات	7	25	3:18	7:13
جمعہ	8	26	3:18	7:13
ہفتہ	9	27	3:18	7:13
اتوار	10	28	3:18	7:13

دوسرا عشرہ مغفرت

نام ایام	رمضان المبارک	جون/جولائی	منتہائے سحر	وقت افطار
سوموار	11	29	3:19	7:13
منگل	12	30	3:19	7:13
بدھ	13	01	3:20	7:13
جمعرات	14	02	3:21	7:13
جمعہ	15	03	3:21	7:13
ہفتہ	16	04	3:22	7:13
اتوار	17	05	3:22	7:13
سوموار	18	06	3:23	7:13
منگل	19	07	3:24	7:13
بدھ	20	08	3:25	7:13

تیسرا عشرہ نجات

نام ایام	رمضان المبارک	جولائی	منتہائے سحر	وقت افطار
جمعرات	21	09	3:25	7:13
جمعہ	22	10	3:26	7:12
ہفتہ	23	11	3:26	7:12
اتوار	24	12	3:27	7:12
سوموار	25	13	3:28	7:12
منگل	26	14	3:29	7:11
بدھ	27	15	3:30	7:11
جمعرات	28	16	3:30	7:11
جمعہ	29	17	3:31	7:11
ہفتہ	30	18	3:31	7:11

لاہور سے دوسرے شہروں کا فرق

شہر	فرق
گوجرانوالہ:	2 منٹ بعد
ملتان:	11 منٹ بعد
سیالکوٹ:	3 منٹ بعد
پشاور:	13 منٹ بعد
کراچی:	29 منٹ بعد
اوکاڑہ	2 منٹ بعد
ڈیرہ غازی خان:	15 منٹ بعد
راولپنڈی:	6 منٹ بعد

دستک

Editorsayyara@yahoo.com

پھر رحمتوں کا مہینہ آیا ہے!

رحمتوں، برکتوں اور نجات کا مہینہ ''رمضان المبارک'' شروع ہو چکا ہے۔ ملک بھر میں رمضان کے حوالے سے جوش و جذبہ نظر آ رہا ہے۔ سڑکوں، بازاروں، فروٹ شاپس، اسٹورز اور ہفتہ بازاروں میں لوگوں کی بھیڑ امڈ آئی ہے۔ کوئی کونہ ایسا نہیں جہاں خریداروں کا رش نہ ہو۔ بڑے اور نامی گرامی جنرل اسٹورز اور شاپنگ مارکیٹس کے باہر تک لگی ہوئی لوگوں کی لمبی لمبی قطاریں دیکھ کر یوں لگتا ہے، جیسا سامان مفت بانٹا جا رہا ہو۔ رمضان عبادت کے لئے بہترین مہینہ مانا جاتا ہے اس لئے اس ماہ عبادات کا ہر شخص خاص اہتمام کرتا ہے اسی لئے مساجد میں نمازیوں کا رش غیر معمولی حد تک بڑھ جاتا ہے۔ رمضان کی خوشی میں تقریباً ہر مسجد سج گئی ہے۔ بے شمار مساجد میں تعمیر، آسائش اور آرائش کا کام مکمل ہوگیا ہے۔ نئے پنکھے، لائٹس اور کچھ مساجد میں اے سی تک نئے لگائے گئے ہیں۔ الغرض مسلمانان پاکستان نے اس ماہ مبارک کے حوالے سے تمام تر تیاریاں مکمل کر رکھی ہیں، مگر...... ثواب سمیٹنے اور نیکیاں کمانے کی تیاریاں کرنے والوں کے ساتھ بہت سے ایسے پاکستانی بھی ہیں جنھوں نے اس مہینے کا فائدہ اُٹھا کر لوٹ مار اور گرانفروشی کا کاروبار گرم کرنے کی مکمل تیاری کر رکھی ہے اور وہ اس مہینے کے آغاز سے پہلے ہی کئی کئی گنا قیمتیں بڑھا کر اپنا یہ کاروبار شروع کر چکے ہیں۔

ایک طرف دکاندار ہیں، جنھوں نے عید کی تیاریوں کے لیے اپنی دکانیں سجائی ہیں۔ نئی

ورائٹی آ گئی ہے اور چونکہ عید ہے اور خوب منانی ہے......اس کے لیے خوب رقم بھی اکٹھی کرنی ہے سو جتنا بھی نفع ہو سکے کما لو۔ حیرت تو اس بات کی ہے کہ بڑی بڑی داڑھیوں والے، خود ٹیلی ویژن پر آ کر لوگوں کو ناجائز منافع خوری کے بارے میں نصیحتیں کرنے والے، احادیث سنانے والے خود کاروبار کررہے ہیں۔ بلکہ دوہرا کاروبار کررہے ہیں۔ ایک طرف ٹیلی ویژن چینلز پر انھوں نے اپنی ''دکانداری'' سجالی ہے اور دوسری طرف مردانہ و زنانہ گارمنٹس کے برانڈز لانچ کرکے عام قیمتوں کی نسبت کئی کئی گنا زیادہ قیمتیں وصول کررہے ہیں۔ ظاہر ہے اُن کا ایک نام ہے اور یہ اُن کا پورا حق ہے کہ وہ اپنے نام کی پوری قیمت عوام کی جیبوں سے نکلوائیں۔ تمام نصیحتیں اور وعظ ان کے لیے تھوڑی ہی ہیں۔

رمضان کی آمد کے ساتھ ہی کچھ اور 'غیر معمولی' تبدیلیاں بھی مشاہدے میں آرہی ہیں۔ جیسے مساجد کے دروازوں پر فقیروں کے رش میں اضافہ، اخبارات میں فطرانہ، زکواۃ اور مالی امداد کے اشتہارات کی بھرمار، ٹی وی پر رمضان کے خصوصی پروگرامز میں شرکت کی ڈھیر ساری دعوتیں۔ پانچ، دس اور پندرہ روزہ تراویح کے اعلانات، سڑکوں کے کنارے ہورڈنگز پر لان کے کپڑوں کا 'عید اسپیشل کلیکشن'۔ اور...... کیچ اپ کے ساتھ ساشوں، گھی اور تیل کے ڈبوں کے ساتھ مفت کٹلری و فروزن آئٹمز کے ساتھ نمکو کی انعامی اسکیموں کے انبار...... یہ سب دراصل اس مہینے کے فیوض و برکات ''سمیٹنے'' کی کوششیں ہی تو ہیں۔

افسوس کہ ہم مسلمان قوم کہلاتے ہیں اور رمضان میں روزے رکھتے ثواب کمانے کی امید بھی رکھتے ہیں مگر ہم نے ماہ رمضان کو حقیقت میں دوسروں کو لُوٹنے اور نیکی کے پردے میں دولت سمیٹنے کا ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ ہم غیر مسلم اقوام سے بھی سبق نہیں سیکھتے۔ ان ممالک میں جب ان کے مذہبی تہوار آتے ہیں تو قیمتیں اس قدر کم کردی جاتی ہیں کہ ہر شخص اس سے فائدہ اُٹھا سکے نہ کہ اس موقع پر قیمتوں کو دوگنا تین گنا بلکہ کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔ کرسمس کے موقع پر تو امریکہ اور پورے یورپ میں قیمتیں اس قدر کم ہوجاتی ہیں کہ لوگ کئی کئی مہینے کی خریدری کرلیتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں رمضان اور عید سے قبل وہ لوٹ مار ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اور ایسا ہر سال ہوتا ہے، ہر سال ہم ان ناجائز منافع خوروں کے ہاتھوں لٹتے ہیں کیونکہ انھیں روکنے والا کوئی نہیں۔

نجانے ہمارے ارباب اختیار کیوں ان منافع خوروں اور اس ماہ مبارک میں روزہ داروں کا استحصال کرنے والوں سے چشم پوشی کرلیتے ہیں؟۔ غالباً اُن کے اپنے مفاد ان سے وابستہ ہوتے

ہیں۔حکومت ہر سال رمضان پیکج کا بھی اعلان کرتی ہے مگر معلوم نہیں کون لوگ ہیں جو اس سے مستفید ہوتے ہیں۔اہم بات یہ ہے کہ صرف رمضان بازاروں میں ہی کیوں؟ آپ ہر جگہ ایک ہی نرخ کیوں مقرر نہیں کرتے۔گلیوں، بازاروں اور دکانوں پر لوٹ مار کرتے والوں کو من مانی کرنے کے لیے کیوں آزاد چھوڑ دیتے ہیں؟

ہونا تو یہ چاہیے کہ ہر جگہ قیمتوں کی لسٹ آویزاں ہو اور حکومتی نمائندے اس لسٹ کے مطابق ہر جگہ اشیاء کی فروخت کو یقینی بنائیں۔قیمتیں زیادہ وصول کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں اور اس سلسلے میں کسی سے بھی کوئی رعایت نہ برتی جائے۔اس حوالے سے علمائے کرام کی بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ عام لوگوں میں شعور بیدار کریں اور ٹیلی ویژن پر بیٹھ کر محض لوگوں کو نصیحتیں کرنے والے اور خود ناجائز منافع خوری کرنے والے نام نہاد عالموں کو بے نقاب کریں۔

رمضان کا مہینہ اللہ کو راضی کرنے، اپنے گناہوں کو بخشوانے اور نیکیاں سمیٹنے کا موقع لیکر آتا ہے۔اس بابرکت مہینے کو ناجائز منافع خوری سے ضائع مت ہونے دیں بلکہ اپنے مسلمان بھائیوں کا جس قدر بھلا کرسکتے ہیں، کریں...... یہی اس مہینے کا تقاضا ہے!

(امجد رؤف خان)

حکمت

زندگی کی حکمت

ڈاکٹر سمیر یونس

رمضان: گناہوں کی تلافی کا مہینہ

ماہ رمضان ایک معزز مہمان ہے۔ کیا ہی اچھا مہمان ہے! یہ معزز مہمان بھی ہے اور محترم و مکرم ملاقاتی بھی۔ جو ایک سال کے طویل وقفے کے بعد ہمارے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ یہ ایک شوق عظیم ہے جس کی طرف دل لپکتے ہیں۔ گناہ گار اس کے منتظر رہتے ہیں تاکہ اس کے بابرکت لمحات میں گناہوں سے تائب ہو جائیں۔ عبادت گزار اور اطاعت شعار لوگ اس کا انتظار کرتے ہیں تاکہ اپنی عبادت و اطاعت میں اضافہ کرسکیں۔ اس ماہ مبارک میں ...... دن کو صیام، رات کو قیام، شب و روز کے اوقات میں اعمال صالحات، آلودہ نفوس کا تزکیہ، زنگ آلود قلوب کا تصفیہ، شرح صدر اور اصلاح احوال، رحمت رب کا حصول، مغفرت رب کا نزول جہنم سے آزادی، آتش دوزخ سے نجات، رب کی خوشنودی و رضامندی اور اعمال صالح کی قبولیت و مطلوبیت کے قابل رشک لمحات امت مسلمہ کو سال بھر کے وقفے سے میسر آجانا رب کی بے پایاں رحمت کا کرشمہ ہے! یہ سنہری لمحات ہر صاحب ایمان کے لئے اپنی محرومیوں کو دور کرنے، کمیوں کو پورا کرنے، رب سے لو لگانے، شیطان سے جان چھڑانے اور کامیاب کلمہ گو بننے اور کہلانے کا عظیم اور بینظیر موقع ہے۔ اس عظیم فرصت کو اپنے لئے غنیمت کا موقع بنانا ہر مسلمان کے اپنے اختیار میں ہے۔ مومن، کو اس مہینے میں اپنے ساتھ، اپنے اہل خانہ کے ساتھ، اپنے احباب و اقارب اور محلہ و بستی کے ساتھ، اپنی قوم و ملت کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر اپنے خالق و مالک کے ساتھ اخلاص و خلوص، وفاداری و وفاشعاری اور نصیحت و خیر خواہی کا مظاہرہ کرنا ناگزیر ہے۔ اس ماہ عظیم کو دیگر مہینوں کے معمولات کی طرح گزار دینا بہت بڑی اور ناقابل تلافی محرومی ہے۔ معلوم نہیں یہ اوقات مبارک، یہ لمحات بابرکت، یہ نیکیوں کا موسم بہار، یہ رب کی عطاؤں، عنایتوں، مہربانیوں، بخششوں اور نعمتوں، ثروتوں کا بے مثل مہینہ اگلے برس کسے نصیب ہوتا ہے! لہٰذا مومنانہ فراست کا تقاضا یہ ہے کہ اس ماہ عظیم کو اپنی زندگی سنوارنے اور کامیاب و کامران بنانے کا آخری موقع تصور کیا جائے۔

خالص اور مضبوط عزم و ارادہ

نیت خالص اور درست کرلی جائے کہ بہت سے چھوٹے اچھے اور نیک کام بھی حسن نیت سے اجر کے اعتبار سے پہاڑ بن جاتے ہیں۔ مگر پہاڑ جیسے اچھے کام نیت کی خرابی سے رائیگاں چلے جاتے ہیں۔ وقت کا ضیاع اس مہینے میں مومن کے لئے بہت بڑے نقصان کا سبب ہے اور اس کا درست اور بھرپور استعمال اجر عظیم اور فلاح کبیر کا ضامن ہے۔ بہت سی حلال، مباح اور جائز مصروفیات میں وقت

گزاری کے بجائے نگاہ ارفع اور اعلیٰ اعمال صالح پر رکھی جائے۔
یہ موقع خوش نما لباس خریدنے' بنانے اور افطاری میں انواع و اقسام کے دستر خوان سجانے کا نہیں ہے۔ یہ سامان افطاری کی مہنگے نرخوں پر فراہمی کے ذریعے چند روپے کما لینے کو غنیمت سمجھنے کا موقع نہیں۔ یہ اپنی قسمت بدلنے' رجحانات کو تبدیل کرنے' روش زندگی کو بامقصد بنانے' دنیوی امتحان گاہ میں شرکت کے موقع کو آخری سمجھ کر کامیابی کے لئے پورا زور صرف کرنے کا موقع ہے۔ خطرات و خدشات میں گھرے اس موقع سے بحفاظت و سلامتی باہر نکل آنے کے لئے بھرپور قسم کی منصوبہ بندی چاہئے۔ ایسی منصوبہ بندی ماہ رمضان کے 30 روز و شب تک محدود نہ ہو بلکہ زندگی کے لئے نفس و کردار کی دائمی تبدیلی کا مستقل عنوان بن جائے۔

ہدف کا تعین اور اس کے لئے جدوجہد

رمضان کے مقاصد و مطالب کے حصول کے لئے رمضان میں ذاتی معمول بنا لینا مفید ہوتا ہے۔ منتشر امور و معاملات کو سمیٹنا اور مجتمع کرنا لمحات سعادت سے حقیقی طور پر مستفید ہونے کا سبب بن سکتا ہے۔ زندگی بھر انسان ترقی و کامیابی کے بے شمار خواب دیکھتا اور ان کی تعبیر پانے میں کوشاں رہتا ہے۔ صاحب فراست مومن کے لئے لازمی ہے کہ وہ بھی ایک خواب دیکھے' سہانا خواب' کامیابی و کامرانی کا خواب' ترقی و خوشحالی کا خواب' یعنی جنت کا خواب! ہم بہت سی عبادات' اعمال طاعات اور کارہائے صالحات انجام دیئے جا رہے ہوتے ہیں مگر پیش نظر کوئی مقصد اور نصب العین نہیں ہوتا' کوئی ہدف اور منزل نہیں ہوتی' اگر کسی بڑے خواب کی تعبیر پانے کی غرض سے یہ جدوجہد کی جائے تو وہ خواب جنت ہی ہوسکتی ہے۔ حصول جنت سے بڑھ کر منزل کیا ہوسکتی ہے۔ رب کی خوشنودی سے بڑی کامیابی کیا ہوسکتی ہے۔ قرب خداوندی سے بڑا مرتبہ کیا ہوسکتا ہے' جنت کے خواب سے اعلیٰ اور برتر خواب کیا ہوسکتا ہے۔ جنت کا حصول' رب کی رضا جوئی سے ممکن ہے اور رب کی رضا کا حصول سزاوار جنت ہونے کا نام ہے۔ کاش! ہم دنیاوی زندگی کے چھوٹے چھوٹے خوابوں سے نکل کر حصول جنت اور خوشنودی رب کا عظیم خواب دیکھیں پھر اس کی تعبیر کو ممکن بنانے کے لئے مصروف عمل ہو جائیں تمام چھوٹے اور عارضی اساس رکھنے والے خوابوں پر اسی عظیم اور دائمی خواب کو ترجیح اور اولیت دیں تاکہ اپنی منزل اور ہدف کو پالیں۔

محرومیوں کا ازالہ بھرپور جذبے کیساتھ

خسارے کی صورت حال سے دوچار کاروبار سے نکلنے کے لئے جہاں چند نئے امور ناگزیر اور لازمی ہوتے ہیں وہیں ماضی کی کوتاہیوں سے نہ صرف دست کش ہونا ضروری ہوتا ہے بلکہ ان کوتاہیوں سے پیدا ہونے والی محرومیوں کا ازالہ کرنا بھی ناگزیر ٹھہرتا ہے۔ رمضان مومن و مسلم کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنی کوتاہیوں اور محرومیوں کا ازالہ بھرپور طریقے سے کرسکے۔ اس نئی زندگی کی کامیابی کا انحصار

ماضی کی تلافی پر ہے۔ لہٰذا انسانی معاشرے کے بشری معاملات میں خطاؤں' لغزشوں اور کمیوں کوتاہیوں کو اپنے اعمال نامے کے بدنما داغ کے طور پر قبول کئے رکھنا' یا ان پر کسی بے چینی اور اضطراب کا احساس نہ ہونا زندہ دل اور زندہ ضمیر کی علامت نہیں۔ یہ موقع ہے کہ دلوں کے بند دریچوں کو وا کرلیا جائے۔ اپنے اور دوسروں کے درمیان بند دروازوں کو کھول دیا جائے۔ دوسروں کے بارے میں اپنے دل کو صاف و شفاف کرلیا جائے ان کے لئے دل میں محبت و مودت اور خیر و فلاح کے جذبات پیدا کئے جائیں۔ عفو و درگزر اور رواداری و برداشت اور تحمل وتسامح کا رویہ اپنالیا جائے۔ اس عمل کی انجام دہی کے دوران قرآن کی یہ آیت ہمیشہ مدنظر رہے۔ (ترجمہ) ''دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے اور وہ ان خدا ترس لوگوں کے لئے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں' خواہ بدحال ہوں یا خوش حال جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کردیتے ہیں' ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں''۔

قلب و نظر اور کردار و عمل کی صفائی

رمضان کا پہلا عشرہ رحمت کا عشرہ ہے۔ رب سے اس کی رحمت کا سوال کیا جائے۔ لہٰذا پہلے خود اس رحمت کو دوسروں کے لئے عام کیا جائے کیونکہ جو انسانوں پر رحیم نہیں ہوگا اللہ بھی اس پر رحم نہیں فرمائے گا۔ رب کے در رحمت پر دستک دینے سے قبل اپنی نرمی و ملائمت اور رحم دلی کے دروازے پر دستک دی جائے دور ونزدیک' عزیز و عامی ہر کسی کے ساتھ رحم کا معاملہ روا رکھا جائے صلہ رحمی کرکے اللہ کی رحمت کا مستحق بنا جائے۔ خیر اور بھلائی صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس کا حق دار سمجھا جائے۔ حسد وبغض اور کینہ وکدورت کو دلوں سے نکال باہر کیا جائے۔ دل کے اندر جو بھی سیاہی موجود ہے اس کو ایمان کے پانی سے دھوڈالا جائے۔ اس میں تاریکی طاری رکھنے کے بجائے اسے روشن اور چمک دار بنا دیا جائے اور اسے بلند و برتری اور اعلیٰ و ارفع خیالات کی آماجگاہ بنایا جائے۔ اسے قلب سلیم کا مطلوب اور قابل رشک روپ دے لیا جائے وہ قلب جو قیامت کے دن اہل دل کو نفع دے گا۔

رمضان میں رب کے ساتھ اچھا معاملہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ خود اپنے نفس کے ساتھ بھی اچھا معاملہ کیا جائے۔ اپنے غموں اور پریشانیوں' مصروفیتوں اور مشغولیتوں سے توکل علی اللہ کے سہارے باہر نکل آیئے۔ کیوں کہ وہی واحد ذات ہے جو کاشف الغم اور مفرج الہم ہے جو اس پر توکل کرے وہ بھی نقصان میں نہیں رہتا۔ انسان کو ازخود اپنے اوپر عائد کردہ پابندیوں اور ازخود پہنی ہوئی بیڑیوں سے خود کو آزاد کرنا چاہئے۔ اپنے آپ کو الم وحزن کی قید سے چھڑا لینا چاہئے۔ ان تمام چیزوں کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے یہ حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت واتباع ہے۔ آپ دعا کیا کرتے تھے۔

اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں فکر وغم سے اور تیری پناہ چاہتا ہوں ناتوانی وسستی سے اور بچاؤ چاہتا ہوں تیرے ذریعے بخل اور بزدلی سے اور تیری پناہ میں آتا ہوں قرض کے غلبے اور لوگوں کے سخت

دباؤ سے۔

عفوو درگزر اپنے لئے بھی دوسروں کے لئے بھی

اصلاح حال اور تزکیہ نفس کا عمل اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک انسان دوسروں کو ایذارسانی کی ذہنیت سے کامل طور پر دست بردار نہ ہوجائے لہٰذا کسی انسان کو تکلیف دینے' ایذا پہنچانے' اس کا حق مارنے' اس پر ظلم کرنے اور زیادتی کرنے کا تو ایک مومن سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہاں تو ان لوگوں کے ساتھ بھی حسن سلوک اور عفوودرگزر کی تعلیم ہے جو انسان کو دکھ دے چکے ہوں' اس کا حق کھا چکے ہوں' اس پر ظلم ڈھا چکے ہوں' مومن ان کے غلط اعمال کو اپنے نیک اعمال کے لئے رکاوٹ نہیں بننے دیتا۔ مومن کا رویہ احسان ان کے لئے بھی عام ہوتا ہے۔ جو اس کی جان کے دشمن ہوں۔ ماہ رمضان موقع ہے ایسے لوگوں کے دلوں میں اُتر جانے کا' ان کے نظریہ زندگی کو بدل ڈالنے کا' اپنی پارسائی اور فطری شرافت کو ان پر واضح کرنے کا' ان کا دل بدل ڈالنے اور روش زندگی کا رخ موڑ دینے کا!

دلوں میں کدورت' حسد اور بغض پیدا کرنے کا سب سے بڑا سبب غیبت اور چغلی ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ محفلوں اور مجلسوں کا مرغوب پھل بن گیا ہے۔لوگ اپنی نشست و برخاست اور میل ملاقاتوں کے مواقع پر یہ پھل کھائے بغیر رہ نہیں سکتے لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان معلوم رہنا چاہئے کہ (ترجمہ) ''اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو' اللہ سے ڈرو' اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔''

غیبت سے بچنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہم روزہ تو حلال رزق کھا کر رکھیں مگر افطاری غیبت جیسی حرام چیز سے کرلیں۔

رمضان جہاں دوسروں کو معاف کردینے' درگزر سے کام لینے اور عفو وتسامح اختیار کرنے کا بہترین موقع ہے وہیں دوسروں سے اپنی کوتاہیوں اور خطاؤں کی معافی مانگ لینے کا بھی سنہری موقع ہے۔ اپنے بُرے اعمال کا اعتراف اور ان پر رب اور رب کے بندوں سے اعتذار کرلینا مومن کے ان اوصاف میں سے عظیم وصف ہے جنہیں قرآن نے بیان کیا ہے۔ یہ موقع ہے کہ قیامت کے روز دنیا کے ظلم کو ظلمات بننے سے روک لیا جائے۔ اپنی نیکیوں کو دوسروں کے نامہ اعمال کی زینت بننے اور ان کے ترازو کا وزن بننے کے بجائے اپنے ہی ترازو کے لئے محفوظ رکھا جائے۔ دوسروں کے گناہوں کو اپنے نامہ اعمال کا ثقل مزید بننے نہ دیا جائے لہٰذا موقع ضائع کئے بغیر متاثرین سے معافی مانگی جائے۔ زبانی کلامی اور تحریری و قلمی جس طریقے سے بھی ممکن ہو ان سے اپنے قصور کی بخشش کا سوال کیا جائے۔ دوسروں سے انسان کا

اعتراف حق تلفی اس کی اپنی عظمت وفضیلت اور دوسروں کے لئے درس حکمت ہے۔ ان کے دل اس عمل سے شاداں وفرحاں ہو جائیں گے اور معافی کا خواستگار ان کی آنکھوں میں بہت بڑا بہادر اور انصاف پسند ٹھہرے گا۔ حق تلفی کے مجرم کو فوراً ان سے معذرت کر لینا نہایت ضروری ہے۔ خصوصاً ان لوگوں سے اپنے ظلم و ناانصافی کی معافی لینا اشد ضروری ہے جن کے اوپر کیے گئے ظلم وستم اور حق تلفی نے انسان کی نیند اڑا کر رکھ دی ہو۔ راتوں کا چین غارت کر دیا ہو' ہر کروٹ کے ساتھ یہ احساس بیدار رہتا ہو' رات آنکھوں میں گزر جاتی ہو' رات بھر ضمیر ملامت کرتا اور جھنجوڑتا رہتا ہو کہ اے انسان تو نے ان مظلوموں کے ساتھ کیا کیا تھا؟ رمضان ماضی کے غم میں مبتلا رہنے اور ماضی کی ناکامیوں کے احساس میں اپنے آپ کو گھلانے کے بجائے مستقبل پر نظر رکھنے اور اس کی تیاری اور منصوبہ بندی کرنے کا سبق دیتا ہے۔ ہمت اور حوصلے کو چار نہیں دس چاند لگا دیتا ہے۔ ناکامی کی جگہ کامرانی کا احساس پیدا اور نمایاں کرتا ہے۔ دل وضمیر کو امید ور جا سے بھرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ حسرت وندامت کے بجائے عزم وہمت اور ارادہ ونیت کو عمل میں لانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ظالموں اور حق تلفی کرنے والوں کو چھوڑ دینے' نظر انداز کرنے اور ان کے لئے ہدایت کی دعا کرنے کا وقت ہے۔ اگر وہ راہ راست پر نہیں آتے تو جان رکھو کہ اللہ حاکم عدل ہے وہ ایک روز ان کے ظلم وستم کا حساب لے کر رہے گا۔

ذاتی جائزہ و احتساب

رمضان وہ فرصت اور موقع ہے جس میں برائی سے دُوری اور بھلائی سے دوستی میں نجات ہے۔ ہر مومن کو قرآن مجید کی ان دو آیتوں کی روشنی میں اپنا روزانہ جائزہ لینا ضروری ہے۔ (ترجمہ) ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' رکوع اور سجدہ کرو' اپنے رب کی بندگی کرو' اور نیک کام کرو' اسی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہو۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہیں اپنے کام کے لئے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت پر اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے) تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ وہ ہے تمہارا مولیٰ بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار۔''

(المجتمع: عدد 2011-2013)

کلام نبوی کی کرنیں

مولانا عبدالمالک

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو شیاطین اور سرکش جنوں کو بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کا کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ان کا کوئی

دروازہ بند نہیں ہوتا اور بلانے والا آواز دیتا ہے...... اے خیر کے طلب گار! آگے بڑھ اور اے شر کے طلب گار! رُک جا اور اللہ تعالیٰ دوزخ سے لوگوں کو آزاد کرتے ہیں اور ایسا ہر رات ہوتا ہے۔(ترمذی' ابن ماجہ)

رمضان المبارک نزول قرآن اور نفاذ قرآن کا مہینہ ہے۔ شیطانوں اور سرکش جنوں کو بیڑیاں پہنانا یہ معنی رکھتا ہے کہ برائی پر آمادہ کرنے والوں اور اکسانے والوں کو قید کردیا جاتا ہے تاکہ برائی ختم ہوجائے اور نتیجہ یہ نکلے کہ جہنم کے دروازے بھی بند ہوجائیں کہ اس میں جانے والا کوئی نہ رہے۔ اسی طرح نیکی کی طرف دعوت دینے والے فرشتے نیکی کی دعوت دینا شروع کردیتے ہیں نیکی پر ابھارتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں یہ نعمت ان لوگوں کے لئے ہے جو روزے رکھیں اور اپنی نجات کا انتظام کرنا چاہیں لیکن جن لوگوں کو رمضان المبارک کی پرواہی نہ ہو'نہ وہ روزہ رکھیں اور نہ اسلام پر عمل کریں' ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مہینے میں بھی کوئی سہولت نہیں ہے البتہ وہ لوگ جو رمضان المبارک سے پہلے غفلت میں پڑے ہوں لیکن رمضان المبارک کی آمد پر غفلت سے بیدار ہوجائیں تو ان کے لئے رمضان المبارک کی برکتیں سایہ فگن ہوں گی اور وہ بھی نیکیاں کما کر اور برائیوں سے رُک کر اپنی آخرت سنوار سکتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آگیا تمہارے پاس رمضان' یہ مبارک مہینہ ہے! اللہ تعالیٰ نے تم پر اس کا روزہ فرض کیا ہے۔ اس میں آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور سرکش شیطان باندھ دیئے جاتے ہیں اس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینے سے بہتر ہے جو اس رات کی خیر سے محروم رہا تو وہ محروم ہوگیا۔(احمد' نسائی)

ایک ات کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہو تو پھر اس رات عبادت نہ کرنا اسی شخص کا کام ہوسکتا ہے جو ہر خیر سے محروم ہو۔ ایک رات میں 83 سال اور چار مہینے سے زیادہ کی عبادت ہے۔ گویا عمر بھر کی عبادت سے بھی زیادہ۔ انسانوں کی اوسط عمر تو 65-60 سال کے درمیان ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو 85-80 سال تک پہنچتے ہیں اتنی زیادہ کمائی کی جسے پروا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کمائی نہیں کرنا چاہتا۔ رمضان میں نفل عبادت کا ثواب فرض کے برابر ہے اور ایک فرض کا ثواب 70 فرضوں کے برابر اور لیلۃ القدر کا ثواب تو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ ایک آدمی رمضان المبارک کے مہینے میں سارے سال کی کمی کو پورا کرنے کا موقع پاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت کا مہینہ ہے چاہئے یہ کہ اس مہینے میں عبادت کا ذوق وشوق اتنا بڑھائیں کہ رمضان کی برکات سمیٹ لیں۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: روزہ اور قرآن بندے کے لئے شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا: اے میرے رب! میں نے دن میں اسے کھانے اور

شہوتوں سے روکا اس لئے اس کے بارے میں میری شفاعت قبول فرما اور قرآن کہے گا میں نے اسے رات کو سونے سے روکا' اس لئے اس کے بارے میں میری شفاعت قبول فرما' تو ان دونوں کی شفاعت قبول کرلی جائے گی۔(بیہقی' شعب الایمان)

کتنا بڑا انعام ہے! آخرت جہاں انسان مدد کا محتاج ہوگا وہاں روزہ اور قرآن اس کے مددگار ہوں گے شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول ہوگی۔ کتنا خوش قسمت ہے وہ جو ایسے مشکل وقت بے سہارا نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی اس کے کام آئے' روزہ بھی سامنے ہو اور قرآن پاک بھی آگے ہو۔ یہ اس کی بخشش کا بڑا ذریعہ ثابت ہوں گے۔

حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں شعبان کے آخری دن خطاب فرمایا۔ آپؐ نے فرمایا: لوگو! تم پر سایہ فگن ہو رہا ہے ایک عظیم مہینہ! یہ وہ مہینہ ہے جو مبارک ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے کو فرض اور اس کے راتوں میں قیام کو نفل قرار دیا ہے۔ جس نے اس میں بھلائی کا کوئی کام کیا تو گویا اس نے دوسرے مہینوں کا ایک فرض ادا کیا اور جس نے اس میں فرض ادا کیا تو گویا اس نے دوسرے مہینوں میں 70 فرض ادا کئے۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے اور غم خواری کا مہینہ ہے۔ اور یہ ایسا مہینہ ہے جس میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ جس نے اس میں روزے دار کو افطار کرایا یہ اس کے لئے گناہوں کی مغفرت اور دوزخ کی آگ سے آزادی ہوگی اور اس کے لئے اس روزے دار کے مثل اجر ملے گا بغیر اس کے کہ اس کے اجر میں کوئی کمی آئے۔ ہم [illegible] رسول اللہ! ہم میں سے ہر ایک روزے دار کو افطار کرانے کا سامان نہیں پاتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ ثواب اس کے لئے بھی ہے جو روزے دار کا روزہ دودھ کے گھونٹ پر افطار کرائے یا ایک کھجور ہو یا پانی پلا کر افطار کرادے۔ جس نے روزے دار کو سیر کر کے پلایا اللہ تعالیٰ اسے میرے حوض سے ایسا پانی پلائے گا کہ وہ جنت میں داخل ہونے تک کبھی بھی پیاسا نہ ہوگا۔ یہ وہ مہینہ ہے کہ اس کا اول عشرہ رحمت ہے اور درمیانہ حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ دوزخ کی آگ سے آزادی ہے اور جس نے اپنے غلام اور خادم پر اس کے کام میں کمی کردی اللہ اسے بخش دے گا اور دوزخ سے اسے آزاد کردے گا۔(بیہقی: فی شعب الایمان)

اس مہینے میں جہاں اللہ تعالیٰ سے تعلق استوار کرنا' صبر کرنا اور جنت حاصل کرنا ہے وہیں بندوں کے ساتھ بھی تعلق استوار کرنا ہے۔ ان کے ساتھ ہمدردی اور غم خواری کرنا ہے۔ نبی صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمدردی اور غم خواری کی چند شکلیں بیان فرمائی ہیں جیسے روزے دار کا روزہ افطار کرانا' خادم اور ملازم کی ڈیوٹی میں کمی کرنا' اسی طرح یہ مہینہ اپنے آغاز میں رحمت ہے۔ نیک لوگوں پر خصوصی رحمتیں شروع ہو جاتی ہیں' دوسرا عشرہ آتا ہے تو اس میں بطور خاص گنہگاروں کی بخشش بھی شروع ہو جاتی ہے اور

تیسرا عشرہ آتا ہے تو اس کا فیض ان لوگوں کو بھی پہنچنا شروع ہو جاتا ہے جن پر دوزخ واجب ہو چکی ہو۔حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اعتکاف فرماتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دے دی پھر آپؐ کے بعد آپ کی ازواج نے بھی اعتکاف کیا۔(متفق علیہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعتکاف کا مقصد ایک تو یہ تھا کہ آپؐ اس مہینے میں کچھ راتیں تنہائی میں گزاریں۔ یکسوئی سے نوافل' ذکر' تلاوت میں مشغول رہیں اور دوسرا مقصد لیلتہ القدر کو پانا تھا کہ جب تمام راتیں جاگ کر اللہ تعالیٰ کی بندگی میں گزاریں گے تو لیلتہ القدر کو بھی پالیں گے اور ہزار راتوں سے زیادہ کی عبادت بھی مل جائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان المبارک کے پہلے' دوسرے اور تیسرے عشرے تینوں میں اعتکاف کیا ہے اور آپ کا آخری معمول رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اعتکاف کا تھا۔معتکف کے لئے ضروری ہے کہ وہ مجبوری کے بغیر مسجد سے باہر نہ جائے اور اگر مجبوری کی وجہ سے چلا جائے تو مجبوری کے پورا ہوتے ہی فوراً واپس آجائے اور بلاضرورت ایک لمحے کی تاخیر نہ کرے۔ مجبوری میں قضائے حاجت اور واجب غسل شامل ہیں۔ بیمار کی بیمار پرسی کرنا' نماز جنازہ پڑھنا یہ مجبوری میں شامل نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص جنازہ پڑھنا چاہتا ہے مثلاً والد' والدہ' بھائی' بیٹا فوت ہو گیا تو اعتکاف کو ترک کردے۔ بعد میں اسی کی قضا کرلے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ سنت اعتکاف یہ ہے کہ بیمار کی بیمار پرسی کے لئے نہ جائے اور جنازے میں حاضر نہ ہو اور بیوی کو ہاتھ نہ لگائے اور اس کے ساتھ مباشرت نہ کرے اور کسی حاجت سے نہ نکلے مگر ایسی حاجت جس کے بغیر چارہ نہ ہو (قضائے حاجت' غسل جنابت) اور نہیں ہے اعتکاف مگر روزے کے ساتھ اور نہیں ہے اعتکاف مگر ایسی مسجد میں جس میں نماز باجماعت ہو۔(ابوداؤد)

کئی لوگ جو شوگر کے مریض ہوتے ہیں اور روزہ نہیں رکھ سکتے لیکن انہیں اعتکاف کا شوق ہوتا ہے انہیں چاہئے کہ وہ نفلی اعتکاف کریں سنت اعتکاف کے لئے روزہ ضروری ہے۔ رمضان المبارک کے آخری عشرے کا اعتکاف سنت کفایہ ہے۔اس لئے اس کے لئے روزہ رکھنا ہوگا۔نیز مسجد کے بغیر بھی اعتکاف نہیں ہوتا۔مسجد کے باہر کسی پارک میں خیمے لگا کر اعتکاف کرنا یہ اعتکاف نہیں ہے۔

روزے کی حکمت

روزے کی روح

روزے کی اصل روح یہ ہے کہ آدمی پر اس حالت میں خدا کی خداوندی اور بندگی و غلامی کا احساس پوری طرح طاری ہو جائے اور وہ ایسا مطیع امر ہو کر یہ ساعتیں گزارے کہ ہر اس چیز سے رُکے جس سے خدا نے روکا ہے اور ہر اس کام کی طرف دوڑے جس کا حکم خدا نے دیا ہے۔ روزے کی فرضیت کا اصل مقصد اسی کیفیت کو پیدا کرنا اور نشوونما دینا ہے کہ محض کھانے پینے اور مباشرت سے روکنا......

اگر کسی آدمی نے اس احمقانہ طریقے سے روزہ رکھا کہ جن جن چیزوں سے روزہ ٹوٹتا ہے ان سے تو پرہیز کرتا رہا اور باقی تمام ان افعال کا ارتکاب کئے چلا گیا جنہیں خدا نے حرام کیا ہے تو اس کے روزے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک مردہ لاش' کہ اس میں اعضا تو سب کے سب موجود ہیں جن سے صورت انسانی بنتی ہے مگر جان نہیں ہے جس کی وجہ سے انسان' انسان ہے۔ جس طرح اس بے جان لاش کو کوئی شخص انسان نہیں کہہ سکتا' اسی طرح اس بے روح روزے کو بھی کوئی روزہ نہیں کہہ سکتا۔ یہی بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی کہ: ''جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو خدا کو اس کی حاجت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔'' (بخاری)

جھوٹ بولنے کے ساتھ ''جھوٹ پر عمل کرنے'' کا جو ارشاد فرمایا گیا ہے یہ بڑا ہی معنی خیز ہے۔ دراصل یہ لفظ تمام نافرمانیوں کا جامع ہے جو شخص خدا کو خدا کہتا ہے اور پھر اس کی نافرمانی کرتا ہے وہ حقیقت میں خود اپنے اقرار کی تکذیب کرتا ہے روزے کا اصل مقصد تو عمل سے اقرار کی تصدیق ہی کرنا تھا مگر جب وہ روزے کے دوران میں اس کی تکذیب کرتا رہا تو پھر روزے میں بھوک پیاس کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ حالانکہ خدا کو اس کے خلوے معدہ کی کوئی حاجت نہ تھی۔ اسی بات کو دوسرے انداز میں حضورؐ نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔'' کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک پیاس کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا اور کتنے ہی راتوں کو کھڑے رہنے والے ایسے ہیں جنہیں اس قیام سے رت جگے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔'' (دارمی)......

ضبط نفس

انسان کو خدمت گار اور آلہ کار کی حیثیت سے جو بہترین ساخت کا حیوان (جسم) دیا گیا ہے اس کے بنیادی مطالبات تین ہیں اور چونکہ وہ تمام حیوانات سے اونچی قسم کا حیوان ہے اس کے مطالبات بھی ان سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ صرف زندہ رہنے کے لئے غذا ہی نہیں مانگتا' بلکہ اچھی غذا مانگتا ہے۔ طرح طرح کی مزے دار غذائیں مانگتا ہے' غذائی مواد کی ترکیبوں کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کے اس مطالبے میں سے اتنی شاخیں نکلتی چلی جاتی ہیں کہ اسے پورا کرنے کے لئے ایک دنیا درکار ہوتی ہے۔ وہ صرف بقائے نوع کے لئے صنف مقابل سے اتصال ہی کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اس مطالبے میں ہزار نزاکتیں اور ہزار باریکیاں پیدا کرتا ہے' تنوع چاہتا ہے' حسن چاہتا ہے' آرائش کے بے شمار سامان چاہتا ہے' طرف انگیز سماں اور لذت انگیز ماحول چاہتا ہے' غرض اس سلسلے میں بھی اس کے مطالبات اتنی شاخیں نکالتے ہیں کہ کہیں جا کر ان کا سلسلہ رکتا ہی نہیں۔ اسی طرح اس کی آرام طلبی بھی عام حیوانات کے مثل صرف کھوئی ہوئی قوتوں کو بحال کرنے کی حد تک نہیں رہتی بلکہ وہ بھی بے شمار شاخیں نکالتی ہے جن کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔

اس طرح ان تین ابتدائی خواہشوں سے خواہشات کا ایک لامتناہی جال بن جاتا ہے جو انسان کی

پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتا ہے۔ پس دراصل انسان کے اس خادم اس منہ زور حیوان کے پاس یہی تین ہتھیار وہ سب سے بڑے ہتھیار ہیں جن کی طاقت سے وہ انسان کا خادم بننے کے بجائے خود انسان کو اپنا خادم بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ہمیشہ زور لگاتا رہتا ہے کہ اس کے اور انسان کے تعلق کی نوعیت صحیح فطری نوعیت کے برعکس ہو جائے۔ یعنی بجائے اس کے کہ انسان اس پر سوار ہو، الٹا وہ انسان پر سوار ہو کر اسے اپنی خواہشات کے مطابق کھینچے کھینچے پھرے...... اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حیوان 'شرالدواب...... تمام حیوانات سے بدتر قسم کا حیوان...... بن کر رہ جاتا ہے۔

بھلا جس حیوان کو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لئے انسان جیسا خادم مل جائے اس کے شر کی بھی کوئی حد ہو سکتی ہے۔ جس بیل کی بھوک کو بحری بیڑا بنانے کی قابلیت میسر آ جائے' زمین کی کس چراگاہ میں اتنا بل بوتا ہوتا ہے کہ اس کے معاشی مفاد کی لپیٹ میں آ جانے سے بچ جائے؟ جس کتے کی حرص کو ٹینک اور ہوائی جہاز بنانے کی قوت مل جائے' کس بوٹی اور کس ہڈی کا یارا ہے کہ اس کی کچلیوں کی گرفت میں آنے سے انکار کر دے؟ جس بھیڑیئے کو اپنے جنگل کے بھیڑیوں کی قومیت بنانے کا سلیقہ ہو اور جو پریس اور پراپیگنڈے سے لے کر لمبی مار کی توپوں تک سے کام لے سکتا ہو' زمین میں کہاں اتنی گنجائش ہے کہ اس کے لئے کافی شکار فراہم کر سکے؟ جس بکرے کی شہوت' ناول' ڈراما' تصویر' موسیقی' ایکٹنگ اور حسن افزائی کے وسائل ایجاد کر سکتی ہو جس میں بکریوں کی تربیت کے لئے کالج' کلب اور فلمستان تک پیدا کرنے کی لیاقت ہو اس کی دادعیش کے لئے کون حدودانتہا مقرر کرنے کا ذمہ لے سکتا ہے؟

ان پستیوں میں گرنے سے انسان کو بچانے کے لئے ...... ضروری ہے کہ اس حیوان کے ساتھ اس کے تعلق کی جو فطری نوعیت ہے اس کو عملاً قائم کیا جائے اور مشق و تمرین کے ذریعے سے سوار کو اتنا چست کر دیا جائے کہ وہ اپنی سواری پر جم کر بیٹھے اور ارادے کی باگیں مضبوطی کے ساتھ تھامے اور اس پر اتنا قابو یافتہ ہو کہ اس کی خواہشات کے پیچھے خود نہ چلے بلکہ اپنے ارادے کے مطابق اسے سیدھا سیدھا چلائے...... جتنی چیزیں خدا نے اس دنیا میں ہمارے لئے مسخر کی ہیں' ان میں سب سے زیادہ کارآمد چیز یہی حیوانی جسم ہے...... لیکن بہرحال یہ ہماری اور ہمارے مقصد زندگی کی خدمت کے لئے ہے نہ کہ ہم اس کی اور اس کے مقصد زندگی کی خدمت کے لئے۔ اس کو ہمارے ارادے کا تابع ہونا چاہئے نہ کہ ہمیں اس کی خواہشات کا تابع۔ اس کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ ایک فرماں روا کی طرح اپنی خواہشات ہم سے پوری کرائے بلکہ اس کا صحیح مرتبہ یہ ہے کہ ایک غلام کی طرح ہمارے سامنے اپنی خواہشات پیش کرے...... روزے کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد انسان کو اس کے حیوانی جسم پر یہی اقتدار بخشنا ہے......

حکیمانہ تدبیر

ایک ذرا سی حکیمانہ تدبیر نے روزے کو انفرادی عمل کے بجائے اجتماعی عمل بنا کر اس کے فوائد و

منافع کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تدبیر بس اتنی سی ہے کہ روزے رکھنے کے لئے ایک خاص مہینہ مقرر کردیا گیا ہے۔

اس حکیمانہ تدبیر سے ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا ہوجاتی ہے۔ ایک شخص انفرادی طور پر کسی ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کررہا ہو اور اس کے گرد و پیش دوسرے لوگوں میں نہ وہ ذہنی کیفیت ہو اور نہ وہ اس کام میں اس کے شریک ہوں، تو وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں بالکل اجنبی پائے گا۔ اس کی کیفیت ذہنی صرف اس کی ذات تک محدود اور صرف اسی کی نفسی قوتوں پر منحصر رہے گی۔ اس کو نشوونما پانے کے لئے ماحول سے کوئی مدد نہیں ملے گی بلکہ ماحول کے مختلف اثرات اس کیفیت کو بڑھانے کے بجائے اُلٹا گھٹادیں گے۔ لیکن اگر وہی کیفیت پورے ماحول پر طاری ہو، اگر تمام لوگ ایک ہی خیال اور ایک ہی ذہنیت کے ماتحت ایک ہی عمل کررہے ہوں تو معاملہ برعکس ہوگا۔ اس وقت ایک ایسی اجتماعی فضا بن جائے گی جس میں پوری جماعت پر وہی ایک کیفیت چھائی ہوئی ہوگی اور ہر فرد کی اندرونی کیفیت ماحول کی خارجی اعانت سے غذا لے کر بے حد و حساب بڑھتی چلی جائیگی۔ ایک شخص اکیلا برہنہ ہو اور گرد و پیش سب لوگ کپڑے پہنے ہوئے ہوں تو وہ کس قدر شرمائے گا؟ بے حیائی کی کتنی بڑی مقدار اس کو برہنہ ہونے کے لئے درکار ہوگی اور پھر بھی ماحول کے اثرات سے اس کی شدید بے حیائی بھی کس قدر بار بار شکست کھائے گی؟ لیکن جہاں ایک حمام میں سب ننگے ہوں وہاں شرم بے چاری کو پھٹکنے کا موقع نہ ملے گا اور ہر شخص کی بے شرمی دوسروں کی بے شرمی سے مدد پاکر افزوں اور افزوں ہوتی چلی جائے گی......!

اجتماعی روزے کا مہینہ قرار دے کر رمضان سے شارع نے یہی کام لیا ہے۔ جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ ہر غلہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھولتا ہے اور ہر طرف کھیتوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے، اسی طرح رمضان کا مہینہ گویا خیر و صلاح اور تقویٰ و طہارت کا موسم ہے جس میں برائیاں دبتی ہیں، نیکیاں پھلتی ہیں، پوری پوری آبادیوں پر خوف خدا اور حب خیر کی روح چھا جاتی ہے اور ہر طرف پرہیزگاری کی کھیتی سرسبز نظر آنے لگتی ہے۔ اس زمانے میں گناہ کرتے ہوئے آدمی کو شرم آتی ہے۔ ہر شخص خود گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے کسی دوسرے بھائی کو گناہ کرتے دیکھ کر اسے شرم دلاتا ہے۔ ہر ایک کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچھ بھلائی کا کام کرے، کسی غریب کو کھانا کھلائے، کسی ننگے کو کپڑا پہنائے، کسی مصیبت زدہ کی مدد کرے، کہیں کوئی نیک کام کررہا ہو تو اس میں حصہ لے، کہیں کوئی بدی ہورہی ہو تو اسے روکے۔ اس وقت لوگوں کے دل نرم ہوجاتے ہیں، ظلم سے ہاتھ رُک جاتے ہیں، برائی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت پیدا ہوجاتی ہے، توبہ اور خشیت و انابت کی طرف طبیعتیں مائل ہوتی ہیں، نیک بہت نیک ہوجاتے ہیں اور بد کی بدی اگر نیکی میں تبدیل نہیں ہوتی تب بھی اس جلاب سے اس کا اچھا خاصا تنقیہ ضرور ہوجاتا ہے۔ غرض اس زبردست حکیمانہ تدبیر سے شارع نے ایسا انتظام کردیا ہے کہ ہر سال

ایک مہینے کے لئے پوری اسلامی آبادی کی صفائی ہوتی رہے اس کو اوور ہال کیا جاتا رہے' اس کی کایا پلٹی جائے اور اس میں مجموعی حیثیت سے روح اسلامی کو از سر نو زندہ کر دیا جائے۔

اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین باندھ دیئے جاتے ہیں۔'' اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ: '' جب رمضان کی پہلی تاریخ آتی ہے تو شیاطین اور سرکش جن باندھ دیئے جاتے ہیں' دوزخ کی طرف جانے کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں ان میں سے کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا اور جنت کی طرف جانے کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں رہتا۔ اس وقت پکارنے والا پکارتا ہے: ''اے بھلائی کے طالب آگے بڑھ اور اے بُرائی کے خواہشمند ٹھہر جا!'' (اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر ص 78 تا 108)

رمضان' قرآن کریم اور ہماری ذمہ داری

پروفیسر خورشید احمد

اللہ تعالیٰ کا فضل اور کرم ہے کہ رمضان کا بابرکت مہینہ ہم پر اور امت مسلمہ پر سایہ فگن ہونے والا ہے۔ یہ مہینہ اہل ایمان کے لئے اللہ تعالیٰ کے انعامات میں ایک خاص مقام رکھتا ہے اور یہ ہماری بڑی بدنصیبی ہوگی کہ اس مبارک مہینے کو پائیں' اللہ کی رحمت سے اس میں روزوں کی سعادت بھی حاصل کریں مگر اس اصل مقصد اور پیغام کے بارے میں غافل رہیں جو اس مہینے اور اس میں انسانیت کو دیئے جانے والے ربانی تحفے کا اصل جوہر ہے۔

روزہ اللہ کے ماننے والے تمام انسانوں کے لئے ہر دور میں فرض کیا گیا ہے اور اس کی کی بے شمار مصلحتوں میں سے تین کم از کم ایسی ہیں جن کا ہر لمحے شعور از بس ضروری ہے۔

○ پہلی بات یہ ہے کہ روزہ بندے کو اپنے رب سے جوڑتا ہے اور اس سے وفاداری اور صرف اس کی اطاعت کے جذبے پر دل و دماغ کو قانع اور مستحکم کرتا ہے اور اس کے اس عہد کی تجدید کی خدمت انجام دیتا ہے کہ بندے کا جینا اور مرنا اور عبادات اور قربانیاں سب صرف اللہ کے لئے ہیں۔ حلال اور حرام کا تعلق صرف اللہ کی مرضی اور حکم سے ہے جو چیز افق پر روشنی کی پہلی کرن آنے تک حلال تھی وہ صرف اس کے حکم سے سورج کے غروب ہونے تک حرام ہوگئی اور سورج کے غروب ہوتے ہی پھر حلال ہوگئی۔ یہ وہ عبادت ہے جس کا حقیقی گواہ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ایک شخص دوسروں کے سامنے صائم ہوتے ہوئے بھی تنہائی میں کھا پی سکتا ہے مگر صرف اللہ کی خاطر کھانے اور پینے سے جلوت اور خلوت ہر کیفیت میں پرہیز کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود رب کائنات نے فرمایا ہے کہ روزہ صرف میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا اجر دُوں گا۔ اللہ سے جڑنا اور اللہ کی رضا کا پابند ہو جانا اور یہ عہد کرنا کہ ہمیشہ صرف اس کی رضا کا پابند رہوں گا یہ ہے روزے کا پہلا روشن ترین پہلو۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کی

زندگی میں نظم وضبط اور خواہشات پر قابو پانے کی تربیت دیتی ہے اور اسی کیفیت اور رویئے کا نام ہے تقویٰ اسی لئے فرمایا گیا:

(ترجمہ) اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کئے گئے جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کئے گئے تھے۔ اس توقع کے ساتھ کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔

○ روزے کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کا تعلق انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے ہے۔ جن انبیائے کرام کو کتاب سے نوازا گیا ان کو یہ کتاب اس حالت میں دی گئی جب وہ روزے سے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی وحی کا آغاز غار حرا میں اس وقت ہوا جب آپؐ وہاں مسلسل روزوں کی حالت میں تھے اور اس مقدس کتاب کا آغاز بھی روزے سے ہوا اور اس کی تکمیل ماہ رمضان میں ہوئی یہی وجہ ہے کہ یہ مہینہ دراصل قرآن کا مہینہ ہے اور اس کے شب و روز قرآن سے تعلق کی تجدید اس کی تلاوت، تراویح میں اس کی سماعت اور اس کے پیغام کی تفہیم اور تلقین کے لئے خاص ہیں۔ قرآن نہ صرف مکمل ہدایت کا حقیقی مرقع ہے بلکہ انگلی پکڑ کر ہدایت کی راہ پر انسان کو گامزن کرنے اور خیر و شر میں تمیز کی صلاحیت اور داعیہ پیدا کرنے والی ہدایت ہے۔ ارشاد ربانی ہے: (ترجمہ) رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لئے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔

بس یہ مہینہ قرآن کا مہینہ ہے اور اس مہینے کا حق یہ ہے کہ ہم پورے شعور کے ساتھ یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ قرآن کیا ہے اس کی اتھارٹی کی کیا حیثیت ہے اس کی تعلیمات کی نوعیت کیا ہے۔ اس سے ہمارا تعلق کن بنیادوں پر استوار ہونا چاہئے اور اس کے پیغام کے ہم کس طرح علم بردار ہوسکتے ہیں تاکہ اللہ کے انعام کا شکر ادا کرسکیں۔ اس موقع کی مناسبت سے ہم قرآن کے مقصد حیات، اس سے تعلق کی بنیادوں اور انکے تقاضوں پر اپنی معروضات پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں۔

اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے روزے کے تیسرے امتیازی پہلو کی طرف بھی اشارہ کردیں اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ ایک طرف رمضان کے روزوں کو مکمل کریں لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو ذمہ داری تمہیں ادا کرنی ہے اور پورے سال بلکہ پوری زندگی ادا کرنی ہے وہ اعلائے کلمتہ الحق ہے یعنی اللہ کی زمین پر اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کی کوشش کریں اور اس طریقے سے کریں جو تمہیں اللہ کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکھایا اور دکھایا ہے۔

ترجمہ: تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار واعتراف کرو اور شکر گزار ہو۔

قدرت کا قانون ہے کہ جب تاریکی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو روشنی اس کا سینہ چیرتی ہوئی رونما ہوجاتی ہے ظلمتیں چھٹ جاتی ہیں اور فضا نور سے بھر جاتی ہے تاریخ انسانی میں روشنی اور نور کا سب سے

بڑا سیلاب 27 رمضان المبارک 13 قبل ہجرت میں رونما ہوا۔

انسانیت کے لئے ہدایت

خشکی وتری اور بحروبر پر تاریکی کا غلبہ تھا۔ ظلم اور فساد سے خدا کی زمین بھر گئی تھی۔ انسان اپنے حقیقی معبود کو چھوڑ کر جھوٹے خداؤں کی بندگی کررہے تھے۔ ارض وسما کے مالک نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے جو ہدایت اور رہنمائی بھیجی تھی انسان نے اس کو گم کردیا تھا۔ نتیجے کے طور پر گمراہی اور ظلمت کا دور دورہ تھا۔ انسان' آگ' درخت' پتھر' پانی اور جانوروں تک کی پوجا کررہے تھے۔ زندگی کے اجتماعی معاملات میں کچھ انسان دوسرے انسانوں کے خدا اور رب بن بیٹھے تھے اور اپنی من مانی کررہے تھے۔ نیکیاں معدوم ہورہی تھیں اور برائیاں پرافشاں تھیں۔ نسل' قوم اور قبیلے کے بتوں کی پوجا ہورہی تھی۔ حق انصاف' آزادی' مساوات اور بندگی رب کو انسانیت ترس رہی تھی۔

یہ تھی وہ دنیا جس میں خدا کے ایک برگزیدہ بندے' انسانیت کے بلند ترین پیکر اور دنیا کے سب سے نیک انسان محمدؐ بن عبداللہ نے آنکھیں کھولیں۔ وہ ظلم کے اس راج اور بدی کے اس غلبے پر حیران و سرگرداں تھا۔ ترجمہ: وہ جھوٹے خداؤں کا باغی اور ایک حقیقی خدا کی بندگی کا جویا تھا۔ دست فطرت نے 40 سال اس کی تربیت فرمائی پھر زمین و آسمان کے مالک نے ایک شب اس باکمال ہستی کو انسانیت کی رہنمائی کے لئے اپنے آخری نبی کی حیثیت سے مامور فرمادیا۔ وہ غار حرا میں عبادت میں مشغول تھا کہ خدا کا فرشتہ اس کا امین اور پیام بر رونما ہوا۔ بندگی میں مشغول بندے کو سینے سے لگایا' اسے خوب بھینچا اور رب السموات والارض کی طرف سے پہلی وحی اس پر نازل کی۔ ترجمہ: پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام سے جس نے (ساری چیزوں) کو پیدا کیا۔ اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے بنایا۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے' جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا' اس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اس کو معلوم نہ تھیں۔

تاریکیوں کے لئے موت کا پیغام آگیا۔ طاغوت کے غلبے کا دور ختم ہوگیا۔ رب کی آخری ہدایت کا دور شروع ہوگیا۔ یہ سلسلہ 23 سال تک چلتا رہا حتیٰ کہ ہدایت مکمل ہوگئی اور انسانیت کو نور کا وہ خزانہ مل گیا جس کی روشنی تاقیامت قائم رہے گی جس کے ذریعے وہ ہمیشہ رہنمائی اور ہدایت حاصل کرتی رہے گی۔

ترجمہ: آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کردیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے۔ خدا کی اس زمین پر انسان کی ضرورتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق اس کی جسمانی اور مادی زندگی سے ہے اور دوسری وہ جو اس کی روحانی' اخلاقی اور سماجی زندگی سے متعلق ہیں۔ خدا کی ربوبیت کاملہ کا تقاضا تھا کہ انسان کی یہ دونوں ضرورتیں پوری کی جائیں تاکہ وہ زندگی کی آسائشیں بھی حاصل کرسکے اور ان کو صحیح طریقوں سے

استعمال بھی کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ان دونوں ضرورتوں کو بہ حسن وکمال پورا کیا ہے۔ مادی اور جسمانی ضروریات کی تسکین کے لئے زمین و آسمان میں بے شمار قوتیں ودیعت کردی ہیں جن کی دریافت اور ان کے مناسب استعمال سے انسان کی تمام ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح انسان کی روحانی، اخلاقی اور سماجی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت نازل فرمائی اور اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے نہ صرف یہ کہ اس ہدایت کو انسانوں تک پہنچایا بلکہ ان کی زندگیوں میں اسے متشکل کر کے بھی دکھا دیا۔ اس طرح انسانیت نے اپنا سفر تاریکی میں نہیں روشنی میں شروع کیا اور ہر دور میں خدا کی ہدایت اس کے لئے مشعل راہ بنی رہی۔ اس دنیا میں پہلا انسان (آدم) پہلا نبی بھی تھا۔ خدا کی یہ ہدایت اپنی آخری اور مکمل ترین شکل میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کی گئی یہی ہدایت قرآن کی شکل میں موجود ہے اور قیامت تک انسانیت کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

قرآن کا تصور زندگی

قرآن جس تصور زندگی کو پیش کرتا ہے وہ مختصراً یہ ہے۔

1۔ یہ دنیا بے خدا نہیں ہے۔ اس کا ایک پیدا کرنے والا ہے جو اس کا مالک، آقا، رب اور حاکم ہے۔ ہر شے پر اس کی حکومت ہے اور وہی اس کا حقیقی فرماں روا ہے۔ ساری نعمتیں اسی کا عطیہ ہیں۔ اس کا اختیار کلی اور ہمہ گیر ہے۔ جس طرح وہ دنیا کی ہر چیز کا خالق اور مالک ہے، اسی طرح وہ انسان کا بھی خالق، مالک اور حاکم ہے اس مالک حقیقی نے انسان کو ایک خاص حد تک اختیار اور آزادی دے کر، اس زمین پر اپنا نائب اور خلیفہ بنایا ہے اور باقی تمام مخلوقات کو اس کے تابع فرمان کیا ہے۔

2۔ انسان کو خلافت کی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کے لائق بنانے کے لئے مالک حقیقی نے اسے اپنی ہدایت سے نوازا اور اس کی رہنمائی صراط مستقیم کی طرف کی ہے۔ اسے بتایا گیا ہے کہ پورا جہاں اس کے لئے ہے، اس کے تابع ہے لیکن وہ خود خدا کے لئے ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ خدا کی بندگی اختیار کرے اور اپنی پوری زندگی کو رب کی اطاعت میں دے دے۔ اس زندگی کی حیثیت ایک امتحان اور آزمائش کی سی ہے۔ اس میں انسان کے لئے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ اپنے ارادے کو مالک کی مرضی کے تابع کردے اور اس کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لئے اپنا سب کچھ لگا دے جس نے اس راہ سے انحراف کیا وہ ناکام و نامراد ہے اور آنے والی ابدی زندگی میں جہنم اس کا ٹھکانا ہوگا۔

3۔ یہ باتیں انسان کو ازل میں سمجھا دی گئیں۔ ان کا شعور اور احساس اس کی فطرت میں ودیعت کردیا گیا۔ ان کی تذکیر اور بندگی رب کے راستے کی تشریح و توضیح کے لئے حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک، اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کرتا رہا۔ ایک طرف انسان کو عقل اور سمجھ دی گئی کہ وہ حق کو پہچانے اور اس کے مطابق زندگی کے معاملات کی صورت گری کرے اور

دوسرے طرف خدا کے ان برگزیدہ بندوں (انبیاء علیہم السلام) نے بڑی سے بڑی قربانی دے کر انسانیت کو سیدھی راہ پر لگانے کا کام انجام دیا۔ ہر ملک اور ہر قوم میں انبیاء مبعوث ہوئے۔ اس سنہری سلسلے کی آخری کڑی محمد عربیؐ ہیں۔ آپؐ ساری دنیا کے لئے بھیجے گئے اور سارے زمانوں کے لئے مبعوث ہوئے۔ آپؐ نے اللہ کا ہی دین، یعنی اسلام لوگوں کے سامنے پیش کیا جو اس سے پہلے پیش ہوتا رہا تھا جن لوگوں نے آپ کی دعوت قبول کر لی اور اسلام کو بہ حیثیت زندگی کے دین اور راستہ اختیار کر لیا وہ ایک امت بن گئے۔ اب یہ امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کا نظام اس ہدایت کے مطابق تشکیل دے جو اللہ کی طرف سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے اور جس کا نمونہ آپؐ نے اپنی مبارک زندگی میں پیش فرمایا اور تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کی دعوت دیتی رہی۔

قرآن وہ کتاب ہے جس میں پوری دعوت موجود ہے، جس میں اللہ کا دین اپنی مکمل اور آخری شکل میں ملتا ہے، جس میں وہ ہدایت ہے جو خالق کائنات نے اُتاری ہے اور جو تمام انسانوں کی دائمی خیر و فلاح کی ضامن ہے۔ قرآن اپنی حیثیت اور اپنے مقصد کو اس طرح واضح کرتا ہے۔ ترجمہ: یہ اللہ کی کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ پرہیز گاروں کے لئے ہدایت ہے۔

(ب) ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔

(ج) یہ رہنمائی تمام انسانوں کے لئے ہے۔

ترجمہ: قرآن انسانوں کے لئے ہدایت ہے۔

(د) یہ ہدایت کا ایسا مرقع ہے جس میں ازل سے نازل ہونے والی ہدایت جمع کردی گئی ہے اور یہ پورے خیر کا مجموعہ ہے۔

ترجمہ: پھر اے نبیؐ ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے، اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے۔

(ہ) یہ ہدایت ہر لحاظ سے محفوظ بھی ہے اور تا قیامت محفوظ رہے گی۔

ترجمہ: بلاشبہ ہم نے اس کو نازل کیا ہے اور ہم خود ہی اس کو محفوظ رکھنے والے ہیں۔

(و) انسانیت کے دُکھوں کا واحد علاج یہ ہدایت ہے۔

ترجمہ: لوگو! تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے پاس ایک نصیحت آ گئی ہے جو دل کے تمام امراض کے لئے شفا ہے اور ہدایت اور رحمت ہے ان تمام لوگوں کے لئے جو اسے مانیں۔

(ز) اور یہی ہدایت ہے جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی حق کا حقیقی معیار ہے۔ اس لئے اس کو مُہیمن کہا گیا ہے اور اسی لئے اس کا نام فرقان (حق و باطل میں تمیز کرنے والی) رکھا گیا ہے۔

قرآن کا اصل مقصد

قرآن کی اس نوعیت کو سمجھ لینے کے بعد اس کی حقیقت اور اس کے مقصد کی وضاحت آسان ہو جاتی ہے اُسے ہم مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں۔

○ قرآن کا موضوع انسان ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے اس کی فلاح اور خسران کس چیز میں ہے۔

○ قرآن کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ ظاہر بینی یا قیاس آرائی یا خواہش کی غلامی کے باعث انسانوں نے خدا، نظام کائنات، اپنی ہستی اور اپنی دنیوی زندگی کے متعلق جو نظریات قائم کئے ہیں اور ان نظریات کی بنا پر جو رویئے اختیار کر لئے ہیں وہ سب حقیقت کے لحاظ سے غلط اور نتیجے کے اعتبار سے خود انسان ہی کے لئے تباہ کن ہیں۔ حقیقت وہ ہے جسے انسان کو خلیفہ بناتے وقت خدا نے خود بیان فرما دیا ہے۔ اس حقیقت کے لحاظ سے وہی رویہ درست اور خوش انجام ہے جو خدا کو اپنا واحد حاکم اور معبود تسلیم کر کے اس دنیا میں اس کی ہدایت کے مطابق اپنی پوری زندگی کو گزارا جائے۔

○ قرآن کا مدعا انسان کو اس صحیح رویئے کی طرف دعوت دینا اور اللہ کی اس ہدایت کو واضح طور پر پیش کرنا ہے جسے انسان اپنی غفلت سے گم اور شرارت سے مسخ کرتا رہا ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اول، مقدمہ از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

نزول قرآن کا اصل مقصد انسانوں کی تہذیب اور ان کے باطل عقائد اور گم کردہ اعمال کی اصلاح اور درستی ہے۔ (الفوز الکبیر)

قرآن تمام انسانوں کو ابدی سعادت کی طرف بلاتا ہے اور انسان کے ظاہر و باطن کی واپسی تعمیر کرتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو، دنیا اور آخرت کی زندگیوں میں حقیقی چین اور راحت نصیب ہو۔ یہی راستہ رب کی بندگی کا راستہ ہے۔

ترجمہ: میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔

یہ بندگی انسان کی پوری زندگی پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا ہر سانس احساس عبدیت سے معمور ہونا چاہئے اور اس کا ہر عمل مالک کی اطاعت کا مظہر ہونا چاہئے۔

قرآن کا انقلابی تصور

یہ مقام ہے جہاں سے قرآن کا انقلابی تصور حیات ہمارے سامنے آتا ہے۔ قرآن انسانی زندگی کو مختلف گوشوں اور شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ وہ پوری زندگی کو بندگی رب میں لانا چاہتا ہے۔ انسان کے خیال اور عقیدہ و رجحان سے لے کر اس کی اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر اللہ تعالیٰ کی حکمرانی قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کا مطالبہ خود مسلمانوں سے یہ ہے کہ

ترجمہ: داخل ہو جاؤ خدا کے دین میں پورے کے پورے۔

یعنی اسلام کے راستے کو اختیار کرنے کے بعد زندگی کے کسی شعبے کو خدا کی ہدایت سے آزاد رکھنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پھر انسان کی انفرادی زندگی اور اس کی اجتماعی زندگی' خدا کے قانون کی پابندی اور اس کی رضا کو تلاش کرنے والی ہوگی پھر تمدن کے پورے نظام یعنی معاشرت' سیاست' معیشت' قانون وعدالت' انتظام والصرام' ملکی اور بین الاقوامی تعلقات' سب پر خدا کی حکمرانی قائم ہونی چاہئے۔ صرف اپنے اوپر ہی اس قانون کو جاری وساری نہیں کرتا بلکہ پوری انسانیت کو اپنے قول اور عمل سے اس راستے کی طرف دعوت دینا ہے۔ انسانیت کو حق کی طرف بلانا ہے' اور ہر اس رکاوٹ کو ہٹانے کی جدوجہد کرنی ہے جو بندے اور اس کے رب کے درمیان اس تعلق کے قیام کی راہ میں مزاحم ہے۔ اس کا نام دعوت حق ہے جو اسلام میں جہاد ہی کا ایک شعبہ ہے یہی وہ دعوت ہے جس کی طرف یہ کتاب بلاتی ہے۔

علامہ اقبال مشہور صوفی بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے حوالے سے قرآن کے اس مخصوص مزاج کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں۔ ''محمد عربیؐ معراج کے موقع پر آسمانوں پر گئے اور واپس آگئے۔ اللہ کی قسم!! اگر میں جاتا تو ہرگز واپس نہ آتا''۔ یہ مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے الفاظ ہیں جن کی نظیر تصوف کے سارے ذخیرہ ادب میں مشکل ہی سے ملے گی۔ شیخ موصوف کے اس ایک جملے سے ہم اس فرق کا ادراک نہایت خوبی سے کرلیتے ہیں جو شعور ولایت اور شعور نبوت میں پایا جاتا ہے۔ صوفی نہیں چاہتا کہ واردات اتحاد سے جو لذت اور سکون حاصل ہوتا ہے اسے چھوڑ کر واپس آئے لیکن اگر آئے بھی جیسا کہ اس کا آنا ضروری ہے تو اس سے نوع انسانی کے لئے کوئی خاص نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس نبیؐ کی باز آمد تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ ان واردات سے واپس آتا ہے تو اس لئے کہ زمانے کی رو میں داخل ہوجائے اور پھر ان قوتوں کے غلبہ وتصرف سے' جو عالم تاریخ کی صورت گر ہیں مقاصد کی ایک نئی دنیا پیدا کرے۔ صوفی کے لئے تو لذت اتحاد ہی آخری چیز ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کے لئے اس کا مطلب ہے ان کی اپنی ذات کے اندر کچھ اس قسم کی نفسیاتی قوتوں کی بیداری جو دنیا کو زیروزبر کرسکتی ہے اور جن سے کام لیا جائے تو جہان انسانی دگرگوں ہوجاتا ہے۔ لہٰذا انبیاءؑ کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان وارات کو ایک زندہ اور عالم گیر قوت میں بدل دیں...... لہٰذا انبیاء کے مذہبی مشاہدات اور واردات کی قدروقیمت کا فیصلہ ہم یہ دیکھ کر بھی کرسکتے ہیں کہ ان کے زیر اثر کس قسم کے انسان پیدا ہوئے۔ (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' علامہ محمد اقبال' ترجمہ سید نذیر نیازی' بزم اقبال' لاہور' ص 188-190)

مطلب یہ کہ بزرگ صوفی کا یہ قول زندگی کے محدود تصور کا غماز ہے۔ اس تصور میں اصل اہمیت عرفان ذات کی ہے اور وہ اس سے اونچے کسی مقام کا تصور نہیں کرسکتی کہ بندے کے قدم وہاں پہنچ جائیں جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں پھر اس دنیا کی طرف واپس آنے کا کیا سوال؟ لیکن محمد صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم جس دین کے علم بردار ہیں وہ دین جس کا نبی اس بلندی پر پہنچ کر پھر اس دنیائے رنگ و بو میں لوٹتا ہے تاریخ کے منجدھار میں قدم رکھتا ہے اور اس نور سے جو اسے حاصل ہوا ہے تنگ و تاریک دنیا کو منور کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ صرف اپنے اس سینے کو گنجینہ انوار نہیں بناتا بلکہ پورے عالم کو روشن کرنے کی جدوجہد کرتا ہے۔ ایک نیا انسان بنانے' ایک نیا معاشرہ تعمیر کرنے' ایک نئی ریاست قائم کرنے اور تاریخ کو ایک نئے دور سے ہمکنار کرنے میں مصروف جہاد ہو جاتا ہے۔

قرآن اسی دعوت انقلاب کو پیش کرتا ہے' وہ زمانے کے چلن کو تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایک نیا نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد ایک انقلاب برپا کرنا ہے...... دلوں کی دنیا میں بھی انقلاب اور انسانی معاشرے میں بھی انقلاب۔ وہ صالح انقلاب جس کے نتیجے میں خدا سے بغاوت کی روش ختم ہو اور اس کی بندگی کا دور دورہ ہو جائے۔ بُرائیاں سرنگوں اور نیکیوں کا غلبہ حاصل ہو۔ خدا کے منکر اور اس سے غافل قیادت کو مسند سے ہٹا دیا جائے اور اس کے مطیع اور فرماں بردار بندے زمانے کی قیادت سنبھال لیں...... یہ ہے نزول قرآن کا مقصد اور یہی ہے انسانیت کی نجات کا راستہ۔

ہم امت مسلمہ کو جس بات کی دعوت دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس امت کا ہر فرد اس موقع پر اور بھی زیادہ سنجیدگی کے ساتھ قرآن کی اصل حقیقت کو سمجھے۔ اس کے مقصد کا حقیقی شعور پیدا کرے۔ اس کے پیغام پر کان دھرے اور اس کے مشن کو پورا کرنے کے لئے سرگرم عمل ہو جائے۔

قرآن نے انسانیت کو ایک نیا راستہ دکھایا ہے۔ اس نے قبیلے' نسل' رنگ' خاک وخون اور جغرافیائی تشخص کے بتوں کو پاش پاش کیا ہے۔ اس نے یہ اعلان کیا ہے کہ پوری انسانیت ایک گروہ ہے اور اس میں جمع تفریق اور نظام اجتماعی کی تشکیل کے لئے صرف ایک ہی اصول صحیح ہے۔ یعنی عقیدہ اور مسلک اسی اصول کے ذریعے اس نے ایک نئی امت بنائی اور اس امت کو انسانیت کی اصلاح اور تشکیل نو کے عظیم کام پر مامور کر دیا۔

ترجمہ: اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

قرآن نے اس امت کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بھی صورت گری کی ہے اور اسے باقی انسانیت کے لئے خیر و صلاح کا علم بردار بنایا ہے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے چھٹی صدی عیسوی کی ظلم اور تاریکی سے بھری ہوئی دنیا کو تاریخ کے ایک نئے دور سے روشناس کرایا۔ جس نے عرب کے اونٹ چرانے والوں کو انسانیت کا حدی خواں بنایا۔ جس نے ریگستان کے بدوؤں کو تہذیب و تمدن کا معمار بنا دیا۔ جس نے مفلسوں اور فاقہ کشوں میں سے وہ لوگ اُٹھائے جو انسانیت کے رہبر بنے۔ جس نے وہ نظام قائم کیا جس نے طاغوت کی ہر قوت سے ٹکر لی اور اسے مغلوب کر ڈالا۔

قرآن طاقت کا ایک خزانہ ہے۔ اس نے جس طرح آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے انسانوں کی

اصلیت بدل کر رکھ دی تھی اور ان کے ہاتھ سے ایک نئی دنیا تعمیر کرائی تھی' اسی طرح آج بھی فساد سے بھری ہوئی دنیا کو تباہی سے بچا سکتا ہے۔ اپنے ماننے والوں کو بشرطیکہ وہ اس کا حق ادا کرسکیں' انسانیت کا رہنما اور تاریخ کا معمار بنا سکتا ہے۔

خوب کہا امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ نے:

ترجمہ: اس اُمت کے بعد کے حصے کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہوگی' جس سے اس کے اول حصے کی اصلاح ہوئی تھی......اور یہ چیز قرآن ہے۔

قرآن سے حقیقی تعلق اور تقاضے

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن نے پہلے بنجر اور شور زمین سے ایک نیا جہاں پیدا کردیا تھا' تو آج وہ یہ کارنامہ کیوں سرانجام نہیں دے رہا؟

○ اگر وہ کل شفا ور حمت تھا تو وہ آج یہ وظیفہ سرانجام دیتا ہوا کیوں نظر نہیں آتا؟

○ اگر ہم کل اس کی وجہ سے طاقت ور تھے تو آج اس کے باوجود ہم کمزور کیوں ہیں؟

○ اگر کل اس کے ذریعے ہم دنیا پر غالب تھے تو آج اس کے ہوتے ہوئے ہم مغلوب کیوں ہیں؟

اگر غور کیا جائے تو اس کی دو ہی وجوہ ہو سکتی ہیں......ایک' یہ کہ ہم نے عملاً اس کتاب ہدایت کو اپنا حقیقی رہنما باقی نہ رکھا ہو۔ اس سے ہمارا تعلق غفلت و سرد مہری و بے التفاتی اور بے توجہی کا ہو گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ ہم بظاہر تو اس کا احترام اور تقدیس کر رہے ہوں لیکن اس کو سمجھنے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے صحیح راستہ اور صحیح طریقہ اختیار نہ کر رہے ہوں بدقسمتی سے ہمارے معاملے میں یہ دونوں ہی باتیں صحیح ہیں۔

برف کی طرح پگھلتی اور ہر آن قطرہ قطرہ ختم ہوتی اس زندگی میں یہ بڑا ہی سنہری موقع ہے کہ ہم لمحہ بھر رُک کر سوچیں کہ خدا کی اس کتاب سے ہمارا تعلق کیا ہونا چاہئے؟ اور ہمیں اس سے کیا معاملہ کرنا چاہئے تاکہ یہ اپنے اثرات دکھا سکے اور اس کی روشنی دنیا کے گوشے گوشے کو نور سے بھردے۔

1۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اپنے اس سوئے ہوئے ایمان کو بیدار کیا جائے جو قرآن پر لایا تو ضرور گیا ہے۔ مگر اس کا یقین اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے جذبے اور شوق سے عاری ہے۔ یاد رکھئے کہ یہ ایمان اس کے' خدا کی کتاب ہونے پر اس کے مکمل طور پر محفوظ ہونے پر' اس کے ہر لفظ کے حق و صداقت ہونے پر' اس کے بتائے ہوئے طریقے کے درست اور مفید ہونے پر' اس کے بتائے ہوئے علاج کے اصل ضامن شفا ہونے پر ہے...... یہ ہے نقطہ آغاز:

ترجمہ: بے شک تم مُردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی دعوت سنا سکتے ہو۔ جب وہ اعتراض کرتے ہوئے منہ پھیر لیں' اور نہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال سکتے ہو تم تو صرف انہی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔

ترجمہ: اور جو لوگ اس کا انکار کریں گے وہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

2۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ دل قرآن حکیم کی عظمت اور بلندی، اس کے اعلیٰ اور برتر کلام ہونے کے احساس سے معمور ہو۔ یہ وہ کلام ہے جو اگر پہاڑوں پر نازل ہوتا تو وہ شق ہو جاتے۔ اس پر عظمت کلام کے مقابلے میں اپنی عاجزی کا احساس اور دل کا اس کے لئے موم ہو جانا بہت ضروری ہے۔

ترجمہ: جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اُترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں یہ معرفت حق کا لازمی نتیجہ ہے۔

3۔ قرآن سے رہنمائی اور رہبری کے لئے رجوع کرنا، اس کے بارے میں غفلت کی روش کو ترک کر کے اسے سمجھنے کی کوشش کرنا، یہ دیکھنا کہ کس طرح وہ ہماری زندگی کا نقشہ بدلنا چاہتا ہے، اس کتاب کو مضبوطی سے تھامنا اور ہر معاملے میں اس سے ہدایت حاصل کرنا...... یہی وہ طریقہ ہے جس سے اس کتاب کے اصل اسرار و رموز ہم پر منکشف ہو سکیں گے۔

ترجمہ: اے پیغمبر! جو کچھ تمہاری طرف وحی کیا گیا ہے، اس کو خوب مضبوط پکڑے رہو۔ یقین رکھو کہ تم سیدھے راستے پر ہو اور یہ (قرآن) تمہارے لئے اور تمہاری قوم کے لئے یقیناً ایک نصیحت نامہ ہے اور آگے چل کر تم سب سے اس کی بابت باز پرس ہوگی۔

امام شاطبی رحمتہ اللہ علیہ نے بجا فرمایا ہے۔

جو شخص دین کو جاننا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن ہی کو اپنا مونس و ہم دم بنائے۔ شب و روز قرآن ہی سے تعلق رکھے۔ یہ ربط و تعلق علمی اور عملی دونوں طریقوں سے ہونا چاہئے ایک ہی پر اکتفانہ کرے۔ جو شخص یہ کرے گا وہی شخص گو ہر مقصود پائے گا۔ (الموافقات، ج 3 ص 346)

4۔ قرآن کا مطالعہ کیا جائے اور اس طرح کیا جائے جو اس کا حق ہے۔ ترجمہ: جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔

اسکے معنی یہ بھی ہیں کہ قرآن کی تلاوت کے ظاہری آداب پورے کئے جائیں یعنی اسے پاک حالت میں چھوا جائے، ادب سے مطالعہ کیا جائے، ترتیل سے پڑھا جائے اور خوش الحانی سے پڑھا جائے وغیرہ۔ اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کے معنی کو سمجھا جائے اور ان پر غور و فکر کیا جائے قرآن کے الفاظ پر سے یوں ہی نہ گزر جایا جائے بلکہ اس کی گہرائیوں میں اُترنے اور اس کے مفہوم کو سمجھنے کی پوری کوشش کی جائے یہی قرآن کا مطالبہ ہے۔

ترجمہ: غور کرنے والوں کے لئے ہم نے اس طرح آیات تفصیل سے بیان کی ہیں۔

ترجمہ: لوگو! ہم نے تمہاری طرف کتاب اُتار دی ہے، جس میں تمہارا ذکر ہے، کیا تم غور نہیں کرتے۔

ترجمہ: اے پیغمبر! یہ قرآن برکت والی کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اُتاری ہے، تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں، وہ اس سے نصیحت پکڑیں یہی صحابہ کرام کا طریقہ تھا کہ وہ

قرآن پاک کی آیات کو سمجھ سمجھ کر پڑھتے تھے اور ان پر غور وفکر کرتے تھے۔

5۔ قرآن پر عمل کیا جائے اور اس کے مطابق اپنے فکر وعمل کو بدلا جائے۔ قرآن پر اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ قرآن کے احکام کے مطابق اپنے کو بدلنے کے بجائے اپنی بداعمالیوں کے لئے جواز پیش کرنے کے لئے قرآن کو (نعوذ باللہ) بدلنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح یہ بھی قرآن کے حقوق کے منافی ہے۔ کہ اس کہ احکام کو تو پڑھا جائے مگر دوسری جانب ان پر عمل نہ کیا جائے قرآن نازل ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کے نقشے کو تعمیر کیا جائے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ قرآن کے مطابق عمل کی سعی کی جائے۔ حضرت ابن مسعودؓ کا ارشاد ہے کہ "جب کوئی شخص ہم میں سے 10 آیتیں سیکھ لیتا تھا تو اس سے زیادہ نہ پڑھتا تھا جب تک ان کے معنی نہ سمجھ لیتا اور ان پر عمل نہ کرتا۔

7۔ پھر قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کے سلسلے میں رہنما اور نمونہ اس مبارک ہستی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ماننا جس پر یہ کتاب نازل ہوئی۔ ترجمہ: جس نے رسولؐ کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ سے سر موانحراف بھی قرآن سے دُور لے جانے والی چیز ہے۔

قرآن کے نظام کو قائم کرنے کے لئے جدوجہد

اور آخری چیز یہ ہے کہ قرآن جس دعوت کو لے کر آیا ہے اسے پھیلانے اور اس کے نظام کو قائم کرنے کی عملی جدوجہد کی جائے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بہت سچ لکھا ہے کہ:

فہم قرآن کی ان ساری تدبیروں کے باوجود آدمی قرآن کی روح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک کہ عملاً وہ کام نہ کرے، جس کے لئے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے، کہ آپ آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دنیا کے عام تصور مذہب کے مطابق ایک نری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رموز حاصل کرلئے جائیں...... یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشہ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اٹھوائی اور وقت کے علم برداران کفر وفسق وضلالت سے اس کو لڑادیا۔ گھر گھر سے، ایک ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعی حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اٹھایا اور حامیان حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فرد واحد کی پکار سے کام شروع کرکے خلافتِ الٰہیہ کے قیام تک پورے 23 سال میں یہ کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی اور حق وباطل کی اس طویل وجاں

مسلسل کش مکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اس نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔

......اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاع کفر و دیں اور معرکہ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کش مکش کی منزل کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں اسے تو پوری طرح آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کر دیں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اس طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزول قرآن کے وقت پیش آئے تھے مکہ' حبشہ اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و احد سے لیکر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا۔ منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے اور سابقین اولین سے لے کر مولفتہ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اور ہی قسم کا سلوک ہے جس کو میں سلوک قرآنی کہتا ہوں۔ اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آ کر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اس منزل میں اُتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو اور معانی اور بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ قرآن اپنی روح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے۔

......پھر اس کلئے کے مطابق قرآن کے احکام' اس کی اخلاقی تعلیمات' اس کی معاشی اور تمدنی ہدایات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اصول و قوانین' آدمی کی سمجھ میں اس وقت تک آ ہی نہیں سکتے جب تک وہ ان کو برت کر نہ دیکھے۔ نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد رکھا ہو اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہو سکتی ہے' جس کے سارے ہی اجتماعی ادارے اس کی بنائی ہوئی روش کیخلاف چل رہے ہوں۔ (تفہیم القرآن' ج ا مقدمہ' ص' 34-33)

یہ ہیں قرآن سے تعلق کی صحیح بنیادیں اور اگر ان پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا ہو تو پھر قرآن انفرادی زندگی کا نقشہ بھی بدل دیتا ہے اور اجتماعی زندگی کی شکل بھی تبدیل کر دیتا ہے۔ انفرادی زندگی اس کی برکتوں سے بھر جاتی ہے اور اجتماعی زندگی نیکی اور خوشی کی بہار سے شاد کام ہوتی ہے۔

قرآن پر ایمان اسی وقت مفید اور معنی خیز ہو سکتا ہے' جب ہم قرآن کے پیغام کو سمجھیں اور اس کی دعوت پر لبیک کہیں قرآن کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے اور اس کی ہدایت کے ذریعے اپنے معاملات

کو طے کرنے کی کوشش کریں آج عالم اسلام جن مسائل اور مصائب سے دوچار ہے ان سے نکلنے' ترقی اور عزت کی راہ پر پیش قدمی کرنے کا راستہ صرف یہی ہے اور صادق برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی کی تلقین کی تھی۔

رسول اللہ: خبردار عنقریب ایک بڑا فتنہ سر اٹھائے گا۔

حضرت علیؓ اس سے نجات کیا چیز دلائے گی یارسول اللہ!

رسول اللہ: اللہ کی کتاب۔

اس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے حالات ہیں۔

تم سے بعد میں ہونے والی باتوں کی خبر ہے۔

اور تمہارے آپس کے معاملات کا فیصلہ ہے۔

اور یہ ایک دوٹوک بات ہے' کوئی ہنسی دل لگی کی بات نہیں

جو سرکش اسے چھوڑے گا' اللہ اس کی کمر کی ہڈی توڑ ڈالے گا۔

اور جو کوئی اسے چھوڑ کر کسی اور بات کو اپنی ہدایت کا ذریعہ بنائے گا' اللہ اسے گمراہ کردے گا۔

خدا کی مضبوط رسی یہی ہے۔

یہی حکمتوں سے بھری ہوئی یاددہانی ہے۔

یہی بالکل سیدھی راہ ہے۔

اس کے ہوتے ہوئے خواہشیں گمراہ نہیں کرتیں۔

اور نہ زبانیں لڑکھڑاتی ہیں۔

اہل علم کا دل اس سے کبھی نہیں بھرتا۔

اسے کتنا ہی پڑھو طبیعت سیر نہیں ہوتی۔

اس کی باتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔

جس نے اس کی سند پر کہا' سچ کہا۔

جس نے اس پر عمل کیا' اجر پائے گا۔

جس نے اس کی بنیاد پر فیصلہ کیا' اس نے انصاف کیا۔

جس نے اس کی دعوت دی' اس نے سیدھی راہ کی دعوت دی۔ (مشکوٰۃ)

یہی وہ سیدھی راہ ہے جس کی طرف قرآن ہم سب کو دعوت دے رہا ہے!

اللہ کا مہینہ

غلام نبی عارف

ویسے تو اسلامی مہینوں میں بارہ کے بارہ مہینے افضل ہیں لیکن رمضان افضل ترین ہے۔ یہ خالصتاً اللہ

تبارک وتعالیٰ کا اپنا مہینہ ہے۔ اسلام کے پانچ ارکان میں سے روزہ تیسرا رکن ہے۔ اس کی خاص اہمیت ہے۔ ہر مسلمان کو چاہئے کہ یہ مہینہ پا کر زیادہ سے زیادہ نیکی کے کاموں میں حصہ لے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے رمضان کے مہینے میں ہر نیک کام کا ثواب کئی گنا بڑھا دیا ہے۔ ہر عاقل و بالغ مسلمان پر رمضان کے روزے فرض ہیں۔

"(ترجمہ) اے ایمان والو تم پر روزے فرض کردیئے گئے ہیں جیسے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ"۔

رمضان شریف کا چاند دیکھ کر روزہ رکھنا چاہئے اگر مطلع ابر آلود ہو تو حکم ہے کہ شعبان کے تیس دن پورے کئے جائیں اس طرح شوال کا چاند دیکھ کر عید کرنی چاہئے، اگر مطلع ابر آلود ہو تو رمضان کے تیس دن پورے کرنے چاہئیں۔

آج کل فی زمانہ حکومت پاکستان کی طرف سے رویت ہلال کمیٹی بنا دی گئی ہے اور ایک عالم فاضل مولانا صاحب اس کمیٹی کے چیئرمین ہوتے ہیں جو کہ خود اور گواہوں کی صورت میں چاند نظر آنے یا نہ آنے کا اعلان ریڈیو ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے پوری ذمہ داری سے ادا کرتے ہیں۔

جبکہ آج سے بہت عرصہ پیشتر رمضان شریف' عیدالفطر' عیدالاضحیٰ اور محرم الحرام کا چاند خصوصی طور پر ہمارے ملک کے عوام گھر کی چھتوں' کھلے میدانوں اور پارکوں میں ٹولیوں کی صورت میں جمع ہو کر دیکھا کرتے تھے۔ ایک آدمی اگر چاند دیکھ لیتا تو وہ خوشی کے مارے دوسرے ساتھیوں کو پکڑ پکڑ ہاتھ کے اشارے سے چاند دکھایا کرتا تھا۔ یوں تمام لوگ چھوٹے بڑے خود اپنی آنکھوں سے چاند دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کیلئے ہاتھ اٹھا لیتے اور اس مہینے کے چاند کی مناسبت سے دعا مانگتے۔ آج کل زمانہ بدل گیا ہے۔ سائنسی دور ہے۔ موبائل' کمپیوٹر' لیپ ٹاپ اور انٹرنیٹ نے سب کام سنبھال رکھے ہیں۔ انسان ان سب کا محتاج ہو گیا ہے۔

یہ مندرجہ بالا اشیاء بھی خداوند کریم نے انسان کو عقل اور علم کے ذریعے عطا فرمائی ہیں اور اس میں کوئی ذرہ بھر بھی شک وشبہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

روزوں کی فضیلت

رمضان کا مہینہ شروع ہوتے ہی آسمان یعنی جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور شیاطین کو زنجیروں سے جکڑ دیا جاتا ہے۔ جو شخص ایمان کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے روزے رکھے تو اس کے پہلے تمام گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ابن آدم کا ہر نیک عمل بڑھا دیا جاتا ہے۔ اس طرح کہ ایک نیکی کا بدلہ دس گناہ سے لے کر سات سو گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں سوائے روزے کے کیونکہ وہ خالصتاً میرے لئے ہے اور میں ہی

اس کا اجر دُوں گا۔

روزوں کے آداب

فجر سے پہلے روزے کی نیت کرنا ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا سحری کھایا کرو سحری میں برکت ہے۔ غروب آفتاب کے ساتھ ہی افطاری کرلینی چاہئے۔ روزہ افطار کرنے میں جلدی کریں گے تو ہمیشہ بھلائی ہوگی۔

روزہ دار کیلئے جائز امور کا بیان

حالت روزہ میں بغیر مبالغہ کے کلی کرنا ناک میں پانی چڑھانا' بھول کر کھا پی لینے سے' مسواک کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ حالت روزہ میں سر پر تیل لگانا' کنگھی کرنا' سرمہ استعمال کرنا جائز ہے۔ خود بخود قے آنا' ناک میں دوا ڈالنے (اگر وہ حلق تک نہ پہنچے) تو کوئی حرج نہیں۔

روزہ دار کے لئے ناجائز امور کا بیان

روزہ دار کیلئے غیبت کرنا' لڑائی جھگڑا کرنا' جھوٹ بولنا' گالی دینا بدرجہ اولیٰ ناجائز ہیں۔ روزہ دار کے لئے بے ہودہ' فحش اور جہالت کے کام یا گفتگو کرنا منع ہے۔ روزہ صرف کھانا پینا چھوڑنے

رمضان میں ذکر کی فضیلت

امیر المومنین حضرت سیدنا عمر فاروق اعظمؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ کا فرمان ہے:

"رمضان میں ذکر اللہ کرنے والے کو بخش دیا جاتا ہے اور اس مہینے میں اللہ تعالیٰ سے مانگنے والا محروم نہیں رہتا۔"

ہزار گنا ثواب

ماہ رمضان المبارک میں نیکیوں کا اجر بہت بڑھ جاتا ہے لہٰذا کوشش کر کے زیادہ سے زیادہ نیکیاں اس ماہ میں جمع کر لینی چاہئیں چنانچہ حضرت سیدنا ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں:

"ماہ رمضان میں ایک دن کا روزہ رکھنا ایک ہزار دن کے روزوں سے افضل ہے اور ماہ رمضان میں ایک مرتبہ تسبیح کرنا یعنی سبحان اللہ کہنا اس ماہ کے علاوہ ایک ہزار مرتبہ تسبیح کرنے یعنی سبحان اللہ کہنے سے افضل ہے اور ماہ رمضان میں ایک رکعت پڑھنا غیر رمضان کی ایک ہزار رکعتوں سے افضل ہے۔"

کا نام نہیں بلکہ روزہ تو لغو (یعنی ہر بے فائدہ کام) اور رفث (یعنی ہر بے ہودہ حرکت) سے بچنے کا نام ہے۔ جو شخص ضبط نفس کی طاقت نہ رکھتا ہو اس کے لئے اپنی بیوی سے بوس و کنار جائز نہیں۔ جان بوجھ کر حالت روزہ میں کھا پی لینے سے اور حالت روزہ میں جماع کرنے سے مرد و زن دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ روزہ داروں کے لئے چیدہ چیدہ جائز امور اور ناجائز امور بیان کر دیئے ہیں انسان خود سمجھدار عاقل و بالغ ہے انشاء اللہ زندگی باقی تو یہ چیزیں یہ باتیں چھپتی رہیں گی۔

اصل مدعا تحریر کرنے کا یہ ہے کہ ہر مسلمان عاقل و بالغ توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج جیسے پانچ ارکان پر عمل پیرا ہونے کی بھرپور کوشش کرے اور اپنے آپ کو برائیوں سے بچا کر مسلمانیت کو اجاگر کرے۔ اس کے ساتھ ایک اہم واقعہ بیان کرتا چلوں۔

روزہ تو ہمارے پاک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیارے نواسے حضرت امام حسینؓ نے چھ ماہ کی عمر میں اپنی والدہ ماجدہ کی گود میں رکھا تھا۔ بزرگوں سے بھی سنتے آئے ہیں ریڈیو پاکستان اور ایف ایم سے بھی ہر سال نعتیہ کلام کی صورت ان کے روزے کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔ (سبحان اللہ) میری والدہ صاحبہ سرائیکی زبان میں نعتیہ کلام کی صورت میں رمضان شریف میں خاص کر رات کے وقت قصہ سنایا کرتی تھیں اور ہم لوگ بے خودی کے عالم میں اکٹھے بیٹھ کر حضور پاکؐ کے نواسے حضرت امام حسینؓ کا اپنی والدہ ماجدہ کی گود میں بھوکے پیاسے دن گزار دینا سنا کرتے تھے۔ نہ ماں کا دودھ پیتے تھے اور نہ ہی پانی یہ بہت بڑا اور اہم واقعہ ہے۔ یہ کلام اور قصہ سن کر ہم سب بچے مستی میں سرشار ہو جاتے تھے اور روزہ رکھنے کے لئے اپنی والدہ صاحبہ کو مجبور کر دیتے تھے۔

باقی شاعری اور کلام تو مجھے یاد نہیں آ رہا ایک شعر جو یاد رہ گیا ہے وہ تحریر کئے دیتا ہوں۔

تڑواواں چھکو سورج دیا جلدی

نہ لاوو دیر ہرگز پل دو پل دی

اس کا مطلب والدہ صاحبہ (مرحومہ) یہ بتایا کرتی تھیں کہ جب معصوم حضرت امام حسینؓ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیارے راج دلارے، آنکھوں کے تارے گرمی، بھوک و پیاس سے نیم بے ہوشی کی حالت میں چلے گئے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی فرشتوں کو حکم جاری ہوا کہ جلدی کرو سورج کی طنابیں کھینچو تاکہ سورج جلدی غروب ہو تاکہ پیارے آقا کالی کملی والے کا پیارا نواسہ روزہ افطار کرے۔ سبحان اللہ۔ اللہ تبارک و تعالیٰ تمام عالم اسلام کو روزہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

ہنسی علاج غم ہے

خاور قیوم

رنگے ہاتھوں

○......بیوی نے شوہر کو فون کیا اور بولی: کیا کر رہے ہو؟

شوہر: آفس میں ہوں اور بہت مصروف ہوں اور تم کیا کر رہی ہو ڈارلنگ۔

بیوی: کے ایف سی میں ہوں اور تمہارے پیچھے بیٹھی ہوں۔

وقت

○......لڑکا شیخ سے: آپ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دیں میں اس کے وزن کے برابر آپ کو سونا دوں گا۔

شیخ: مجھے کچھ وقت دو۔

لڑکا: سوچنے کے لیے۔

شیخ نہیں۔ بیٹی کا وزن بڑھانے کے لیے۔

مذاق

باپ بیٹے سے۔ ''بیٹا آپ نے اس بار 95 فیصد نمبر لینے ہیں۔''

بیٹا۔ ''نہیں ابو! میں اس بار 100 فیصد نمبر لوں گا۔''

باپ۔ ''کیوں مذاق کر رہے ہو نالائق؟''

بیٹا۔ ''ابو! پہل کس نے کی تھی؟''

پشت پر

گاہک۔ ''ایک زنانہ چپل دیجیے۔''

دکاندار: ''کس ناپ کی جناب؟''

گاہک۔ ''ناپ تو مجھے یاد نہیں رہا خیر آپ میری پشت پر دیکھ لیں۔''

دُور دُور سے

شوہر بیوی سے۔ ''ڈارلنگ تم مجھے ایک جگہ سے بہت پیاری لگتی ہو۔''

بیوی شرما کر۔ ''کہاں سے ڈارلنگ؟''

شوہر۔ ''دُور دُور سے۔''

''مسکرا کے''

لڑکا دوست سے۔ ''یار وہ لڑکی مجھے مُسکرا کے دیکھتی ہے۔''

دوست۔ ''بھائی! پہلے کنفرم کر لے مُسکرا کے دیکھتی ہے یا دیکھ کے مُسکراتی ہے۔''

فزکس کی تعریف

استاد شاگرد سے۔ ''فزکس کی تعریف سناؤ۔''

شاگرد۔ ''سر! آدھی آتی ہے سُناؤں؟''

استاد۔ ''ہاں آدھی ہی سُنا دو۔''

شاگرد۔ ''اور اسے فزکس کہتے ہیں۔''

''بہتر''

بیوی: کیوں جی منا رو رہا ہے؟

شوہر: کیا کروں سوتا نہیں۔

بیوی: لوری گا کر سُلا دو۔

شوہر: میں نے لوری بھی گائی تھی لیکن پڑوسیوں نے کہا اس سے اچھا تو بچے کا رونا ہی تھا۔

”خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کردیں“

husain_sayyed2001@yahoo.com

قلندر حسین سیّد سیارہ ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل قلمکار ہیں۔ گذشتہ کئی ماہ سے وہ ایسی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جارہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سیّد نے قارئین سیارہ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیساتھ ساتھ دنیائے ادب کی چنیدہ کتب و جرائد سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کردیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جیسی مٹھاس، لیموں کی کھٹاس، کوڑ تما کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش ہے۔!!

دیکھا، پڑھا اور طاق نسیاں کردیا!

○ انسان کامیاب ہونے کے لئے پیدا کیا گیا ہے مگر اپنی غفلت سے وہ اپنے آپ کو ناکام بنا لیتا ہے!

○ عورت کے پھٹے کپڑوں میں مرد اس کی غربت نہیں جسم دیکھتے ہیں (ایک تلخ حقیقت)

○ جمہوریت کے دعویدار، جمہوریت کی توہین کررہے ہیں۔

○ پاکستان میں غریب ہونا پہلا جرم، عورت ہونا دوسرا جرم اور غریب کی بیٹی ہونا تیسرا جرم ہے۔ یہ دو ریمارکس ہیں جو قائم مقام چیف جسٹس آف پاکستان جواد ایس خواجہ نے پولیس کیخلاف شکایت کے مقدمہ میں دوران سماعت دیئے۔ (بحوالہ روزنامہ خبریں 29 اپریل)

○ جنس ایک بڑی طاقت ور اور بڑی پاکیزہ چیز ہے۔ (اشفاق احمد)

○ جسے اس کے اعمال پیچھے ہٹا دیں اسے حسب ونسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔ (نہج البلاغہ)

○ قرآن سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے مگر سوچے سمجھے بغیر۔

○ ہر چیز کی زکوۃ ہوتی ہے عقل کی زکوۃ یہ ہے

کہ جہلا کی جہالت برداشت کرے۔ (حضرت علیؓ)

○ حقیقت میں جن کوئی مخلوق نہیں۔ قرآن میں جن کا لفظ غیر مہذب کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (سرسید احمد خان)

○ بچپن میں جنات' بھوتوں اور چڑیلوں سے خوف آتا تھا پر جب ہوش سنبھال کر دنیا دیکھی تو اندازہ ہوا کہ انسان زیادہ بھیانک مخلوق ہے۔

○ قانون مکڑی کا وہ جالا ہے جس میں ہمیشہ حشرات یعنی چھوٹے ہی پھنستے ہیں' بڑے جانور اس کو پھاڑ کر نکل جاتے ہیں۔ (ارسطو)

"قدرت اللہ شہاب کیساتھ ایوان صدر میں سولہ سال"

(م ب خالد کی کتاب سے)

1955ء میں غلام محمد کو سبکدوشی پر بمشکل رضامند کرلیا گیا۔ رخصتی کے دن گورنر جنرل ہاؤس کراچی سے لے کر کلفٹن میں ان کی رہائش گاہ "نشیمن" تک سلامی کے لئے فوجی دستہ متعین کردیا گیا کہ ساتھ بیٹھ جائیں اور گھر تک چھوڑ آئیں۔

راستہ بھر غلام محمد سلامی لیتے گئے اور اندرونی اثرات کو چہرے کے خارجی حدود سے دُور رکھا۔ گھر کے دروازے پر ان کی بیٹی اقبال بیگم ان کا شوہر اور دیگر افراد خانہ استقبال کے لئے موجود تھے۔ سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اپنے کمرے میں جاکر غلام محمد ابھی بیٹھے ہی تھے کہ سکندر مرزا' چودھری محمد علی اور ڈاکٹر خان صاحب تشریف لے آئے۔ ان پر نظر پڑتے ہی غلام محمد بے قابو ہو گئے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ روتے روتے کچھ کہنے کی کوشش بھی کی مگر کسی کے کچھ پلے نہ پڑ سکا۔ سکندر مرزا دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ تسلیاں دینے لگے۔ میں اس سے قبل غلام محمد کو دو دفعہ روتا دیکھ چکا تھا۔ ایک بار مسجد نبویؐ میں اور دوسری بار بالاکوٹ میں سید احمد شہیدؒ کے مزار پر مگر آج کا رونا کچھ اور طرح کا رونا تھا۔ اُس رونے میں آواز پر قابو تھا آنسو بے قابو تھے۔ آج کے رونے میں آنسو ناپید مگر آواز بے قابو تھی۔ البتہ سکندر مرزا کی مسکراہٹ اور غلام محمد کا رونا ایک ہی تصویر کے دو رُخ تھے۔ سکندر مرزا غلام محمد کے رو دینے پر مسکرا اُٹھا تو غلام محمد سکندر مرزا کے مسکرانے پر رو دیا۔ ایک اپنے انجام سے باخبر ہوکر رورہا تھا دوسرا بے خبری کے عالم میں مسکرا رہا تھا۔ تاریخ خود کو دہرانے میں کتنی بے رحم ہے۔ خواجہ ناظم الدین کو جس روز وزارت عظمٰی سے "ڈس مس" کیا گیا وہ جمعتہ المبارک کا دن تھا۔ خواجہ صاحب کا پروگرام نماز جمعہ کے بعد حیدرآباد جانے کا تھا غلام محمد کے ملٹری سیکرٹری کرنل حامد نواز نے فون پر بتایا کہ گورنر جنرل صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ خواجہ صاحب نے معذرت پیش کی کہ جمعہ کی نماز کا وقت قریب ہے حیدرآباد سے واپسی پر حاضر ہوں گا ادھر سے اصرار ہوا کہ چند منٹ کے لئے تشریف لے آئیے۔

خواجہ صاحب تشریف لے آئے۔ ٹخنوں کے اوپر تک شرعی پاجامہ' ہلکے براؤن رنگ والی پرشکن شیروانی' ایک ہاتھ میں چھڑی دوسرے میں ٹوپی' غلام محمد بھی جمعہ کے روز شیروانی پہنتے تھے وہ آج کا کام آج ہی کرنے کے عادی تھے۔ چھوٹتے ہی خواجہ صاحب سے استعفٰی طلب کیا۔ خواجہ صاحب نے اسمبلی میں اپنی واضح اکثریت کا حوالہ دیا۔ غلام محمد کا پارا یک لخت چڑھ گیا اور گرج:...... I DIS MISS YOU یہ کہا اور کھڑے ہوگئے۔ خواجہ صاحب پریشانی کے عالم میں کمرے سے باہر نکلے تو اپنی ٹوپی غلام محمد کی میز پر ہی بھول آئے۔ اکھڑے اکھڑے قدموں سے میرے کمرے کے

سامنے سے شارٹ کٹ کرتے ہوئے پورچ میں پہنچے۔ گاڑی سے جھنڈا اُترا ہوا تھا۔ موٹر سائیکل سوار جا چکے تھے خواجہ صاحب کے ڈرائیور نے کار کا دروازہ کھولا۔

اسی گورنر جنرل ہاؤس میں قائداعظمؒ کی وفات کے بعد تین برس شاہانہ ٹھاٹھ سے گزارے تھے۔ اپنے اور سٹاف کی تفریح کی خاطر کتے اور بھیڑیئے‘ کتے اور ریچھ کی لڑائی کروائی۔ مرغوں کے دنگل آراستہ کروائے۔ نیازیں بٹوائیں‘ ضیافتیں اُڑائیں مگر آج اسی گھر سے نکلتے وقت خواجہ صاحب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دایاں قدم اٹھانا ہے یا بایاں۔ تھوڑی دیر بعد غلام محمد بھی کمرے سے باہر تشریف لے آئے۔

قومی دستور ساز اسمبلی کو توڑا امریکہ سے محمد علی بوگرا کو بلایا۔ بلا کر بٹھایا‘ بٹھا کر اٹھایا‘ اٹھا کر نکالا۔ غرض ہنسنے ہنسانے کے بیشمار مواقع پیش آتے رہے تھے مگر ہنسنے ہنسانے کا بھی شاید ایک کوٹہ ہوتا ہے جو ایک نہ ایک دن ختم ہو سکتا ہے اور رونے دھونے کی باری آ سکتی ہے۔ آج غلام محمد کے لئے گورنر جنرل ہاؤس کی وسیع و عریض عمارت کے بجائے چھوٹے سے مکان کا مختصر کمرہ تھا۔ تخت چھن چکا تھا تختے کا انتظار تھا۔

دن گزرتے رہے گھڑیاں بیتتی رہیں 7 اکتوبر 1958ء کا دن آ گیا۔ بعد دوپہر سکندر مرزا کا ذاتی خدمت گار عبدالستار میرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ جلدی میں تھا کہنے لگا، ساب جی، لاٹ ساب نے کہا ہے کہ آپ شام پانچ بجے دفتر آ جایئے ضروری کام ہے۔

شام پانچ بجے میں دفتر میں تھا۔ میرے علاوہ سکندر مرزا کا پرسنل سیکرٹری نصرت بھی تھا۔ تاریکیاں پھیلنے کو تھیں کہ میجر جنرل شیر بہادر کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ جائنٹ چیفس سیکرٹریٹ کے سربراہ تھے۔ ہم دونوں سے ٹائپ مشینیں درست کروائیں بریف کیس میں سے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو کاغذ نکالے ایک مجھے تھمایا دوسرا نصرت کو۔ ٹائپ رائٹر کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ چلنے شروع ہو گئے۔ میرے حصے میں آنے والے کاغذ کا عنوان تھا (Proclamation) دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ پاکستان کا دستور منسوخ‘ قومی اور صوبائی اسمبلیاں برخاست کیبنٹ ڈس مس‘ صوبائی حکومتیں ختم۔

ایک کے بعد دوسرا کاغذ مارشل لاء کا نفاذ‘ جنرل محمد ایوب خاں کا بحیثیت مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور سپریم کمانڈر تقرر‘ صوبوں میں ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹرز کی تقرریاں۔

تیسرا کاغذ غیر ملکی سربراہان مملکت کے نام خصوصی پیغام۔ چوتھے کاغذ میں پاکستانی سفیروں کے نام خصوصی ہدایات۔ ساڑھے نو بجے ہمارے ٹائپ رائٹر خاموش ہو گئے ہم دونوں کو جنرل شیر بہادر اپنی نگرانی میں ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر نوازش علی کے کمرے میں لے گئے جو بالکل دوسرے کونے میں تھا۔ تھوڑی دیر بعد سکندر مرزا بھی وہیں تشریف لے آئے۔ ٹھیک دس بجے ڈبلیو اے برکی اور لیفٹیننٹ جنرل اعظم خاں بھی ساتھ تھے۔ سکندر مرزا کو سلوٹ کے بعد جنرل ایوب خان گویا ہوئے۔ (Every thing ok sir operation is complete) ہاتھ ملائے گئے قہقہے بلند ہوئے۔ سکندر مرزا نے اشارہ کیا چار پانچ خدمت گار ٹرے میں وہسکی سوڈا کے چھلکتے ہوئے گلاس سجائے ایک ساتھ داخل ہوئے کمرے میں آب و نوش نہ کرنے والے صرف میں اور نصرت تھے۔ ہمارے لئے جوس کے گلاس آ گئے۔

سکندر مرزا چسکیاں لیتے لیتے یکدم سنجیدہ ہوگئے۔ ایوب خان کا بازو پکڑا اور کان کے پاس منہ لے جا کر پوچھا...... (Ayub will i be alive tomorrow) ایوب خان نے مسکرا کر سکندر مرزا کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا! زبان سے کچھ نہ کہا۔

گیارہ بجے کھانا آ گیا کھانے کے بعد میں اور نصرت گھر کے لئے کھسکنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ہمارے تیسرے ساتھی جنرل شیر بہادر ہمیں ایک طرف لے گئے رات تقریباً تمام وفاقی سیکرٹریوں کو طلب کیا گیا دو بجے رات غیر ملکی سفیر بلائے گئے۔ وہسکی، کوک، چائے، کافی، سگریٹ، سگار، صلائے عام تھی یاران مکتہ دان کے لئے۔

شروع میں سکندر مرزا خوش باش تھے اور مورال بھی ہائی تھا پھر بتدریج فرق پڑنا شروع ہوگیا۔ سکندر مرزا اور ایوب خان کے بیانات میں تضاد نمایاں ہوتا جارہا تھا۔ بیگم ناہید سکندر مرزا شوہر سے ناخوش نظر آنے لگیں اور مزاج چڑ چڑا ہوگیا۔ شوہر کے ساتھ بات چیت میں لہجہ درشت ہوتا گیا۔ آخر آنے والی گھڑی آ گئی۔ ستائیس اٹھائیس اکتوبر کی درمیانی رات صبح پانچ بجے میں حسب معمول سیر کی غرض سے نکلا تو دُور سے پولیس انسپکٹر بہاول بخش آتے دکھائی دیئے۔ مجھے ہاتھ سے سلام کر کے کچھ اشارہ کیا۔ قریب آئے تو سرگوشی میں کہا "لے گئے" "کسے لے گئے؟" میں نے پوچھا۔

"سکندر مرزا کو" "کہاں؟" "پتہ نہیں" پھر بغیر توقف کے تفصیل بتانے لگے۔ "رات دس بجے مجھے فون پر بلایا گیا۔ میں پہنچا تو میری کرسی پر ایک میجر صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ایوان صدر کی ساری پولیس فورس سے اسلحہ لیا جارہا تھا۔ دو ٹرکوں میں آئے ہوئے فوجی (BATTLE DRESS) میں ملبوس پوزیشن لے رہے تھے۔ حکم کے مطابق میں نے اپنا پستول میجر صاحب کے حوالے کر دیا۔ مجھے اور میرے ماتحت افسروں کو ساتھ والے کمرے میں بٹھا دیا گیا باہر ذرا آہٹ کر باقی پولیس فورس بیٹھتی جاتی۔

کافی رات گئے کچھ گاڑیاں گیٹ سے باہر نکلیں انہی میں سے کسی ایک گاڑی میں سکندر مرزا اور بیگم صاحبہ سوار تھے۔ ہم نے اسی کمرے میں رات گزاری اب اجازت ملی ہے۔"

حدیث اگرچہ ضعیف است راویاں ثقہ اند کے مطابق رات گیارہ بجے جنرل برکی، جنرل اعظم خان اور جنرل کے ایم شیخ اپنے سپریم کمانڈر جنرل ایوب خاں کی ہدایت پر تشریف لائے۔

سکندر مرزا اور بیگم ناہید مرزا اپنے بیڈ روم میں جا چکے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھلوایا اور اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ سکندر مرزا بغیر کسی مزاحمت کے آمادہ ہوگئے مگر بیگم مرزا کے چیخ چیخ کر بولنے کی آوازیں آئیں پھر "چٹاخ" کی آواز۔ جس کے بعد مکمل سکوت۔ ایک بجے تک ضروری سامان تیار کر چکے تھے تینوں جرنیل میاں بیوی کو "تینوں کے سائے" میں ماڑی پور کے ہوائی اڈے پر لے گئے جہاں ایئر فورس کا خصوصی طیارہ منتظر کھڑا تھا۔

بہادر شاہ ظفر کے بعد یہ دوسرے مغل فرمانروا تھے جنہیں دفن کے لئے دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں۔

سکندر مرزا اپنی وصیت کے مطابق اپنے سسرال (تہران) میں دفن ہیں۔

"تجربات و مشاہدات"

کچھ عرصہ قبل ایک اعلیٰ آرمی آفیسر تربیتی دورے پر انگلستان گئے ان کی واپسی براستہ ناروے

ہوئی۔ انہوں نے اپنے دورے کے تجربات و مشاہدات سنائے تو ہم دنگ رہ گئے کہ کس طرح ''اغیار'' نے ہمارے بنیادی وراثتی افکار و اقدار کو اپنا کر اس دنیا کو اپنے لئے جنت نظیر بنالیا۔ علم و عمل کا علم تھام کر وہ شادماں بھی ہوئے اور منزل مراد بھی پالی جبکہ ہم تارک قرآن ہوکر زمانے بھر میں خوار ہوتے پھر رہے ہیں۔ زلف ایاز کے خم اور غزنوی کی تڑپ سے محروم ہو چکے ہیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ آئرن لیڈی کہلانے والی انگلستان کی مارگریٹ تھیچر اپنے مختصر سے وزیراعظم ہاؤس 10 ڈاؤننگ سٹریٹ میں اپنا لنچ خود تیار کرتی تھیں۔ وہاں کے عوام نے ایسی مخلص وزیراعظم کا ہمیشہ کے لئے دم چھلا بننے کے بجائے یا اس کی اولاد کو سر پر بٹھانے کے بجائے ٹونی بلیئر کو وزیراعظم بنایا۔ ادھر ہم ہیں کہ کروڑوں روپے مالیت کے نیکلس اور دیگر زیورات سے لدی پھدی دختر مشرق کو اس کی وفات کے بعد بھی زندہ ہے زندہ ہے کے لایعنی نعرے لگا کر روٹی، کپڑا اور مکان کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ متوفیہ کے نام پر ایک ایسے شخص کو وزیراعظم بنالیتے ہیں جس کا حقیقی بیٹا لیفیڈرین جیسی مہلک نشہ آور دوائی کی خرید و فروخت میں ملوث ہوتا ہے۔ اس نیک دل آفیسر نے یہ بھی بتایا کہ ناروے کی ایک خاتون وزیر سرکاری دورے پر بیلجیئم گئیں۔ اس کی واپسی پر میڈیا میں یہ الزام عائد کیا گیا کہ موصوفہ نے اپنے دورے کے لئے مختص اخراجات کی حد سے تجاوز کیا ہے تب اگلے روز وزیرنی صاحبہ نے اخراجات کا گوشوارہ پیش کیا جس میں اضافی اخراجات کی اس کی ذاتی جیب سے ادائیگی کا ثبوت درج تھا۔

ہمارے ہاں غیر ضروری دورے ہوتے ہیں جن میں درجنوں احباب کو ممنون کیا جاتا ہے اپنے اہل خانہ کو مزے کرائے جاتے ہیں کوئی پوچھنے والا نہیں بس اپنی باری کا انتظار کیا جاتا ہے تاکہ ہمیں بھی کوئی کچھ نہ کہہ سکے۔

(مشتاق احمد فاروقی کے کالم سے اقتباس)

''عام آدمی''

(ممتاز مفتی کی کتاب ''الکھ نگری'' سے)

حج کے دوران دوسری بات جو قدرت اللہ نے مجھے سمجھائی، یہ تھی کہ حرمین شریف میں زائر کو عام انسان کی حیثیت سے رہنا چاہئے۔ بزرگی کا احساس پیدا نہ ہو، عہدے کا احساس نہ ہو، بڑائی کا احساس نہ ہو صرف انسان، عام انسان۔

قدرت اللہ اس پر عملی طور پر پابند تھا۔

جب بھی وہ حج یا عمرہ کے لئے سعودی عرب آتا تو ایک عام زائر کی طرح کیو میں کھڑا ہوکر ویزا حاصل کرتا۔ کیو میں کھڑا ہوکر پی آئی اے کی ٹکٹ بنواتا اور فارن ایکسچینج حاصل کرتا حالانکہ وہ ایسے عہدے پر فائز تھا کہ یہ تمام مرحلے دفتر میں بیٹھے بٹھائے طے ہوسکتے تھے۔

دھکے دکھانے کا مزہ

مدینہ منورہ میں وہ روز صبح تین بجے مجھے جگاتا اور ہم دونوں حجرہ مبارک کے باہر کیو میں کھڑے ہوجاتے جب مسجد نبویؐ کا حجرہ مبارک والا دروازہ کھلتا تو وہ دھکے کھاتا ہوا اندر داخل ہوتا اور حجرہ مبارک میں نفل کی نیت باندھ کر کھڑا ہوجاتا پھر زائرین کا ریلا اندر داخل ہوتا قدرت اللہ کو دھکا لگتا اور وہ یہاں سے وہاں تک لڑھکتا جا پہنچتا پھر سے دھکا لگتا تو وہ فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا ادھر آ پہنچتا۔ حجرہ مبارک میں نوافل پڑھنا بڑے دل گردے کا کام تھا کئی بار وہ دیوار سے جاٹکراتا چوٹ لگتی لیکن اس کی نیت نہ ٹوٹتی۔

مدینہ منورہ قیام کے دوران تین مرتبہ پاکستانی ڈسپنسری کے ڈاکٹر نے قدرت اللہ کو پیغام بھیجا کہ

آج رات کو مسجد نبویؐ خصوصی طور پر فلاں اہلکار کے لئے چند گھنٹوں کے لئے کھلے گی اگر آپ چاہیں تو آپ بھی ان کے ہمراہ مسجد میں جا کر نوافل ادا کرسکتے ہیں۔

قدرت نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور معذرت کردی کہ میری طبیعت خراب ہے اس لئے میں حاضری نہیں دے سکوں گا اس کے باوجود تہجد کے وقت اس نے مجھے آ جگایا بولا چلئے حجرہ مبارک میں جانے کا وقت ہوگیا اور وہ حجرہ مبارک میں حسب معمول دھکے کھاتا رہا۔

اگلی مرتبہ جب خصوصی طور پر مسجد نبویؐ کے کھلنے کی خبر آئی تو عفت (ان کی بیوی کا نام) بگڑ گئی کہنے لگی آپ کو دھکے کھانے میں مزہ آتا ہے، ہمیں آپ جانے سے کیوں روکتے ہیں۔ میں روکتا تو نہیں، اس نے جواب دیا۔ اگر آپ جانا چاہتی ہیں تو بے شک جائیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کو فون کردیتا ہوں وہ خصوصی پاس بھجوادیں گے۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگا آپ بھی عفت کے ساتھ ہوآئیں۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ عفت غصے میں بولی کیوں آپ کو کیا ہے! میں نے کہا کہ انہیں دھکے کھانے میں مزہ آتا ہے۔

”سیّارہ ڈائجسٹ“

حج کی روئیداد لکھنے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔ یہ موضوع اسلام سے تعلق رکھتا تھا اور میں مذہب میں کورا تھا۔ کئی ایک سال گزر گئے پھر ایک دوست قاسم محمود نے جو ان دنوں ”سیارہ ڈائجسٹ“ کے ایڈیٹر تھے مجھے خط لکھا کہ ہمارے لئے کوئی سفر نامہ لکھو۔

میں نے سوچا چلو حج کا سفر نامہ لکھ دیتا ہوں دو تین قسطوں میں ختم کردوں گا، پھر جو لکھنے بیٹھا تو لکھتا ہی چلا گیا۔

پہلی چند ایک قسطوں کے بعد قاسم محمود کا پیغام ملا کہ مضمون ختم کردیں کہ مالکان کو علماء دوستوں نے کہا ہے کہ یہ کیسی خرافات شائع کررہے ہیں آپ۔ پندرہ روز کے بعد قاسم محمود کا پیغام موصول ہوا کہ حج کے مضمون کو ختم نہ کریں اگلی قسط جلد از جلد بھیجیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا تماشا ہے ایک سانس میں کہتے ہو مت لکھو دوسرے میں کہتے ہو لکھو، فوراً لکھو۔

اس نے بتایا کہ پہلے چند علماء نے منع کیا تھا۔ اس کے بعد قارئین کے خطوط موصول ہونے لگے۔ یہ خطوط تعریفی خطوط تھے اس لئے مالکان نے اپنا فیصلہ بدل لیا ہے۔ 1975ء میں یہ سفر نامہ کتابی شکل میں ”لبیک“ کے عنوان سے شائع ہوگیا۔ میں نے چند ایک کتابیں لکھی ہیں ان کتابوں پر ادبی پرچوں اور اخباروں میں رسمی قسم کی تنقید کی گئی تھی۔ لیکن لبیک کی اشاعت پر قارئین کے اتنے خطوط موصول ہوئے کہ میں حیران رہ گیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بیشتر خطوں میں لکھا تھا کہ آپ نے لبیک میں میرے جذبات کی عکاسی کی ہے۔

ادیبوں نے کسی نہ کسی حوالے سے اس کتاب کا مضحکہ اُڑایا۔ مثال کے طور پر ذیل میں ایک کالم پیش کرتا ہوں جس میں ایک جانے پہچانے بڑے افسانہ نگار نے لبیک کی رونمائی پر یہ عنوان لگایا۔

افسانہ نویس نے حج کیا اور سفر نامہ لکھا۔

”ایک مرشد تین درویش“ مفتی صاحب نو سو افسانے لکھ کر حج کو چلے۔ مفتی بھی ایسے ویسے نہیں ممتاز مفتی، کیا کیا افسانہ لکھا ”آپا“ لکھا ”ان کہی“ لکھی ”علی پور کا ایلی“ لکھا پھر حج پر گئے حج کا ثواب قدرت اللہ شہاب کی نذر کردیا۔ اپنے لئے بس حج کا سفر نامہ لکھا۔

یہ سفر نامہ لبیک کے نام سے شائع ہوا۔ انٹر کانٹی

نینٹل میں اس کی افتتاحی تقریب ہوئی۔ اعجاز حسین بٹالوی نے صدارت کی مگر اعجاز حسین بٹالوی نے تو کوئی سفرِ حج نہیں کیا۔ مفتی صاحب نے اس سفر نامہ میں کمال دکھایا ہے کہ روایتی لوگ تو اس خبر ہی سے شہید ہوجاتے ہیں کہ ایک افسانہ نگار نے حج کا سفر نامہ لکھا۔ ادبی مخلوق یہ دیکھ کر داد دیتی ہے کہ ادیب نے حج تو ضرور کیا مگر اپنی لبرل آن پر حرف نہیں آنے دیا۔

''بہاول پور'' کل اور آج

ریاست بہاولپور کو پاکستان سے الحاق کرنے والی اولین اور سب سے بڑی ریاست ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ 3 جون 1947ء کو تقسیم ہند کا منصوبہ پیش ہونے کے فوراً بعد کانگریسی قیادت کی طرف سے ریاست بہاول پور کے وزیراعظم مشتاق احمد گرمانی کی ملی بھگت سے نواب صاحب کو اپنی ریاست کا الحاق ہندوستان سے کرنے کی ہر ممکن ترغیب دی گئی مگر نواب سر صادق محمد خان عباسی (خامس) نے اس کے برعکس 3 اکتوبر 1947ء کو اپنی ریاست کا الحاق بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت وفاق کی ایک اکائی کے طور پر کیا۔ اس طرح اپنے 220 سالہ موروثی اقتدار سے دستبردار ہوکر موجودہ پاکستان کے چاروں صوبوں کے درمیان جغرافیائی اور مواصلاتی رابطہ پیدا کرنے میں معاونت فراہم کی۔ اس موقع پر نواب آف بہاول پور نے پاکستان کو چلانے کے لئے ایک خطیر رقم بھی فراہم کی اور قائداعظمؒ جس گاڑی پر حلف اٹھانے گئے اس کا نمبر BWP72 تھا جو نواب صاحب نے انہیں پیش کی تھی اور انہوں نے جواہر لال نہرو کی بلینک (BLANK) چیک بک دینے کی پیش کش کو عشق پاکستان میں ٹھکرا دیا۔

بانی پاکستان قائداعظمؒ کے ساتھ ہونے والے ایک معاہدے کے تحت ریاست بہاول پور ایک وفاقی اکائی کے طور پر پاکستان کا حصہ بنی جسے 1962ء میں صوبے کی حیثیت دی گئی پھر 1966ء میں ''ون یونٹ'' کے قیام کے وقت دوسرے صوبوں کی طرح اس ریاست کی الگ حیثیت ختم کرکے اسے مغربی پاکستان کا حصہ بنا دیا گیا۔ کیا اس وقت یہاں ایک خودمختار انتظامی یونٹ موجود نہ تھا۔ خودمختار اسمبلی، وزراء کونسل، پبلک سروس کمیشن، ہائی کورٹ اور علیحدہ سیکریٹریٹ نہ تھا۔ 1962ء میں 49 صوبائی نشستوں پر انتخاب کرائے گئے اور صوبائی حکومت قائم ہوئی جبکہ پاکستان میں شامل ہونے والی کسی دوسری ریاست نے نہ تو صوبائی حیثیت لی اور نہ انتخاب کرائے۔ 1954ء کے مجوزہ آئین میں بھی بہاول پور کو صوبائی حیثیت دی گئی تھی اور 50 ارکان سینٹ میں بہاول پور کی 4 نشستیں تھیں 1966ء میں ون یونٹ کے قیام کے وقت ایک معاہدے کے ذریعے بہاول پور کو مغربی پاکستان کا حصہ بنا دیا گیا یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اس وقت بہاول پور واحد صوبہ تھا جس کا بجٹ سرپلس تھا۔ 1970ء میں جب جنرل یحیٰی خان نے ون یونٹ ختم کیا تو 1966ء کے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک مارشل لائی LFO کے تحت تمام معاہدوں کو پس پشت ڈال کر بہاول پور کی صوبائی حیثیت ختم کرکے اسے پنجاب میں ضم کردیا۔ بہاولپور کے غیور عوام نے اس کیخلاف بحالی صوبہ بہاولپور کی تحریک چلائی اس میں کئی جیالے شہید ہوئے اور جیلوں میں گئے۔ ہماری تاریخ کا یہ ایک انتہائی افسوس ناک پہلو ہے کہ بہاولپور اور مشرقی پاکستان دو ایسے صوبے تھے جو وڈیروں اور جاگیرداروں سے پاک تھے ان میں سے ایک کو ملک

سے جدا کردیا گیا اور دوسرے کی صوبائی حیثیت ختم کردی گئی۔ بہاولپور موجودہ پاکستان کا واحد خطہ ہے جہاں انگریزوں کی اور نہ سکھوں کی حکومت رہی۔ آج بھی کپاس، گندم، چاول اور لائیوسٹاک و دیگر تمام اجناس سب سے زیادہ پیدا کرنے کے باوجود یہ پسماندہ ترین علاقہ بن چکا ہے جو قیام پاکستان کے وقت برصغیر کی امیر ترین ریاست تھا اور آج یہاں نصف سے زیادہ لوگ خط غربت سے نیچے کی زندگی گزار رہے ہیں۔ پنجاب کے ایک چوتھائی رقبے پر مشتمل ہونے اور بلوچستان سے دگنی آبادی رکھنے کے باوجود بہاولپور آج بھی ایک ڈویژن ہے جو تین اضلاع بہاولپور، بہاول نگر اور رحیم یار خان پر مشتمل ہے۔

بہاول پور اور چولستان پاکستان کی کمر پر واقع ہیں پاکستان کے شمالی اور جنوبی حصوں کو ملانے والا سارا مواصلاتی سسٹم یعنی ریل اور قومی شاہراہیں یہاں سے گزرتے ہیں یہ علاقہ پاکستان کی (SOFT BELLY) ہے لیکن اس خطے اور مشرقی سرحد کے درمیان ایک صحرا کو قائم رکھ کر ایک لحاظ سے پاکستان کے دفاع سے بھی صرف نظر کیا گیا ہے۔ ریاست کے دور میں 1930ء کی دہائی میں اسے آباد کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا جس پر عمل بھی شروع ہوا لیکن پاکستان بننے کے بعد حالات بدل گئے اور اسے آج تک آباد نہیں ہونے دیا گیا۔ یہ دنیا میں واحد مثال ہے آج 2015ء میں بھی چولستان میں انسان اور جانور ایک ہی تالاب سے پانی پیتے ہیں۔ چولستان کا 64 لاکھ رقبہ جو پاکستان کی فوڈ باسکٹ بن سکتا تھا اسے بنجر رکھا گیا ہے۔

ہم لسانی بنیاد پر سرائیکی صوبہ بنانے کے حق میں نہیں ہماری پہلے بھی ایک الگ شناخت تھی اور اب بھی ہم یہی چاہتے ہیں تاکہ یہاں کے لوگوں کی پسماندگی کو دُور کیا جاسکے۔ بہاولپور کو صوبہ بنانے کے لئے صرف ایک ایگزیکٹو آرڈر جاری کرنے کی ضرورت ہے ملک میں آج کل نئے صوبوں کے نام پر سیاست زوروں پر ہے۔ جنوبی پنجاب کو سرائیکی صوبہ بنانے جبکہ بہاولپور کی صوبے کے طور پر بحالی کے حق میں ہیں ملک میں لسانی اور نسلی بنیادوں پر صوبے نہ بنائے جائیں بلکہ انتظامی امور کو احسن انداز میں چلانے، ترقیاتی عمل کو تیز تر کرنے، محرومیاں دور کرنے کے لئے نئے صوبے بنانے میں کوئی حرج نہیں۔

(قلندر حسین سید کا کالم ''خبریں'' ملتان 15-4-29 سے اقتباس)

''عورت فہمی''

کچھ خواتین کا خیال تھا کہ میں ان کی صنف نازک کے ساتھ بے رحمی سے پیش آیا ہوں اور نازیوں جیسا برتاؤ کیا ہے۔

کسی نے اسے مُردہ مفروضات کا پوسٹ مارٹم قرار دیا کسی کے نزدیک نرگسیت اور کچھ کے تئیں کثیر الجہتی (Multi Diamentionel) معاملات کو محض ایک زاویہ سے دیکھنے کی بھونڈی سعی۔

میں نے سب سے ایک سوال کیا: ''کیا میں نے جھوٹ لکھا ہے!'' سب کا ایک ہی جواب تھا جھوٹ تو نہیں لکھا لیکن یوں کھول کے نہیں لکھنا چاہئے تھا۔ اب کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا۔ مجھے عورت فہمی کا دعویٰ نہیں ...... مجھے خود فہمی سے بھی کچھ تعلق نہیں ......کہ اس سفر کی پہلی منزل پر خود سے محروم ہونا پڑتا ہے جب ''میں'' ہی نہ رہا تو فہم کا سوال کیا۔

ہاں! یہ میں کہتا ہوں کہ قدرے بہتر مشاہدے کے سبب ......اظہار کا سہارا لیا اور ان معاملات و سادہ لفظوں کی صورت میں کاغذ پر بکھیر دیا جو مرد اور عورت کے جسمانی، سماجی، معاشی، فکری اور علامتی

تعلق میں موجود تو ہوتے ہیں مگر دکھتے نہیں......اگر کہیں دکھتے بھی ہیں تو نظرانداز کردیئے جاتے ہیں......یا مستور کیسی منافقت ہے کہ جسم ملبوس ہوں نہ ہوں مگر فکر ملبوس ہونی چاہئے۔

حیران ہوتا ہوں کہ یہ کیسا تضاد ہے کہ چھٹی ساتویں جماعت ہی سے نصاب میں عشقیہ شاعری موجود...... ان اشعار کی تشریح امتحان میں گھر گھر ریڈیو ٹی وی چینلو......جن پر رات دن الاپے جانے والے بول کیسے ہوتے ہیں' دہرانے کی ضرورت نہیں۔شاعری قدیم ہو کہ جدید' شعر صوفی نے لکھے ہوں کہ گنہگار نے......

بظاہر مخاطب تو مرد و زن ہی ہوتے ہیں ہم انہیں گنگناتے بھی ہیں' تہذیب میں شامل بھی کررکھا ہے مگر جب کوئی ان پر عمل کرے......تھو! تھو! ہم نے چولہے پر پانی سے بھرا پریشر ککر رکھ چھوڑا ہے آنچ بھی تیز کردی ہے مگر بھاپ کے باہر آنے کو جواز کی سند دینے سے انکاری ہیں......

ہم معاشرے کی پاکیزگی کے دعویدار کب سے ہوگئے کہ جب ہم نے رسومات کے نام پر نکاح مشکل تر اور زنا کو آسان ترین بنا دیا ہوا ہے۔کس کس چلن کی بات کی جائے......گھر میں بیٹی' بہن ہماری کوتاہیوں کے سبب اپنے لئے جینے کی راہ چننا چاہیں تو غیرت کے نام پر قتل کردی جائیں اور پھر اس بیٹی' بہن کے برہنہ جسم کے ریشے ریشے کو پوسٹ مارٹم کے نام پر نامحرم ادھیڑتے رہیں تو غیرت بھی زندہ اور غیرت مند بھی سربلند' ہم معاشرتی تعفن اور رشتوں کی باہمی عملیہ ، کی غلاظت کے تسلسل کے مجاور ہیں سڑاند ے بھد بھد کرتے ہوئے کچرے کے ڈھ ر پر چادر چڑھائے منافق روایات کی قوالی کررہے ہیں......
چوری شدہ ڈھکنوں والی گٹر لائن بدبو کے بھبکے اُڑا رہی ہے اور ہم کیوڑہ چھڑک کے جارہے ہیں میں نے اپنے مشاہدے کو زندہ رکھا ہے ...... منافقت نہیں کی۔

دنیا کب بنی اور کب ختم ہوگی ...... میں نہیں جانتا' میرا خدا جانتا ہے مگر عورت اور مرد کے درمیان تعلق کے کتنے پہلو' کتنی پرتیں' کتنی جہتیں' کتنے عمل' کتنے ردعمل اور ردعمل کے کتنے ردعمل ہیں......بدقسمتی سے دونوں (عورت اور مرد) نہ پہلے جان پائے اور نہ آئندہ جان پائیں گے کہ ان کا نہ جاننا ہی ان کی بقاء کا جواز ہے۔

(''یہ جو عورت ہے''
حفیظ خاں کی کتاب سے اقتباس)

''کوڑے کی صورت''

سچ جو کوڑے کی صورت پڑے پڑے تعفن پھیلانے لگتا ہے یا پھر سچ جو حرامی بچے کی طرح ممتا سے محروم ہوکر گھروں کے آنگنوں میں دبا دیا جاتا ہے اس سچ کا سامنا کرنے والے سارے اسباب و علل سامنے رکھیں گے اور زندگی کی ان راہوں پر نکل کھڑے ہوں گے جہاں جنس تعفن نہیں چھوڑتی خوشبو بن جاتی ہے اور حیات کے تسلسل کی علامت بن جانے کے سبب محترم بھی ہوجاتی ہے۔

(ایضاً)

''بحث و مباحثہ''

ایتھنز کے لوگ سقراط سے بحث و مباحثہ کے لئے کسی نہ کسی سیانے کو لے کر پہنچ جایا کرتے تھے کہ بحث و مباحثہ ہو اور وہ تماشہ دیکھیں کہ کون جیتتا ہے۔ایک دفعہ یوں ہوا کہ لوگ ایسے کاروباری شخص کو لے کر اس کے پاس پہنچ گئے جو بہت راست باز تھا۔سقراط نے پوچھا ''اے شخص کاربار میں راست بازی کیا ہوتی ہے۔'' اس کا جواب تھا کہ ''لین دین ٹھیک ٹھیک کیا جائے' ادھار اور امانتیں وقت اور وعدہ

پر لوٹا دی جائیں۔'' اب سقراط کی باری تھی کہا ''بھلے آدمی بعض اوقات درست درست ادائیگی راست بازی کے منافی ہو جاتی ہے۔'' لوگوں نے تمسخر سے قہقہہ لگایا پھر جھنجھناہٹ سنائی دی ''بھلا راست بازی بھی کہیں غلط ہو سکتی ہے!''۔سقراط نے کہا ''ہاں! دیکھو تمہیں ایک شخص کو اس سے مانگا ہوا ہتھیار لوٹانا ہے طے شدہ تاریخ آ جاتی ہے تم ہتھیار لے کر اس کے ہاں پہنچ جاتے ہو حالانکہ یہ شخص ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے اگر تم ہتھیار اس کے ہاتھ تھما دو گے تو کیا وہ شخص لوگوں کی گردنیں نہ مارتا پھرے گا۔''

یہ جو جنس ہے ناں' یہ بھی کہیں کہیں ہتھیار کی طرح ہو جاتی ہے۔ خصوصاً وہاں جہاں پہلے ہی معاشرہ عدم توازن کا شکار ہو۔

(ایضاً)

معصوم لال بیگ جراثیم پھیلاتا نہیں' ختم کرتا ہے

جدید تحقیق نے لال بیگ کے ڈراؤنے اور گھناؤنے تصور کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ ایک ریسرچ سے پتا چلا ہے کہ یہ بدنام کیڑا جراثیم پھیلاتا نہیں بلکہ انہیں ختم کرنے کی قدرتی صلاحیت رکھتا ہے اور معصوم لال بیگ کی یہی صلاحیت اب انسانوں کے کام آنے والی ہے۔ لال بیگ زمین پر تیزی سے رینگے یا ہوا میں اُڑے اسے دیکھتے ہی خواتین چیخنے لگتی ہیں اور مرد بے اختیار اسے فنا کے گھاٹ اُتارنے کیلئے جھپٹ پڑتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ گٹروں اور نالیوں سے نکلنے والے لال بیگ کو خطرناک جراثیم اور جان لیوا بیماریاں پھیلانے والا کیڑا سمجھا جاتا ہے لیکن اب لال بیگوں سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ آنیوالے چند سالوں میں یہ کئی بیماریوں کا علاج کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے آپ کو بعض ایسی دوائیں پینی پڑیں جو لال بیگ سے حاصل کئے گئے اینٹی بیکٹیریل مالیکیول سے تیار کی گئی ہوں۔ 20 سال سے برطانیہ اور امریکہ میں تحقیق کرنیوالے ڈاکٹر نوید احمد خان لال بیگوں پر تحقیق کر کے ایک دلچسپ انکشاف سامنے لائے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صاف ماحول میں افزائش پانے والے لال بیگ کے دماغ میں 9 اینٹی بیکٹیریل مالیکیول ملے ہیں جبکہ گندگی میں پائے جانے والے لال بیگ کے دماغ میں ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔

(جنگ نیوز۔کراچی)

''نیرنگ خیال''

حکیم محمد یوسف حسن صاحب کا بیان ہے کہ ایک دن میں نے علامہ اقبالؒ سے گزارش کی نیرنگ خیال کے لئے کوئی نظم دیجئے۔ انہوں نے فرمایا ''نئی چیز کوئی نہیں ہے۔''

میں نے یاد دلایا کہ جب میں پچھلی دفعہ حاضر ہوا تھا تو آپ نے حاضرین کو ایک شعر سنایا تھا

یہ پنڈت یہ بنئے یہ ملا یہ لالے
یہ سب پیٹ ہیں اور ہم ترنوالے

''اس کے بعد کچھ شعر اور ہوئے ہوں گے؟''

کہنے لگے اور کوئی شعر نہیں ہوا وہی ایک ہے پھر تھوڑی دیر بعد فرمایا۔ ''اچھا لکھو'

یہ مکتب یہ سکول یہ پاٹھ شالے
یہ تکئے یہ مندر یہ گرجے شوالے
یہ پنڈت یہ بنئے یہ ملا یہ لالے
یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے
غریبوں کا دنیا میں اللہ ولی ہے
وطن کیا ہے اک نوع سرمایہ داری
بڑے سیٹھ ہیں قوم کے یہ بھکاری
یہ دیکھو چلی آ رہی ہے سواری
نئے جال لائے پرانے شکاری

غریبوں کا دنیا میں اللہ ولی ہے

جب فی البدیہہ یہ اشعار لکھوا چکے تو فرمانے لگے "اگر یہ شعر کام آسکیں تو چھاپ دیجئے مگر مجھے اس کی نقل دیتے جائیں۔

یہ اشعار "نیرنگ خیال" 1928ء میں شائع ہوئے۔

("اوراق گم گشتہ" مرتبہ رحیم بخش شاہین ایم اے کی کتاب سے اقتباس)

"مصرع طرح"

فی البدیہہ مشاعرے میں ایک طرف سے مصرع طرح دیا جاتا دوسری طرف سے موجد شاعر اس پر گرہ لگاتا یوں شعر پورا ہوجاتا۔ یہ دہلی کے مشاعروں میں عام رواج تھا ایک دفعہ مصرع طرح تھا

؎ شب کو نماز میں مری کعبہ کو پیٹھ تھی

مشاعرہ میں بڑے بڑے شعراء موجود تھے کچھ دیر تو وہاں سناٹا کا منظر دیکھنے میں آیا کچھ دیر بعد آخر یہ سکوت ٹوٹا اور ایک صاحب سٹیج پر تشریف لائے اور اس پر گرہ اپنی لگائی ہوئی پیش کی اور یوں شعر کو مکمل کیا تو حاضرین مشاعرہ عش عش کر اُٹھے

؎ میں تھا امام، مرے والد تھے مقتدی
شب کو نماز میں مری کعبہ کو پیٹھ تھی

"بحران"

پاکستانی معاشرہ ایک عرصے سے توقعات کے بحران میں مبتلا ہے اور یوں لگتا ہے کہ جیسے ہمارے معاشرے میں توقعات کا قحط پڑ چکا ہے۔ مریض ڈاکٹر سے' شاگرد استاد سے' عوام حکمرانوں سے' رعایا بیوروکریسی سے' دوست دوستوں سے' گاہک دکاندار سے' مسافر سواری سے' میاں بیوی سے' حتیٰ کہ ماں باپ اپنی اولاد سے توقع اور توقعات کے بحران میں مبتلا ہو چکے ہیں! غالب نے تو آج سے پہلے اس کا اظہار کر دیا تھا

؎ جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب
کیوں؟ کسی کا گلہ کرے کوئی

"کلام اقبال"

حکومت کا کیا رونا کہ وہ اک عارضی شئے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارہ
مگر وہ علم کے موتی' کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

"ایک سوال"

بہاولپور میں 15 ارب روپے کی لاگت سے پانچ سو ایکڑ پر لگنے والے چار لاکھ سولر پینلز کے ثمرات صارفین تک پہنچ سکیں گے یا نہیں؟

چینی شہری کے گردے میں 420 پتھریاں

گردے میں پتھری کا بن جانا عام سا مرض ہے اور دنیا بھر میں لوگ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے آپریشن کراتے ہیں لیکن چین میں تو ایک شخص نے ڈاکٹرز کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کو حیران ہی کر دیا جب ان کے کیے گئے سی ٹی سکین میں یہ بات سامنے آئی کہ اس کے گردے میں ایک دو، دس بیس، یا سو دو سو نہیں بلکہ 420 پتھریاں موجود ہیں۔ چینی میڈیا کے مطابق صوبہ ژی جیانگ کے شہر جین ہا کے رہائشی ڈونگ نامی شخص کو گردوں کا عارضہ لاحق تھا جس کے علاج کی غرض سے جب وہ ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹروں نے ان کے مختلف ٹیسٹ کیے جس کے حیران کن نتائج سامنے آئے۔ سی ٹی سکین کرنے پر پتا چلا کہ ڈونگ کے گردوں میں پتھروں کے ڈھیر پڑے ہیں، ڈاکٹرز نے فوری طور پر ڈونگ کا آپریشن کر کے انہیں اس خطرناک پتھری سے نجات دلائی۔

چیمپینزی بھی الکوحل سے رغبت رکھتے ہیں

سائنسدانوں کو پہلی مرتبہ چیمپینزی یا لنگوروں

کی الکحل سے رغبت کے ثبوت ملے ہیں۔ محققین نے مغربی افریقہ کے ملک گنی میں لنگوروں کے پام کے درختوں پر چڑھنے اور وہاں موجود قدرتی طور پر تیار شدہ پام سیپ یا نشہ آور اتھی نول پینے کے مناظر ریکارڈ کیے ہیں۔ ان لنگوروں میں سے کچھ بہت دیر تک یہ مشروب پیتے رہے اور شراب کی ایک بوتل جتنا مشروب پینے کے بعد واضح طور پر ان پر اسکے اثرات دکھائی دیئے اور وہ جلد ہی مدہوش ہو کر سو گئے۔ محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ الکحل کے لیے رغبت صرف انسان میں ہی نہیں پائی جاتی بلکہ اس کا دائرہ جانوروں تک پھیلا ہوا ہے۔ رائل سوسائٹی اوپن سائنس نامی رسالے میں شائع ہونیوالے نتائج میں کہا گیا ہے کہ رفیا پام نامی درختوں پر قدرتی طور پر تیار ہونے والا نشہ آور مادہ چمپینزیوں کو سب سے پسند آیا۔ یہ تحقیق گنی میں بساؤ کے علاقے میں کی گئی جہاں کی آبادی پام کے درختوں سے یہ نشہ آور مشروب حاصل کرتی ہے۔

"پانچ جمع تین = آٹھ"

وہ دیکھو ایک شخص ہے جس کی آیتیں قل ھواللہ پڑھ رہی ہیں۔ راستے میں اچانک اس کی ملاقات ایسے دو افراد سے ہوتی ہے جو کھانا کھایا ہی چاہتے ہیں۔ ایک کے پاس پانچ اور دوسرے کے پاس تین روٹیاں ہیں وہ بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاتا ہے۔ وقت رخصت الحمدللہ پڑھتا ہے اور جیب سے آٹھ درہم نکال کر ان کی ہتھیلی پر رکھتا ہے۔ دونوں میں درہم کی تقسیم وجہ نزاع بن جاتی ہے۔ پہلا روٹیوں کے تناسب سے اپنے لئے پانچ اور دوسرے کیلئے تین درہم تجویز کرتا ہے جبکہ دوسرا نصف حصے یعنی چار درہم کا طلب گار ہے۔

معاملہ حاکم وقت تک پہنچتا ہے جو دوسرے کو پہلے کی تجویز سے اتفاق کرنے میں اس کی بہتری گردانتے ہیں مگر دوسرا حاکم وقت کے مشورے کو چیلنج کرتا ہے تو وہ حساب و کتاب کے اس جھگڑے کو جمع تفریق کے اصولوں سے بے مثال سادگی اور باکمال ذہانت کے ساتھ اسے سمجھاتے ہیں کہ فی روٹی تین ٹکڑوں کی شرح سے آٹھ روٹیوں کے کل چوبیس ٹکڑے ہوئے اور یوں تینوں میں سے ہر ایک نے بظاہر آٹھ ٹکڑے تناول فرمائے لہٰذا دوسرے کی تین روٹیوں کے نو ٹکڑوں میں سے آٹھ اس نے خود اور صرف ایک اجنبی نے کھایا اسی طرح پہلے کی پانچ روٹیوں کے پندرہ ٹکڑوں میں سے آٹھ اس نے خود اور سات اجنبی نے کھائے اس حساب سے چونکہ اجنبی نے دوسرے کی روٹیوں سے صرف ایک ٹکڑا کھایا اس لئے اصولی طور پر اسے آٹھ درہم میں سے صرف ایک درہم ہی ملنا چاہئے جبکہ پہلے کی روٹیوں میں سے اجنبی نے سات ٹکڑے کھائے اس لئے وہ سات درہم کا حقدار ہے تاہم پہلا چونکہ بہ رضا و خوشی خود تین درہم دینے کو تیار ہے تو دوسرے کو قبول کر لینے چاہئیں اس سے اس کی حق تلفی قطعاً نہیں ہو رہی۔

اس قدر بلیغ، دانشمندانہ اور بصیرت افروز فیصلہ سنانے والی شخصیت کون تھی؟ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ بادشاہ وقت باب مدینۃ العلم حضرت علیؓ تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ہم بھی اس دوسرے شخص کی طرح اپنے گریبانوں میں جھانکے بغیر حساب و کتاب سے قطع نظر محض حقوق کی رٹ تو نہیں الاپ رہے؟ اگر ایسا ہے تو ہم سب کے حقوق و فرائض کی جمع تفریق اس کے پاس ضرور موجود ہے جس کے قبضے میں ہم سب کی جان ہے۔

کفالت یتیم سے......
جنت کا حصول بھی، رفاقت رسول ﷺ بھی

الخدمت فاونڈیشن 4300 بچوں کی اُن کے گھر پر کفالت کررہی ہے
الخدمت کے زیراہتمام تعلیمی اور دیگر بنیادی ضروریات کے ساتھ ساتھ
بچوں کو سیر وتفریح کے مواقع بھی فراہم کیے جاتے ہیں!

یونیسف کی رپورٹ کے مطابق دنیا میں اِس وقت 15 کروڑ 30 لاکھ بچے یتیم ہیں اور اِن بچوں میں 6 کروڑ یتیم بچے صرف ایشیا میں موجود ہیں اور اِن بچوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر یہ یتیم بچے انسانی ہاتھوں کی زنجیر بنائیں تو پوری دنیا کے گرد حصار بن سکتا ہے۔ چند مسلم ممالک عراق، افغانستان، فلسطین اور شام میں بھی گزشتہ چند سالوں سے جاری خانہ جنگی کے باعث یتیم بچوں کی تعداد میں خطرناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان میں بھی یتیم بچوں کے حوالے سے صورتحال مختلف نہیں۔ گزشتہ عشرے میں آنے والی ناگہانی آفات، بدامنی کے خلاف جنگ، صحت عامہ کی سہولیات کی کمی اور روزمرہ حادثات کے باعث جہاں ہزاروں افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، وہیں لاکھوں بچے

بھی اپنے خاندان کے کفیل سے محروم ہو گئے اور معاشرے کے یتیم ٹھہرے۔ اقوام متحدہ کے ادارہ ''یونیسف'' کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں 42 لاکھ بچے یتیم ہیں جن کی عمریں 17 سال سے کم ہیں اور ان میں بڑی تعداد ایسے بچوں کی ہے جنہیں تعلیم و تربیت، صحت اور خوراک کی مناسب سہولیات میسر نہیں۔ بدقسمتی سے روز بروز بگڑتی معاشی صورتحال، کم آمدنی اور سماجی رویوں کے باعث بھی یتامیٰ کے خاندان کے لئے اُس کا بوجھ اُٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ بچے تعلیم و تربیت اور مناسب سہولیات نہ ملنے کے باعث معاشرتی اور سماجی محرومیوں کا شکار ہو جاتے ہیں بلکہ کئی تو بے راہ روی تک کا شکار ہو جاتے ہیں۔ توجہ اور بنیادی سہولیات نہ ملنے کے باعث یہ یتیم بچے معاشرے کے بے رحم تھپیڑوں کی نظر ہو جاتے ہیں۔ جہاں ان کی تعلیم و تربیت ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔

الخدمت فاؤنڈیشن بھی اِسی نازک صورتحال کے پیشِ نظر یتیم بچوں کی کفالت کے حوالے سے ''الخدمت کفالت یتامیٰ پروگرام'' کے تحت کام کر رہی ہے۔ جس کا مقصد یتیم بچوں کا سہارا بن کر انہیں تعلیم و تربیت اور دیگر بنیادی ضروریات کے یکساں مواقع فراہم کرنا ہے تا کہ وہ بااعتماد اور صحت مند شہری کے طور پر ملک و ملت کی ترقی میں اہم حصہ لے سکیں۔ الخدمت آرفن کفالت یتامیٰ پروگرام کے دو حصے ہیں جن میں آغوش الخدمت ہومز کی تعمیر اور گھروں میں یتیم بچوں کی کفالت کا منصوبہ شامل ہے۔ آرفن فیملی سپورٹ پروگرام کے تحت ملک بھر میں 4,300 یتیم بچوں کی کفالت اُن کے گھروں پر کی جا رہی ہے۔

پاکستان میں یتیم بچوں کی تعداد لاکھوں میں ہے اور اتنی بڑی تعداد میں یتیم بچوں کی کفالت کا اہتمام صرف یتیم خانے (Orphan Age) بنانے سے پورا نہیں ہو سکتا۔ اِسی ضرورت کے پیشِ نظر الخدمت فاؤنڈیشن نے ''آرفن فیملی سپورٹ پروگرام'' کے نام سے یتیم بچوں کی کفالت کا ایک منصوبہ پیش کیا ہے جس کے تحت ایسے یتیم بچوں اور بچیوں کی کفالت کا اہتمام اُن کے گھروں میں کیا جا رہا ہے، جو اپنے خاندان کے کفیل کے نہ ہونے کے باعث بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ بچے اپنی والدہ، نانا، چچا یا کسی بھی عزیز رشتہ دار کے گھر رہ رہے ہوں، اگر ان کی عمر 5 سے 15 برس ہے اور وہ سکول جاتے ہیں تو وہ آرفن فیملی سپورٹ پروگرام کا حصہ بن سکتے ہیں۔ الخدمت فاؤنڈیشن نے آرفن کیئر پروگرام کے منصوبے کا آغاز 2012 میں کیا۔ عوام الناس کو اِس اہم مسئلے کی طرف توجہ دلانے اور ان یتیم بچوں کی کفالت کی دعوت دینے کے لئے ملک بھر میں مہم چلائی گئی۔ الحمد اللہ اِس وقت الخدمت فاؤنڈیشن ''آرفن فیملی سپورٹ پروگرام'' کے تحت تمام صوبہ جات بشمول آزاد کشمیر، گلگت وبلتستان اور فاٹا میں 4,300 یتیم بچوں کی کفالت کر رہی ہے۔ اِن 4,300 بچوں کو ملک بھر میں 26 کلسٹر (Clusters) میں سے چنا گیا ہے۔ ہر کلسٹر (Clusters) میں انچارج مقرر کیا گیا ہے جسے ایف۔ ایس۔ او (فیملی سپورٹ آرگنائزر) کا نام دیا گیا ہے۔ یہ فیملی سپورٹ آرگنائزر بچوں، ان کے خاندان اور تعلیمی ادارے کے سربراہ سے مسلسل رابطہ رکھتے ہیں۔ فیملی سپورٹ آرگنائزرز اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ بچے سکول جاتے ہوں۔ بچوں کو گھروں اور سکولوں میں کسی بھی قسم کی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے اور الخدمت کی جانب سے جاری کیے گئے وظائف ان بچوں کی فلاح و

بہبود کے لیے ہی استعمال ہوں۔ بچوں میں سکول بیگ اور سٹیشنری کی تقسیم کے حوالے سے مختلف تقاریب کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ تعلیمی اور دیگر بنیادی ضروریات کے ساتھ ساتھ بچوں کو سیر وتفریح کے مواقع بھی فراہم کیے جاتے ہیں۔ اِس کے علاوہ لیکچرز، دستاویزی فلمیں اور کھیلوں کے مقابلوں کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔ ایک بچے کی کفالت پر 3,000 روپے ماہوار اور، 36,000 روپے سالانہ خرچ آتا ہے جس میں اُس کی تعلیم، خوراک اور صحت کے اخراجات شامل ہیں۔ الخدمت فاؤنڈیشن، فیملی سپورٹ آرگنائزر کے لیے بھی مختلف ٹریننگ ورکشاپس کا انعقاد کر رہی ہے۔ جس میں بچوں سے ہمدردی، دوستانہ ماحول اور ذمہ داری کا احساس اُجاگر کیا جاتا ہے تاکہ وہ اس اہم ذمہ داری کو احسن طریقے سے سرانجام دے سکیں۔

الحمدللہ! الخدمت آغوش سینٹرز اٹک، راولپنڈی، راولاکوٹ، باغ، پشاور اور مانسہرہ میں 500 بچے قیام پذیر ہیں۔

الخدمت کفالت یتامیٰ پروگرام میں جہاں یتیم بچوں کی کفالت ان کے گھروں پر کی جا رہی ہے وہیں یتیم بچوں کے لئے ''آغوش الخدمت'' کے نام سے اداروں کے قیام کے منصوبوں پر کام بھی جاری ہے۔ الخدمت آغوش سینٹرز کے قیام کا مقصد والدین سے محروم بچوں کی پرورش وتربیت کے لئے قیام و طعام، تعلیم وصحت اور ذہنی وجسمانی نشوونما کے لئے سازگار ماحول فراہم کرنا ہے۔ ان سینٹرز میں بچوں

محمد عبدالشکور، صدر الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان

بچے کسی بھی معاشرے کا سرمایہ اور مستقبل ہوتے ہیں اور انہی بچوں نے آگے چل کر ملک کی باگ دوڑ سنبھالنا ہوتی ہے۔ والدین کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ اِن کے بچے کو اچھی خوراک ملے، اِن کی تعلیم و تربیت اچھی سے اچھی ہو اور انہیں وہ تمام بنیادی سہولیات میسر ہوں، جس کی بنیاد پر وہ خوش و خرم اور کامیاب زندگی گزار سکیں۔ ہمارا معاشرہ ایک ایسے خطے میں واقع ہے جہاں خاندان کے افراد اپنی روز مرہ ضروریات کے لئے مرد پر انحصار کرتا ہے جو شوہر یا باپ کی صورت کاروبار یا نوکری کی مدد سے خاندان کے باقی افراد کی کفالت کرتا ہے۔ اللہ نے موت اور زندگی کا اختیار اپنے پاس رکھا ہے۔ موت یہ نہیں دیکھتی کہ کسی کے بچے چھوٹے ہیں یا کسی خاندان کے کفیل کے اس جہان فانی سے رخصت ہو جانے کے بعد کفالت کیسے ہوگی۔ یہ اللہ کا نظام اور کسی معاشرے کا امتحان ہے کہ ان بچوں سے معاشرہ کیا سلوک کرتا ہے۔ اس ضمن میں اس نقطے کو نمایاں کرنا بہت ضروری ہے کہ یتامیٰ کی کفالت کسی ایک فرد یا ادارے کی ذمہ داری نہیں بلکہ معاشرے اور قوم کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ ان کو قومی و ملی سرمایہ خیال کرتا ہے یا کوئی محکوم و محتاج سمجھتا ہے۔ الخدمت فاؤنڈیشن معاشرے میں ایک مثبت رویے کو پروان چڑھا رہی ہے۔ یک نئے اور صحت مند معاشرے کی طرف پہلا قدم۔ معاشرے کے یتیم ...... ہمارے بچے، ہماری ذمہ داری۔

کے لئے رہائش، تعلیم اور صحت سمیت زندگی کی بنیادی سہولیات بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔ اِس ماں جیسی آغوش عمارت میں ان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے تعلیم یافتہ انتظامی عملہ موجود ہے جو بچوں کے لیے نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کے لیے صحت مند ماحول کا اہتمام کرتا ہے۔ آغوش کے قریب ہی بچوں کے لئے سکول کی سہولت بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ آغوش الخدمت میں کمپیوٹر لیب، لائبریری، سپورٹس گراؤنڈ، ان ڈور گیمز اور بچوں کی نفسیاتی نشو نما کے لیے مختلف لیکچرز اور تعلیمی ٹورز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہاں ایک بچہ پر 9,000 روپے ماہانہ اور 1,08,000 روپے سالانہ خرچ آتا ہے۔ الخدمت فاؤنڈیشن نے آغوش میں جس بات کو خاص اہمیت دی وہ یہ ہے کہ بچوں کو یہ احساس نہ ہو کہ یتیم ہونا خدانخواستہ کوئی بُری بات یا عیب ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ بھی یتیم تھے۔ الخدمت فاؤنڈیشن لاہور، حب (بلوچستان)،

"آغوش الخدمت نے مجھے میری زندگی کا مقصد دیا"

(نوید انجم۔ پاکستان ائیرفورس)

میرا نام نوید انجم ہے اور میں پاکستان ائیر فورس کے شعبہ "زندگی بچانے کے ساز و سامان" (Life Saving Equipments) سے سپیشلائیزڈ ہوں۔ میں چھوٹا تھا جب میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ میری والدہ پڑھی لکھی نہیں تھیں، کم وسائل اور میرے بہتر مستقبل کے لئے انہوں نے مجھے آغوش میں بھجوا دیا۔ میں 12 سال کا تھا جب آغوش آیا تھا۔ یہاں کا سٹاف بالکل خاندان کی طرح ہے۔ میں نے یہیں تعلیم حاصل کی اور اب پاکستان ائیر فورس میں خدمات سرانجام دے رہا ہوں۔ آغوش نے ہماری زندگی کو ایک مقصد دیا۔ آج میرے والد زندہ ہوتے تو انہیں بھی مجھے اس مقام پر دیکھ کر خوشی ہوتی۔

بدین، مٹھی (تھرپارکر)، کراچی، لاہور سمیت دیگر شہروں میں بھی آغوش الخدمت کے قیام کا عزم رکھتی ہے۔آج کا یتیم کل کا جوان ہوگا اور یہ حقیقت ہے کہ بچپن میں بچہ جن محرومیوں اور احساس کمتری کا شکار ہوتا ہے اُس کا ازالہ ممکن نہیں ہوتا اور یہ محرومیاں اُس بچے کے مستقبل پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس لئے ہمارا فرض بنتا ہے کہ یتیم بچہ، جو ملک وقوم کا وارث بننے جا رہا ہے، اسے زیادہ سے زیادہ شفقت و محبت سے نوازیں۔ اگر بچپن میں یتیم کو آوارہ چھوڑ دیا گیا اور اس نے غلط تربیت پائی تو یہ اپنے معاشرے کے لئے مفید شہری ثابت ہونے کی بجائے خطرہ بن جائے گا۔

مسلم معاشرے میں یتیم کا مرتبہ اور مقام کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اسلام نے جن اعمال کو بہت واضح طور پر صالح اعمال قرار دیا ہے ان میں تیموں اور مسکینوں کی مدد کو ترجیح دی گئی ہے۔قران پاک میں ارشاد ہے کہ،

’’اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ تیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ کے علم سے چھپی نہ رہ سکے گی۔‘‘ (النساء۔۱۲۷)

نبی مہربان ﷺ خود بھی ایک یتیم تھے اور اسی لئے جہاں آپ ﷺ اوروں کے ساتھ صلہ رحمی، عدل، پاک دامنی، صداقت و درگزر کا پیکر تھے۔ وہاں مسکینوں، بیواؤں اور خصوصاً تیموں کے لیے سب سے بڑھ کر پیکرِ جود وسخا تھے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ،

’’میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح (قریب) ساتھ ہوں گے۔‘‘ (اور آپ ﷺ نے اپنی شہادت اور بیچ والی انگلی سے اشارہ کیا) بخاری شریف۔

ہمیں احساس کرنا اور یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے رشتے داروں میں، اہل محلّہ، علاقے اور شہر میں کوئی بے سہارا یتیم تو نہیں۔ موسم کی شدت برداشت کرتا، کھڑکی سے سکول جاتے بچوں کو تکتا، کسی ورکشاپ پر کام کرتا یا کسی چوراہے پر پھول بیچتا کوئی ایسا معصوم جس تک الخدمت کفالتِ یتامیٰ پروگرام کا پیغام نہ پہنچا ہو۔ مسلم معاشرے کے لئے ہر یتیم بچہ رنگ، نسل اور مذہب کی تمیز کے بغیر اپنے ہی بچوں کی طرح عزیز ہے۔ انسان تو نیت اور ارادہ کر کے ہی اللہ کی خوشنودی کا حقدار بن جاتا ہے جبکہ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اللہ کی مرضی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ اس لیے کارِ خیر میں خلوص نیت اور عزمِ مصمم سے شریک ہو کر دنیا و آخرت کی فلاح اور نجات کا سامان کیوں نہ اکٹھا کیا جائے۔ الخدمت فاؤنڈیشن معاشرے میں ایک مثبت رویے کو پروان چڑھا رہی ہے۔ اپنی مدد آپ کے تحت۔ آیئے آپ بھی صرف 3,000 روپے ماہانہ اور 36,000 سالانہ کے زرِ تعاون سے کسی یتیم کے خوابوں کی تعبیر کیجئے اور مسکراہٹ کا باعث بنیں۔

سیپ

جاوید راہی

ماں بیٹے کی محبت کے جال میں، میں مکمل پھنس چکی تھی۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں اُڑ کر ان کے گھر پہنچ جاتی۔ میری ملازمت سے قبل ہی دس ہزار روپے ایڈوانس لے رکھا تھا جو ابھی تک میرے ذمہ چل رہا تھا۔ مگر میرا دل گلزار اور آنٹی کے خیالوں میں کھویا رہتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ مجھے میری سخت اور مشقت والی زندگی سے نجات دلا دیں گے۔

ایک بدنصیب دوشیزہ کی کہانی جو حسین زندگی کا خواب لیکر گھر سے نکلی تھی

جس طرح آنے والا ہر موسم جانے والے دنوں سے مناسبت نہیں رکھتا اسی طرح مٹی کی کئی شکلیں مثلاً سوکھی مٹی، گیلی مٹی، سوندھی مٹی...... اور پھر یہ مٹی جب بارش میں نہا کر کیچڑ کی مثال بنتی ہے تو اُس میں سے اُٹھنے والی بُو کئی شکلوں میں سامنے آتی ہے۔ آخر کار اس مٹی کی بُو انسانی ذہن کو متاثر کیے بنا نہیں رہ پاتی۔ جس طرح عارفانہ مسکراہٹ کے آثار دیکھنے والی آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں۔ اس طرح کئی سفاک اور مکار چہروں کی عیارانہ مسکراہٹ کسی بھی احساس سے عاری دکھائی دیتی ہے۔

رابعہ کی عمر بمشکل گیارہ بارہ سال رہی ہوگی۔ معصوم سا مسکراتا چہرہ، روشن آنکھیں۔ گاؤں سے شہر اپنے والدین کی غربت میں ڈوبی زندگی کا سہارا بننے آئی تھی مگر حالات نے اس کے ہنستے مسکراتے چہرے کے تمام رنگ

پریت نگری سے پھیری والا

پریت نگر سے پھیری والا میری گلی میں آیا
چوڑی، لونگ، انگوٹھی، چھلے رنگ برنگے لایا
میں نے پوچھا اور بھی کچھ ہے بولا میٹھا سپنا
جس کو لیکر جیون بھر اک نام کی مالا جپنا
میں نے کہا کیا مول ہے اس کا، بولا اک مسکان
تن میں آگ لگو اس سے دکھوں کی آن
سستا سودا دیکھ کے آخر میں پگلی مسکائی
جیون بھر کا روگ سمیٹ کے من میں کیسی اٹھلائی
رہے گا لال گلاب سا سپنا کب تک میرے سنگ
کب تک اس میں باس رہے گی، کب تک اس میں رنگ
اس کے تار بکھر جائیں گے، کب میرا دل مانے
دل پہ رہے گا کب تک جادو، پھیری والا جانے

(سجاد باقر رضوی)

رنگے ہاتھوں

○.... بیوی نے شوہر کو فون کیا اور بولی: کیا کر رہے ہو؟
شوہر: آفس میں ہوں اور بہت مصروف ہوں اور تم کیا کر رہی ہو ڈارلنگ۔
بیوی: کے ایف سی میں ہوں اور تمہارے پیچھے بیٹھی ہوں۔

وقت

○.....لڑکا شیخ سے: آپ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دیں میں اس کے وزن کے برابر آپ کو سونا دوں گا۔
شیخ: مجھے کچھ وقت دو۔
لڑکا: سوچنے کے لیے۔
شیخ نہیں۔ بیٹی کا وزن بڑھانے کے لیے۔

(محمد نذیر، آزاد کشمیر)

نوچ کر اُس کے چہرے پر بسنت رُت کی پیلاہٹ بھر دی۔ اس کی روشن آنکھوں کے قمقمے بجھا کر ان کی جگہ گہری تاریکی بھر دی۔

رابی...... رائے رضا حسین کھرل کے گھر رہنے کے لیے آئی تھی۔ گاؤں کی کھلی فضا میں سانس لینے والی شرمیلی سی لڑکی آہستہ آہستہ شہری زندگی سے مانوس ہوتی گئی۔ محلہ کی ان دکانوں پر جہاں سے وہ گھر کے لیے چھوٹی موٹی چیزیں خریدتی وہ سب لوگ اُس کی ملنسار عادت کی بنا پر اُس بچی سے شفقت کرتے۔ تھے۔

ایک روز رابعہ صبح سویرے گھر سے نکلی لیکن شام ڈھلے تک واپس نہ پلٹی۔ رات گئے تک تلاش بسیار کے بعد رائے رضا نے اس بارے میں باقاعدہ رپورٹ درج کروادی۔ انھوں نے بیان میں بتایا کہ ان کی ملازمہ جو اُن کے گھر میں ہی رہتی تھی، صبح گھر سے نکلی مگر واپس نہ آئی۔ چند چشم دید لوگوں کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ رابعہ کو انہوں نے ایک ریسٹورنٹ کے دوسری جانب ریلوے لائن کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ بعدازاں کچھ افراد نے اسے ایک عورت تسنیم سکنہ ریشم پورہ کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی نامعلوم شخص بھی موجود تھا۔ بتانے والوں نے بتایا کہ وہ عورت اچھے کردار کی مالک نہیں تھی۔ کیونکہ وہ شہر کی بدنام عورتوں میں شمار ہوتی تھی۔

انسپکٹر عزیز احمد چیمہ نے اُس بدنصیب رابی کو تلاش کرنے کا بیڑہ اُٹھاتے ایک ٹیم تیار کی اور تسنیم زوجہ اسلم کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ اس کو حراست میں لے کر مختلف اڈوں پر چھاپے مارے گئے اور بالآخر تمام ملزمان کو قابو کر لیا گیا۔

کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی بلکہ یہیں سے اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔ اس کہانی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا معاشرہ کس سمت میں جا رہا ہے۔ جہاں معصوم بچے خصوصاً چھوٹی بچیاں کس قدر غیر محفوظ ہیں۔ یہاں

درندے ہر وقت تاک میں بیٹھے ہیں کہ کب کوئی ''شکار'' نظر آئے اور یہ اسے دبوچ لیں۔ یہ ظلم ہمارے چاروں طرف روز ہورہا ہے اور ہم سب بے حس ہوکر یہ ظلم برداشت کررہے ہیں۔

ملزمان کی گرفتاری کے بعد ان سے تفتیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ رابی کو اغوا کرنے کے بعد ریشم پورہ، حسین کالونی میں رکھا گیا تھا جہاں اس معصوم اور کم سن بچی پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹتے رہے۔ دوران تفتیش اغوا کاروں کی زبانی معلوم ہوا کہ رابعہ تسنیم کی بیٹی عائشہ عرف عاشی جو ملتان میں اپنے خاوند کی سرپرستی میں قحبہ خانہ چلاتی تھی رابعہ اُس کے پاس حبس بے جا میں ہے۔ پولیس پارٹی تعاقب کرتی ملتان پہنچ گئی۔ عاشی کو اطلاع ہوگئی اُس نے رابعہ کو اپنے اڈے سے نکال کر اپنے خاوند کی تحویل میں دے دیا۔ جو کئی گھنٹے تک اُسے موٹر سائیکل پر لیے ملتان کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ پولیس پارٹی اور رائے رضا حسین مایوسی کے عالم میں ایک جگہ کھڑے تھے کہ اچانک رائے کی نظر رابعہ پر پڑی جو عاشی کے خاوند کی موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھی قریب سے گزر رہی تھی۔ انہوں نے انسپکٹر چیمہ کو خبردار کیا موٹر سائیکل کا پیچھا کرتے پولیس پارٹی نے اُسے موقع پر ہی پکڑ لیا اور رابعہ کو اُس کے قبضہ سے چھڑا لیا گیا۔ رابعہ کی نگاہ رائے صاحب پر پڑی تو وہ تڑپ کر ان سے لپٹ گئی۔ اُجڑا بکھرا روپ معصومیت سے عاری چہرہ لرزتی کانپتی وہ دھان پان سی بچی سہمے ہوئے انداز میں پولیس اور رائے رضا کے سائبان کی چھت کے نیچے یوں بیٹھی تھی جیسے وہ صدیوں کا سفر کرتے کرتے کسی گھنے سایہ دار درخت کی چھاؤں میں آن بیٹھی ہو۔

انسپکٹر عزیز احمد چیمہ نے عاشی سمیت اس کے ساتھیوں کو ملتان سے گرفتار کیا اور واپس اپنے تھانہ اے ڈویژن آگئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے اغوا کاروں کے خلاف مقدمہ درج کرکے رابعہ کو ورثاء کے حوالے کردیا جبکہ ملزمان جیل روانہ کردیے گئے۔

....

ملزمان کی گرفتاری کے چند روز بعد میں نے رابعہ سے دوبارہ ملاقات کی اور اس واقعات کی تفصیلات معلوم کیں۔ اب وہ گھر والوں کے پیار اور اپنائیت سے کچھ حد تک سنبھل گئی تھی۔ مگر اس کے چہرے اور آنکھوں کی وحشت سے لگتا تھا کہ اس کی روح پر جو زخم لگے ہیں وہ کبھی مندمل نہ ہوسکیں گے۔ رابعہ نے خوف سے لرزتے ہوئے کہنا شروع کیا:

''میں اکثر گھر کا سودا سلف بھائی پنوں کی دوکان سے خریدتی تھی۔ ایک تو اس کی چیزیں صحیح اور ریٹ مناسب ہوتا تھا۔ میں دو ایک گھر کی ضروری چیزیں چینی پتی اور پیسٹ لینے گئی تو پنوں بھائی دوکان کے اندر پچھلے حصہ سے کوئی سامان لینے گئے ہوئے تھے اور دوکان کی حد بندی سے باہر ایک عورت اور لڑکا موجود تھے، شاید ان کا ہی سامان لینے وہ اندر گئے ہوئے تھے۔

میرے پوچھنے پر اس عورت نے مجھے بتایا کہ بھائی پنوں دکان کے اندر ہیں۔اسی دوران اس نے میرے پہنے سوٹ کی تعریف کرتے پوچھا کہ کتنے کا لیا تھا۔ جواب میں میں نے بتایا کہ یہ سوٹ میری مالکن کا تھا جو انہوں نے مجھے دے دیا۔ میں نے اپنے سائز کا کروا لیا۔ میں نے اُس عورت کو حقیقت بتائی۔ اس عورت نے لڑکے کے ہاتھ میں پکڑا شاپنگ بیگ لیا اس میں سے مٹھی بھر خوبانیاں نکالتے میرے ہاتھ میں رکھ دیں۔ میں نے بہت انکار کیا مگر اس کی شفقت کے آگے بے بس ہوگئی''۔

یہ تھی پنوں کی دوکان پر رابعہ کی اس آنٹی سے پہلی ملاقات۔اس تھوڑی سی بات چیت میں اس عورت نے رابعہ کا نام اور پتہ معلوم کرلیا تھا اور ساتھ ہی اسے خود سے مانوس بھی کرلیا تھا۔ اُس نے رابعہ سے موبائل نمبر بھی پوچھ کر لکھ لیا اور کہا کہ اُسے بھی اپنے گھر کا کام کرنے والی ملازمہ کی ضرورت تھی اور اس نے کہا کہ اگر تمہیں دوسری جگہ ملازمت

کی ضرورت پڑے یا کسی اور لڑکی کو ملازمت کرنی ہو تو مجھے کال کر لینا۔ گویا اس عورت نے معصوم رابعہ کو پھانسنے کے لیے جال پھینک دیا تھا۔ بہرحال رابعہ مزید بتانے لگی:

''بات کئی دن پرانی ہوگئی۔ ایک دن میں نے باجی کے فون سے اُس نمبر پر کال کی تو اٹھانے والی خود ہی آنٹی تھی۔ خیر خیریت کے بعد اُس نے مجھے پھر یاد دلایا اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اگر تم خود آنا چاہو تو میں ان سے ایک ہزار زیادہ تنخواہ دوں گی۔'' ''نہیں آنٹی میں یہاں ٹھیک ہوں ہاں اگر کوئی کام چھوڑنے کی نوبت آئی تو میں اپنی والدہ کو آپ کا نمبر دے دُوں گی اور وہ آپ سے مل کر بات کر لے گی اور آپ کا گھر وغیرہ بھی دیکھ لے گی''۔ پھر سلسلہ کٹ گیا مگر میں کبھی کبھار جب باجی سو رہی ہوتی تو چپکے سے اُن کے موبائل سے آنٹی کو فون کر لیتی تھی۔ ایک دن میں نے فون کیا تو فون اُٹھانے والا اس کا وہی بیٹا گلزار تھا جس سے میری ملاقات آنٹی کے ساتھ چنوں کی دوکان پر ہو چکی تھی۔ پتہ نہیں اس کی باتوں میں کیا جادو تھا کہ میں اُس سے کافی دیر بات کرتی ور وعدہ کر لیا کہ جب بھی موقع ملے گا میں کال کر روں گی۔ پھر ہماری چوری چھپے باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ باجی دوپہر کو سو جاتی تھی بس مجھے اُن کو دبانا ہوتا تھا موبائل سائیڈ ٹیبل پر پڑا ہوتا تھا جو میں چپکے سے اٹھا کر برآمدے میں آجاتی اور میں بیل دیتی آنٹی اگر اُٹھا لیتی تو میری آواز سنتے ہی گلزار کو آواز دے کر فون اس کو پکڑا دیتی۔ ماں بیٹے کی محبت کے جال میں میں مکمل پھنس چکی تھی۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں اُڑ کر ان کے گھر پہنچ جاتی۔ میرے گھر والوں نے میری ملازمت سے قبل ہی دس ہزار روپے ایڈوانس لے رکھا تھا جو ابھی تک میرے ذمہ چل رہا تھا۔ مگر میرا دل گلزار اور آنٹی کے خیالوں میں کھویا رہتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ مجھے میری سخت اور مشقت والی زندگی سے نجات دلا دیں گے۔ آنٹی کئی بار مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دے چکی تھی، میں نے وعدہ بھی کر رکھا تھا کہ جس روز میں چھٹی کروں گی اُس روز آپ کا گھر دیکھ کر جاؤں گی۔

باجی اور بھائی جان گاؤں جانے کے لیے تیاری کر رہے تھے۔ مجھے انہوں نے اپنے گھر جانے کا صبح ہی کہہ دیا تھا۔ مگر میں اپنے گھر جانے کے بجائے آنٹی اور گلزار کے گھر جانے کا ارادہ کر چکی تھی۔ میں انکی رہائش گاہ سے نکل کر باہر سڑک پر آگئی۔ پی سی او سڑک کراس کر کے مارکیٹ میں تھا۔ جہاں آ کر میں نے آنٹی کو فون کیا اور بتایا کہ میں مارکیٹ میں پی سی او کے قریب کھڑی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ تم رکو ہم آتے ہیں۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ گلزار اور آنٹی جلد ہی سڑک کے دوسری جانب موجود تھے۔ میں بغیر سوچے سمجھے سڑک عبور کرتی ان کے پاس پہنچ گئی اور پھر ان کے ساتھ چل دی۔ وہ کئی گلیوں کو پیچھے چھوڑتے حسین کالونی کے ایک بڑے سے کوٹھی نما گھر کے کھلے گیٹ کے اندر لے گئے۔ آنٹی مجھے اندر ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ اتنے میں دو اور بھی لڑکیاں ڈرائنگ روم میں آگئیں جن سے آنٹی نے اپنی بیٹیاں سلمیٰ اور نصرت کہہ کر میرا تعارف کروایا۔ گلزار بھی موٹر سائیکل کھڑی کر کے اندر ہی آگیا۔

''بیٹی آپ گھر والوں کو بتا کر آئی ہو نا؟'' آنٹی نے مجھ سے دریافت کیا۔ جواب میں میرے انکار پر وہ جیسے مطمئن ہوگئی۔ پھر ادھر اُدھر کی باتوں کے دوران نصرت شربت بنا لائی۔ میرے سمیت سب نے اپنے اپنے گلاس پکڑ لیے۔ شربت پینے کے دوران آنٹی مجھ سے چکنی چپڑی باتیں کر کے اپنا پیار مجھ پر نثار کرتی رہی۔ پھر وہ مجھے گھر کے کمرے دکھانے کے لیے مختلف کمروں سے لے جاتی ہوئی اوپر والی منزل دیکھنے کے لیے سیڑھیوں کی طرف لے آئی۔ اوپر چڑھتے مجھے یوں لگا جیسے میرا سر چکرا رہا ہو۔ بڑی مشکل سے میں ان کے ساتھ اوپر والے حصے میں آئی۔ اوپر بھی کئی کمرے تھے آخری کمرے میں بیڈ پر ایک آدمی بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میرا سر تو چکرا ہی رہا تھا مگر آنکھیں بھی بھاری بھاری لگ رہی تھیں۔ وہ دونوں لڑکیاں اور گلزار کمرے سے باہر نکل گئے۔ مجھے آنٹی نے صوفہ پر اپنے

ساتھ بیٹھاتے پوچھا،''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''پتہ نہیں آنٹی کیا بات ہے میرا سر گھوم رہا ہے''۔

میں نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھولتے جواب دیا۔''لاؤ میں تمہارا سر دبا دُوں'' کہتے آنٹی نے میرا سر اپنی گود میں رکھتے میرا سر دبانا شروع کر دیا۔ سر دبانے کے دوران آنٹی کی آواز جیسے مجھے بہت دُور سے سنائی دے رہی تھی۔ پھر میں نیند میں ڈوبتی چلی گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو مجھے پتہ چلا کہ میں اپنا سب کچھ لُٹا بیٹھی تھی۔ اُس کمرے کا دروازہ باہر سے لاک تھا میں نے بہت شور مچایا مگر میری آواز کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس اُسی کمرے میں دفن ہو جاتی۔ باہر دن کی روشنی میں مجھے معلوم ہوا کہ میں تمام رات اُس کمرے میں بے ہوش پڑی رہی تھی۔ میں چیخ چلا کر بے سدھ ہوگئی تو آنٹی نے باہر سے دروازہ کھولا اور اندر آتے ہی میرے منہ پر تھپڑوں کی بارش شروع کر دی اور حکم دیا ''اگر تمہاری آواز نکلی تو اِدھر ہی گلہ دبا کر ختم کر دوں گی ارر تمہاری لاش کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔ تمہیں تو پتہ ہے نا کہ تمہارے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ تم میرے گھر پر ہو۔ بس چپ چاپ میری بات مانتی رہو تو سُکھی رہو گی''۔

میں سہم کر صوفہ پر بیٹھ گئی۔ اپنے قتل کا سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ پھر آنٹی بولی:''رونا دھونا بند کرو اور یہ لو سوٹ اور تیار ہو کر ناشتہ کر لو''۔ اس نے ایک سوٹ دیا۔ شاید وہ دونوں لڑکیوں میں سے کسی ایک کا تھا۔ آنٹی نے میرے پاس صوفہ پر سوٹ رکھ کر دروازہ پھر سے بند کر دیا۔ میں کافی دیر تک اپنے نصیب کو روتی رہی پھر اُٹھ کر میں کمرے کے اندر واش روم میں گئی۔ میرا سارا جسم مارے درد اور تھکاوٹ کے چور چور ہوا دُکھ رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد جب میں سنبھلی تو اس کا لایا سوٹ پہن کر کمرے میں آ گئی۔ میز پر ناشتہ پڑا تھا جو شاید میرے نہاتے ہوئے کوئی کمرے میں رکھ گیا تھا۔ تھوڑا بہت زہر مار کیا اور اپنے گھر والوں کی یاد میں آنسو بہانے لگی۔ یہ سوچ کر کلیجہ منہ کو آ رہا تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہونگے۔ کہ میں کہاں منہ کالا کرنے چلی گئی ہوں۔ اُنہیں کیا معلوم کہ میری بیوقوفی نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ چائے پیتے ہی میرا سر پھر بھاری ہونے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے پھر سے بے ہوشی کی دوا دے دی گئی ہے۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو کسی نئی جگہ پایا۔ سب سے پہلے نظر آنے والی عورت شکل سے ہی کوئی بدکردار دکھائی پڑتی تھی۔ میرے ہوش میں آتے ہی وہ بولی:

''آج سے تمہارا نام روشی ہے اور میں نے تمہیں تین لاکھ میں خریدا ہے''۔ کان کھول کر سن لو یہاں آنے والے کسی بھی مرد سے کوئی بات کی یا اپنے بارے میں بتایا تو وہ تیرا آخری لمحہ ہوگا''۔

میں ایسے اڈے پر پہنچ گئی تھی جہاں میرے سمیت کئی اور بھی لڑکیاں موجود تھیں۔ کئی کمروں میں ہوس کا بدمست کاروبار جاری تھا۔ مجھے بھی اُس گھناؤنے اور مکروہ دھندے میں دھکیل دیا گیا۔ اس گھناؤنے اور گندے کاروبار میں مجھے کچھ بھی یاد نہ رہا۔ میرے بازو پر انجکشن در انجکشن لگتے رہے۔ مجھے یہاں آئے کتنے دن ہو گئے مجھ اس بات کا ہوش بھی نہ رہا۔ پھر ایک روز جیسے میرے نصیب کو مجھ پر ترس آ گیا اور میں پولیس کی گاڑی میں اپنے لوگوں کے ساتھ اپنے شہر اور اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں آزاد ہو گئی تھی''۔

یہ سب بتاتے ہوئے اس کی آواز آنسو میں دب گئی۔ اور میں یہ سوچتے ہوئے وہاں سے اُٹھ آیا کہ ہم سب بھی رابعہ جیسی لڑکیوں کے مجرم ہیں جو معاشرے کو اُن بھیڑیوں سے آزاد کرانے کے لیے کچھ نہیں کرتے جو معصوم لڑکیوں کو جُرم اور گناہ کی ذلت آمیز زندگی کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

طعام المسکین

افتخار حسین عفی

مساکین کو بھلا دینے اور اُن کو دھتکارنے والوں کے بارے میں آیاتِ قرآنی اور احادیث مبارکہ میں بیان کردہ وعید و تنبیہات!

آج کے اس پُرآشوب دور میں ہم اپنی ذات میں اتنے کھو چکے ہیں کہ ہمیں دوسروں کی پرواہ نہیں۔ ہم دونوں ہاتھوں سے مال سمیٹنا چاہتے ہیں۔ ہر لمحہ یہی فکر دامن گیر ہے کہ بس ہمیں ہر چیز زیادہ ملنی چاہئے۔ سرکاری ملازم ہیں تو تنخواہ سب سے زیادہ ملنی چاہئے' دکاندار ہیں تو سب سے زیادہ گاہکی ہماری ہونی چاہئے' اقتدار میں ہیں تو زیادہ سے زیادہ عہدوں کی خواہش ہے' افسر ہیں تو زیادہ وی آئی پی سلوک کی تمنا ہے' الغرض ہر شے زیادہ سے زیادہ ہونی چاہئے۔ قرآن حکیم نے ہماری اس چاہت کے بارے میں کیا خوب ارشاد فرمایا ہے۔

''زیادہ کی چاہ نے تمہیں غافل بنا دیا
یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچے''

(التکاثر۔2۔1)

دوستو! ہماری خوض غرضی کا یہ عالم ہے کہ اپنے اردگرد غریبوں اور مسکینوں کو یکسر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ مساکین کو کھانا کھلانا کتنا بڑا ثواب ہے۔ اس کا اندازہ ان آیات کریمہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ ''وہ جو نذریں پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی برائی ہر طرف پھیلی ہوگی۔ اور اپنی خواہش کے باوجود مسکین' یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں وہ ان سے کہتے ہیں ہم تمہیں صرف اللہ (کی رضا) کے لئے کھلا رہے ہیں ہم تم سے نہ تو کوئی معاوضہ چاہتے ہیں اور نہ شکرگزاری۔''

(الدھر 9-7)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی اکرمؐ سے دریافت کیا کہ اسلام کے اعمال میں کون سا عمل بہترین ہے اور افضل ہے آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ ''سب سے بہترین اعمال یہ ہیں کہ آپ غرباء و مساکین کو کھانا کھلائیں اور ہر شخص کو خواہ ستا سا ہو یا اجنبی سلام کریں۔''

(الحدیث)

اس کے برعکس وہ لوگ جو یتیموں اور مساکین سے بے اعتنائی برتتے ہیں' کھانا کھلانا تو دور کی بات انہیں دھکے دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ان کو اللہ نے روز جزا کو جھٹلانے والوں میں شامل کردیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ''کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔''

(الماعون۔3-1)

اس کا مطلب ہے جو قیامت پر یقین نہیں رکھتا وہ دنیا میں معاشرے کے لئے تعمیری کردار کا مالک نہیں بن سکتا۔ جو لوگ استطاعت کے باوجود مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے انہیں رب کائنات کی یہ وعید یاد رکھنی چاہئے' جہنمی آپس میں جب گفتگو کریں گے۔ ''کس چیز نے تمہیں جہنم میں پہنچایا' وہ کہیں گے ہم نماز گزاروں میں سے نہ تھے اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔'' (المدثر 44-42)

اللہ تعالیٰ ہمیں پورے کا پورا اسلام میں داخل ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

”اللہ کا وعدہ“

• نوشابہ اختر

اس نے بھرپور نفرت آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر اس سب لڑکیوں کی طرف جو ڈر اور خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں اور دفتر سے دو قدم باہر نکالے۔ فروزاں جو عین اس کے راستے میں تھی اس کو دبوچا اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر اس کو ایڑھی لگا چکا تھا۔
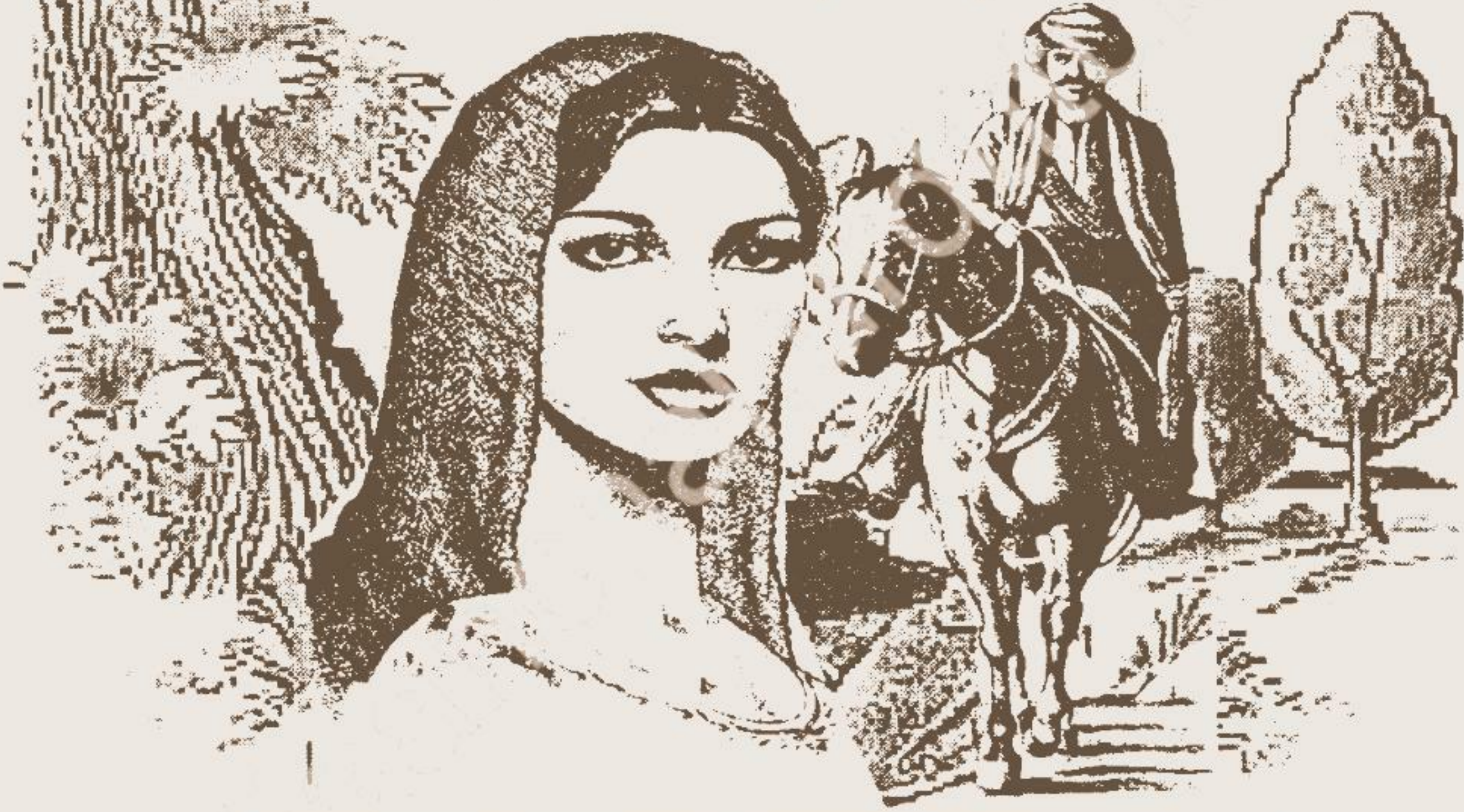
ایک عورت کی کہانی جو عظمت و ہمت کا جیتا جاگتا پیکر تھی

فراست مومنانہ حضرت عثمان غنیؓ کی ذات میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور یہ نتیجہ تھا پیغمبر علم و آگہی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی صحبت و تربیت کا، حکمت قرآن پر گہرے غور و فکر، پھر خلوص اور حسن نیت کا کہ آپؓ کی زبان فیض ترجمان سے نکلنے والے الفاظ حکمت و دانائی کے شہ پارے بن جاتے۔ فرماتے ہیں۔

”تعجب ہے اس انسان پر جو اللہ تعالیٰ کو حق جانتا ہے اور پھر غیروں کا ذکر کرتا ہے۔ جو حساب کو حق جانتا ہے اور پھر مال بھی جمع کرتا ہے، جو جہنم کو حق مانتا ہے اور پھر گناہ کا ارتکاب بھی کرتا ہے۔“

اگر بندہ سوچنے سمجھنے کی تھوڑی سی صلاحیت بھی رکھتا ہو تو ان اقوال کی گہرائی میں اترنا بہت

مشکل نہیں ہے۔

سورۃ العلق کی ابتدائی 5 آیات کے بعد چھٹی آیت پڑھ پڑھ کر میں پتہ نہیں کس دور کے کس ایسے میں جا داخل ہوئی۔

ترجمہ: بے شک آدمی حد سے نکل جاتا ہے۔ اس وجہ سے کے اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے۔

بار بار یہ دو آیات میری زبان پر جاری ہو جاتیں اور دماغ میں دم پر رکھی ہانڈی کا سا اُبال آنے لگتا۔

ناشتہ کے لئے انڈے چھیلنے کھڑی ہوئی تو اوپر کا چھلکا اُتارنے کے بعد باریک جھلی اُتارتے ہوئے قدرت خداوندی اپنے پورے زور و شور سے میرے سامنے کارفرما تھی۔ دیکھیں اوپر کا چھلکا کتنی جلدی ٹوٹ ٹوٹ کر گر گیا لیکن یہ جھلی ناخن سے کھرچ کر اُتارنا پڑی اور اس تگ و دو میں' میں بہت پیچھے بہت ہی دُور جا نکلی۔

یہ ون یونٹ ختم ہونے سے پہلے کا دور تھا۔ ماسٹرز کے بعد ایم ایڈ اور پھر ملتان جیسے دور دراز علاقے میں بطور ہیڈ مسٹریس میری تقرری گھر میں کسی کو بھی پسند نہ آئی اور مارشل لاء حکم نافذ ہو گیا کہ محترمہ وہاں جا کر جوائن نہیں کریں گی۔ لیکن یہاں بھی تو مشکل مہمات سر کرنے کا جنون تھا۔ اس لئے سب کو ناراض کر دیا کہ وہاں مجھے کیمپس کے حدود کے اندر ہی تو رہنا ہے اور یوں ہم جناب بوریا بستر سمیٹ ایک نئی دنیا کی تلاش میں چل پڑے۔

پہلی پہلی تقرری اور نئے نئے لوگ' پھر وہ کام ہی کیا جہاں مشکلات نہ ہوں۔ جہاں انسان آسانیوں کے لئے رب کے در رحمت پر ہاتھ نہ پھیلائے اور جہاں بندے کو رب اپنا رب ہونے کا یقین نہ دلائے۔

بہر حال ہماری ٹرین بھی پٹڑی پر چل نکلی۔ کچھ اپنی سمجھ بوجھ سے اور زیادہ امی جان کی نصیحتوں کی چھتری کے سائے تلے قدم اٹھاتے پسماندہ سا وہ علاقہ تھوڑا بہت تعلیم آشنا بھی تھا۔ سکول بھی تھا اور ڈگری کالج بھی۔ غربت اور افلاس کی چکی میں پسنے والے بہت تھوڑے لوگوں کے بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لیکن پورے ذوق و شوق سے۔ آج کے دور والی لاابالی کیفیت مجھے کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ یہ سکول اور کالج بھی وڈے چودھری صاحب کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ کہ وہ ایک نیک نیت' مخلص اور مہربان چودھری صاحب تھے اور ان کا ایک جگری یار کہیں دوسرے ملک میں رہتا تھا جو گاہے بگاہے یہاں آ کر ان کی اچھی خاصی برین واشنگ کرتا رہا' کہ لوگوں کو تعلیم آشنائی کے سمندر میں ہاتھ دھونے دو' تمہارے لئے بھی اللہ آئندہ جنت کے دروازے کھول دے گا۔ ورنہ تو سنا ہے کہ ایک چودھری صاحب کے کسی آشنا نے انہیں اچھا خاصا سرمایہ دیا کہ اپنے علاقے میں سکول کھولو چودھری صاحب نے کہا یار میرے ساتھ دشمنی نہ کر یہ لوگ جب تک جاہل ہیں ہمارے غلام ہیں پڑھ لکھ جائیں گے تو ہمارا راج اُلٹ دیں گے۔ یہ مہربانی کرنی ہے تو ساتھ والے چودھری صاحب کے پاس چلے جاؤ جو ہر وقت ہماری جڑیں اکھیڑنے میں لگے رہتے ہیں ذرا ان کے لوگوں کو تعلیم دے کر ان کا راج پاٹ کمزور کرو۔'' یعنی چودھری صاحب دشمنی کا بدلہ اس طرح سے لینا چاہ رہے تھے۔

بہر حال یہ چودھری صاحب جواب حیات نہیں یہ نیک کام کر گئے اور چونکہ لوگوں میں تھوڑا بہت شعور بیدار ہو چکا تھا اس لئے یہ کالج اور سکول چل رہے تھے۔ کچھ اس لئے بھی کہ سرمایہ لگانے والے مرحوم چوہدری صاحب کے دوست گاہے بگاہے آتے بھی رہتے تھے ورنہ تو نکے چوہدری صاحب کا ارادہ یہ

سلسلہ تعلیم منقطع کرنے کا بن چکا تھا۔

''بھلا ان کمی کمین لوگوں کو تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ پڑھ لکھ کر یہ وڈے لاٹ صاحب لگ جائیں گے۔''

طنز بھرے یہ جملے وہ اکثر لوگوں سے کہا کرتے تھے۔ حالانکہ خود وہ کسی اچھی یونیورسٹی سے شاید کوئی ڈگری لائے ہوئے تھے کچھ تھوڑا بہت قانون بھی جانتے تھے۔

اللہ تعالٰی نے حضرت موسیٰؑ کے پیچھے آنے والی فرعون کی فوج کو پانی میں اس طرح ڈبویا کہ وہ چوں بھی نہ کر سکے۔ فرعون' وہ خود ساختہ خدا' جس کے حکم سے لاکھوں نومولود قتل کردیئے گئے۔ اس کے آباؤاجداد جو بہت پہلے سے فرعونی خصلتوں کا مجسمہ تھے کہیں انہوں نے خندقوں میں آگ جلوائی اور حق کے نام لیواؤں کو ان خندقوں میں ڈالا اور کہیں وہ میخوں والے کہلائے کہ حق پرستوں کے ہاتھوں' پاؤں میں میخیں لگوا کر ان کا ایمان خریدنا چاہتے تھے اور بھی بہت سے اوچھے ہتھکنڈے ہوں گے حق پرستوں کو متزلزل کرنے کے لئے۔

لیکن جو سوچ مجھ ناچیز کے ذہن نارسا میں جنم لیتی ہے وہ یہ ہے کہ عبرت کا نشان بنائے جانے والے فرعون کے بعد کیا فرعونیت ختم ہوگئی؟ کیا ظلم وستم کے در بند کردیئے گئے؟ کیا جینے اور جیتے رہنے کا پیدائشی حق ہر انسان کو مل گیا......؟

اس کا جواب ہمیشہ نفی میں ہی رہا۔ ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو ہڑپ کرتی رہی اور ہر صاحب اقتدار اپنے جوتوں کے نیچے کمزوروں کو روندھتا رہا۔ عقوبت خانے معصوم' بے گناہ لوگوں کا قبرستان بنتے رہے۔ وہ ظلم و جبر کے قہر میں بھسم ہوتے رہے اور نام نہاد قانون کسی کا کچھ بھی سنوار نہ سکا۔

اتنی لمبی تمہید کے پیچھے چلنے والی سکرین پر وہ معصوم' دلکش ہرنی جیسی آنکھوں والا ایک چہرہ اُبھرتا ہے جو آج اگر پردہ سکرین پر نمودار ہوتا تو یہ بڑی خوبصورت اداکارائیں اس کے حسن کی چکاچوند میں ماند پڑ جاتیں اور اس کی گاگر کا پانی بھرتی نظر آتیں۔

میں اپنے آفس میں بیٹھی فائلیں دیکھ رہی تھی جو بلڈنگ کے متعلق تھیں اور کلرک تھوڑی دیر پہلے مجھے دے کے گیا تھا کہ دروازے پہ ہلکا سا شور ہوا۔

''تو مجھے جانے تو دے نا منور خان! آپا جی مجھے کچھ نہیں کہیں گی۔'' یہ کھلتی ہوئی ایک خوبصورت گندمی رنگ کی مٹیار تھی۔ جو مٹیار سے زیادہ کوئی فلمی ہیروئن لگ رہی تھی۔ سادہ سے لباس میں ملبوس سر کو پوری طرح ڈھانپے ہوئے وہ اندر آنے کی اجازت کی منتظر تھی۔

''منور خان! کیا بات ہے۔ یہ شور کیسا ہے؟''

میں نے کچھ جانتے ہوئے بھی تمہیدی سوال کردیا۔

''میڈم! یہ فروزاں بی بی آپ کے پاس خوامخواہ ہی آنے کی ضد کررہی ہے جی!'' منور خان کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔

''اچھا آنے دو اسے...... میں دیکھ لیتی ہوں۔''

اجازت ملنے کی دیر تھی کہ وہ منور خان کا منہ چڑاتی اندر آگئی۔

''سلام میڈم جی...... جی میں فروزاں ہوں بابے رحیم بخش کی پوتری جی...... وہی رحیم بخش جی! جو آپ کے گملے شملے ٹھیک کرتا ہے......'' اس نے اپنا مکمل تعارف کروالینا ہی مناسب سمجھا۔

فیروزہ نام کو فروزاں بنا کر شاید اس کی جاذبیت اور غرور میں کچھ اضافہ ہی ہوا تھا۔ فیروزہ تو پتھر ہی ہے نا جس کو بھا جائے اس کے بلے بلے

اور جس کو کھا جائے اس کے کچھ نہ رہے پلے......
''ویسے میں ایسی تو ہمات کی قائل ہرگز نہیں۔''

اور اس کے بقول فروزاں کو چانن ہی چانن تھا نا...... تاریکیوں میں اجالا، ظلمت میں روشنی اور خوش بختی کی علامت۔ یہ سارے احساس پل بھر میں میرے اندر سے ہو کر گزر گئے۔ میں جو اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ ایسے دیکھنے سے شاید وہ نروس ہو رہی تھی تبھی فوراً بولی۔

''میں بیٹھ جاؤں میڈم جی!''

''ہاں ہاں فروزاں تم بیٹھو نا۔ کھڑی کیوں ہو'' میں نے اپنی شرمندگی کی ردا اوڑھتے ہوئے اسے پیار سے مخاطب کیا تھا۔

''ہاں اب بتاؤ۔ کس کام سے آئی ہو۔ یا ایسے ہی گھنگھل میلہ کرنے......؟''۔ وہ ہنس پڑی۔ ایسے جیسے کسی نے بھری گھاگر سے پانی انڈیل دیا ہو۔

''وہ جی میں تو آئی ہوں کہ آپ مجھے پڑھا دیں نا میں بھی استانی جی بن جاؤں گی اور پھر کبھی میڈم جی بھی۔''

اتنی معصومیت تھی اس تقاضے میں کہ میں اس کا منہ دیکھتی رہ گئی جو یہ تقاضا کرتے ہوئے خوشیوں کی پتنگ کو اوپر اور اوپر اڑائے جا رہی تھی۔

کیوں نہیں فروزاں! ہم سب کو یہ حق حاصل ہے کہ ہم تعلیم حاصل کر کے اپنے پیارے وطن کے لئے کچھ کریں۔ میں نے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔ ''مگر مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے پڑھائی شروع کہاں سے کرنی ہے۔''

''وہ جی میڈم جی میں نے دسویں تک پڑھا ہوا ہے جی۔ جب وڈے چوہدری صاحب زندہ تھے نا تو انہوں نے بے بے سے کہا تھا امیراں بی بی اس کو بھی سکول میں داخل کروا دے۔ چار حرف پڑھ جائے گی تیری دھی بھی اور پھر جی میں بڑے شوق سے پڑھنے لگ گئی تھی۔ اور جی میں نے آٹھویں کے امتحان میں وظیفہ بھی لیا تھا تو جی پھر بے بے نے مجھے نویں میں داخل کروا دیا۔'' وہ بولتی بولتی رُک گئی...... جیسے اس کے گلے میں کچھ اٹک گیا ہو یا جیسے اس نے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے گلے میں اُتار لئے ہوں۔

''کیا ہوا فروزاں! تم چپ کیوں ہو گئیں۔''

وہ جی پھر میری پھوپھی نے زور ڈالا کہ کڑی کو ویاہ دو۔ اس نے کوئی نوکری شوکری کرنی ہے۔ بہتیری ہیں نوکلاسیں۔''

وہ رو دی۔ ایسے جیسے کسی بچے کے ہاتھ سے اس کا من پسند کھلونا چھین لیا گیا ہو۔ یا جیسے کسی مُیار کے سر سے پانی کی بھری گھاگر اس کے سر کے زاویئے کے ذرا سے بدلنے پر کھسک کر نیچے جا پڑے اور پوری آواز سے ٹوٹ جائے اور پانی ڈھلان کی طرف بہتا چلا جائے۔

''پھر میڈم جی! میری پھوپھی نے فوراً شادی کر دینے کا حکم دے دیا اور جی میری شادی ہو گئی۔ پر میڈم جی! مجھے اس شادی کی ذرا بھی خوشی نہ ہوئی۔ میں تو بس یہی سوچ کر رو دیتی کہ کیا تھا پھوپھی ایک سال اور رُک جاتی میں دسویں کر کے اس کی نوں بن جاتی تو پنڈ میں اس کی بھی بے بے ہو جاتی نا۔

''پر میڈم جی! میرا جو گھر والا تھا نا اس نے مجھے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا۔ فروزاں تو دسویں کر لے بے بے کو میں راضی کر لوں گا۔ وہ فوج میں تھا نا جی سپاہی۔ تو اس نے مجھے ساتھ تو نہیں لے جانا تھا۔ اس نے بے بے کو راضی کر لیا اور ویاہ کے پندرہ دن بعد جب وہ اپنی نوکری پر واپس گیا تو مجھے میری بے بے کے پاس چھوڑ گیا کہ اس کو سکول بھیج

دیا کرو۔

''اور فروزاں تمہارے ابا جی کہاں تھے۔''
میں نے صرف بے بے کے ذکر پر اس کے باپ کے متعلق پوچھنا مناسب سمجھا۔

وہ تو جی وڈی لام میں ہی فوت ہوگیا تھا اور میرا پردادا ہے نہ جی...... یہ بھی تو لام میں گیا تھا۔ ٹانگ میں گولی لگی تھی اسی واسطے لنگڑا ہو کے چلتا ہے اور جی ہمارے پنڈ کے بہت لوگ وڈی لام سے واپس نہیں آئے تھے۔ اور جی میں تو اس وقت پتہ نہیں چھوٹی سی تھی۔ بس اپنے ابا کی بڑی سی تصویر میں نے دیکھی ہے میڈم جی! واہ واہ سوہنا گھبرو جوان تھا میرا ابا...... یہ بڑی سی شملے والی پگ باندھے فوجی وردی پہنے بہت ہی سوہنا لگتا ہے جی......''

اس نے پھر دوپٹے کے پلو سے اپنی ناک صاف کی آنسو پونچھے اور میں سوچتی رہ گئی کہ یہ جنگ عظیم دوم ہمارے ملک کے خاندانوں کے خاندان کھا گئیں۔ کچھ بچے اپنے باپوں کی موت کے بعد پیدا ہوئے اور جو فروزاں جیسے پہلے پیدا ہوچکے تھے وہ یتیمی کی زندگی گزارنے پر مجبور کردیئے گئے۔ ان گنت بچے ایسے تھے جن کے آنسو پونچھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ مذہب سے دوری اور علم سے بے بہرہ ہم لوگ دوسروں کی لگائی آگ میں جلتے رہے۔ بھسم ہوتے رہے۔ اسی گاؤں کے بے شمار بچے یتیم تھے۔ فروزاں تو پھر بھی اچھی رہی کہ اس کا دادا زندہ واپس آ گیا اور اسے باپ کی محبتوں کا رنگ دیتا رہا۔

''پھر میڈم جی! میں سکول تو جانے لگ گئی۔ پر میں تو بیمار بھی رہنے لگی...... چاچی نذیراں نے ایک دن بے بے سے کہا۔

''لگتا ہے فروزاں کا پیر بھاری ہے۔'' تو میں بار بار اپنے پیروں کی طرف دیکھتی رہی کہ میرے دونوں پیر تو ایک جیسے ہیں یہ چاچی کیا کہہ رہی ہے؟ جب میں نے چاچی سے کہا۔

''نہ نہ چاچی! میرا پیر تو ٹھیک ٹھاک ہے۔ بھاری کوئی نہیں ہے۔ تو اس نے مجھے بڑے پیار سے گلے لگالیا۔

''جا کھیڈ جا کر...... کچھ نہیں ہوا۔'' اس نے مجھے پیار کیا اور بے بے اور چاچی دونوں زور زور سے ہنسنے لگ گئیں۔

پھر جی! میری استانی جی نے بھی مجھے کہہ دیا کہ تو سکول نہ آیا کر تیری طبیعت خراب رہتی ہے۔ جب تو ٹھیک ہوجائے گی تو میں تجھے بلالوں گی۔''

میڈم جی! میں تو بس روتی رہتی تھی۔ پھر پھوپھی آئی اور اس نے مجھے بہت پیار کیا۔ ''تی فروزاں تُو تو میرے پوتے کی ماں بننے والی ہے۔'' میں بے وقوف جی، نکی ساری عمر میں بس ایک ہی سوچ لئے بیٹھی تھی کہ میں نے دسویں ضرور کرنی ہے۔ کسی کی کوئی بات میرے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ بس ہر ایک سے لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔

پھر ایک روز میری بے بے نے مجھے پاس بٹھا کے آرام سے سمجھایا کہ کیا ہونے والا ہے میں چڑ گئی۔ تو اس نے پیار سے کہا تو مجھے کتنی پیاری ہے فروزاں میں تیری بے بے ہوں نا۔'' میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔'' اور تُو بھی تو مجھے بہت پیار کرتی ہے نا......'' میں نے پھر ہاں میں سر ہلا دیا۔'' تو پھر اگر اللہ تجھے دھی پتر دے دے اور تُو بے بے بن جائے تو تُو اپنے بچے کو پیار کرے گی نا......''

بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ گئی اور میں گھر میں رہ کر اپنی دسویں کی کتابیں پڑھتی رہتی تھی۔ پھر میرا بیٹا پیدا ہوا۔ ان دنوں چھٹی نہیں مل رہی تھی پھر کسی جنگ کا رولا پڑا ہوا تھا۔ پر میرا گھر والا ایک دن کے لئے چھٹی پر کاکے کو دیکھنے آیا۔ اس نے

کا کے کو بہت پیار کیا اور ہم نے اس کا نام عالم دین رکھ دیا۔ اچھا نام ہے نا میڈم جی! پر لوگ اس کو علمو کہتے ہیں مجھے اچھا نہیں لگتا اور میرے عالم دین کا ابا پھر ایسا گیا کے اس کی شہادت کی خبر ہی ہمیں ملی۔ 1965ء کی جنگ میں میرا عالم دین بھی یتیم ہوگیا لیکن دادا خوش تھا کہ میرا پتر شہید ہوگیا ہے۔

پھر جی میں نے عالم دین کو بے بے کی گود میں ڈالا اور خود دسویں کے امتحان میں جا بیٹھی کے یہ میرے گھر والے شہید کی خواہش بھی تھی اور میڈم جی میں نے دسویں جماعت سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرلی۔''

ایک احساس تفاضر تھا جو اس کی نس نس سے پھوٹ رہا تھا۔ اس کا انگ انگ بول رہا تھا۔ ''دیکھا میں نے وہ کرلیا جو میری خواہش تھی۔''

''عالم دین اب سکول جاتا ہے جی! میں اس کو بہت پڑھاؤں گی بہت بڑا افسر بنے گا میرا بیٹا۔ بس آپ مجھے اور پڑھا دیں نا میڈم جی! مجھے اپنے سکول میں استانی لگالیں۔''

اس سے میں نے مڈل اور میٹرک کے سٹوفکیٹ لانے کا کہا اور وہ خوشی خوشی چلی گئی۔ لیکن میرے اردگرد سوچوں کا ایک جال سا بن گیا۔ کیونکہ جس معاشرے اور جن حالات میں وہ رہ رہی تھی وہ کچھ ایسے سازگار بھی نہیں تھے۔ کسی لڑکی کا میٹرک کرلینا بھی ایک معجزے سے کم نہیں تھا اور وہ بھی ایسے پسماندہ علاقے میں پتہ نہیں کیوں مگر میری چھٹی حس پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ کوئی بہت بڑا طوفان آنے والا ہے۔

دو دن بعد وہ اپنے سٹوفکیٹ لے کر آگئی۔ خوشی اور یاس دونوں کا ملا جلا تاثر لئے اور کرسی پر بیٹھنے کے بجائے وہ میرے قریب زمین پر جیسے گرسی گئی۔

''میڈم جی! وہ جی داخلہ تو بہت زیادہ ہے اور جی میرا دادا کہہ رہا تھا نہ بھٹک فروزاں میڈم جی تو کسی بڑے گھر کی ہیں نا...... اور ہم ٹھہرے کمی کمین تو کہاں استانی بن سکتی ہے۔'' وہ تقریباً رو دی۔ ''اور جی دادا کہہ رہا تھا کے چودھری جی کہہ رہے تھے فروزاں سے کہو حویلی آجایا کرے چوہدرائن کی مدد بھی کیا کرے اور بچوں کو پڑھا بھی دیا کرے۔ تو میڈم جی! میں۔ میں کیا کروں۔'' یہ کہہ کہ وہ پھر رو پڑی۔ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا وہ اور میں عمر میں تقریباً برابر تھیں لیکن اس وقت وہ ایسا معصوم بچہ لگ رہی تھی جس کی ماں بھرے میلے میں اس سے بچھڑ جائے۔ ڈری ہوئی سہمی ہوئی فاختہ کی مانند۔

''کتنی فیس داخلہ ہے فروزاں! مجھے تو نہیں پتہ۔'' سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں انجان بن گئی۔

''وہ جی لڑکوں والے سکول کے ماسٹر نے دادا کو بتایا ہے کہ جی پینتیس روپے فیس ہوگی اور وہی لینے دادا گئے چوہدری کے پاس گیا تھا۔''

''دادا چوہدری کے پاس کیوں گیا فروزاں؟ وڈے لوگ دوسروں کو کمی کمین ہی رہنے دینا چاہتے ہیں پڑھانا نہیں چاہتے اور دادا نے اس چوہدری کو جا جا کے تمہارے استانی جی بننے کی خوشخبری سنا دی۔ میں بھی تم جیسی ہی ہوں فروزاں کسی بہت وڈے گھر کی دمی نہیں ہوں ورنہ میں تمہاری مدد کیوں کرتی؟''۔

''سچ میڈم جی!'' اس کی آنکھوں میں ستارے سے جگمگانے لگے۔ میرا شہید گھر والا کہتا تھا مایوس نہ ہوا کر فروزاں رب بڑا سبب بنانے والا ہے۔ میں جا رہی ہوں میڈم جی! دادا کو بتا دوں نا'' اور وہ اُٹھ کر بھاگ گئی۔

خوش قسمتی سے ورنیکلر سکول کی پرنسپل میری کلاس فیلو بھی تھی۔ سارے معاملات طے کر کے

میں نے کاغذات اور فیس بجھوا دی۔ ساڑھے تین سو روپے میرے لئے تو ایک بہت بڑی رقم تھی۔ اماں نے کہا تھا۔ تیری تنخواہ تیری ہی ہے۔ بس فضول خرچی نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو بھی اور بخیل لوگوں کو بھی پسند نہیں کرتا۔ فضول خرچی کے تو وہ زمانے ہی نہیں تھے۔ سفید لٹھے کی شلوار، پرعذ تین چار قمیصیں، سفید دوپٹے، کالی یا براؤن جوتی اور بس اللہ اللہ خیر صلا۔ اور بخیل ہونا تو مجھے سخت برا لگتا تھا۔ میرا ہاتھ تو ہمیشہ سے کھلا تھا۔ اور رب العزت کا بے حد شکر ہے کہ اس نے اپنے بھرے خزانوں سے مجھے ہمیشہ نوازا۔

یہ سارا کچھ کر کے بھی میں بے سکون تھی۔ یہ کسی ایک فروزاں کی بات نہیں تھی وہاں تو ریشم بی بی، فضل رسول، خدیجۃ الکبریٰ، صغوراں بی بی اور زینب زہرا بھی تھیں جب انہیں فروزاں کے داخلے کی خبر ملی تو سب میرے آفس میں سوالیہ نشان بنی کھڑی تھیں "صرف فروزاں کیوں؟ ہم بھی کیوں نہیں؟"

اور یہی وہ طوفان تھا جس نے حویلی کی دیواروں کو ہلا دیا۔ نکے چوہدری کا غصہ دیدنی تھا۔ جب وہ قہر الرجال بنا، منہ سے کف اڑاتا، فرعونی غصہ سجائے میرے دفتر میں دندناتا ہوا داخل ہوا۔ "دیکھو میڈم [illegible] ہمارا علاقہ ہے اور اس میں کیا ہوتا ہے اس کے ہم مالک ہیں۔ تم کہاں سے خدائی فوجدار بن کر ہماری لڑکیوں کو [illegible] جانے آ گئی ہو؟"

[illegible] فرعونیت [illegible]

زر بڑھتا ہی رہتا ہے۔

میں نے زہر ممکن اپنے اوسان بحال رکھے۔ جب وہ بول رہا تھا تو میں تعوذ پڑھ رہی تھی اور جب میں بولی تو اپنے رب کی عظمت بیان کرنے سے شروعات کی۔

"بیٹھ جائیں چوہدری جی! اگر علم حاصل کرنا بے راہ روی کا راستہ ہوتا تو نبیؐ پر "اقرا باسم ربک الذی خلق" کی آیت نہ اترتی۔ حضرت آدمؑ کا سینہ علم و ادب کا گھر نہ بنایا جاتا۔ آپ بھی خالص ان پڑھ ہوتے قانون دان نہ ہوتے۔ اگر آپ خود ان بچیوں کی کفالت کرتے نہیں ایس وی کروا دیں تو آپ کے لاکھوں میں سے چند روپے خرچ ہوں گے لیکن آپ کے لاکھوں کو آب زم زم بنا جائیں گے۔ اور جا کے سوچیں کہ اپنے والد کی طرح شرف انسانیت کا تمغہ سر پر سجانا ہے۔ یا فرعون کی طرح قصر عذلت میں گرنا ہے۔"

جانے مجھ میں بولنے کی قوت کیسے عود کر آئی تھی۔ شاید سکول اور کالج کے مباحثوں میں حصہ لینے کا فن آتا تھا اس لئے [illegible] لیکن عین اس وقت کی قوت گویائی گویا

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز

اس شعر کے مصداق تھی کہ حق تعالیٰ نے مجھے حق کے [illegible] بولنے کا حوصلہ عطا فرما دیا تھا۔ میرے سامنے ان بچیوں کا مستقبل تھا جن کے [illegible] نکلنے کے لئے ہاتھ [illegible] اپنے [illegible] فرعونیت کی [illegible] تھے۔ جو [illegible] اونچے کلس [illegible] ارادوں اور

کلف شدہ شملوں سے بنے ہوئے ہیں لیکن رب نے ہر فرعون کے لئے موسیٰ بھی تو بنا رکھا ہے نا...... وہ موسیٰ جو خود فرعون کی گود میں پل کر بڑا ہو جاتا ہے۔ میرے الفاظ چوہدری کے سر پر بم کے شدید دھماکوں کی طرح پھٹے۔ اس کی آنکھیں غصہ کی شدت سے اُبل کر باہر نکل آنے کو تھیں اس کا پورا جسم غصہ کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اس نے بھرپور نفرت آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر ان سب لڑکیوں کی طرف جو ڈر اور خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں اور دفتر سے دو قدم باہر نکالے۔ فروزاں جو عین اس کے راستے میں تھی اس کو دبوچا اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر اس کو ایڑھی لگا چکا تھا۔ میں جتنا تیز بھاگ سکتی تھی بھاگ کر باہر نکلی۔ چوہدری اللہ سے ڈر چوہدری اس بچی کو چھوڑ دے۔ میں نے اپنی پوری آواز سے اس کو پکارا۔ فروزاں ایک نازک چڑیا کی طرح اس چیل کے پنجے میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ شاید اس کی آواز بند ہو چکی تھی فروزاں کا دادا اور سارا گاؤں پیچھے بھاگ رہا تھا۔

”اللہ کرے چوہدری! تو گھوڑے سے گر کر مرے۔ تجھے پانی کا گھونٹ نصیب نہ ہو، تجھے کلمہ نصیب نہ ہو۔ چھوڑ دے میری بچی کو اللہ تجھے غارت کرے۔ یہ شہید کی بیوہ ہے ظالم! اللہ کے قہر سے ڈرو۔“ وہ رو رہا تھا، دہائیاں دے رہا تھا اور چوہدری بک رہا تھا۔

”بلا لے اپنے رب کو آج تو بھی دیکھتا ہوں تیری مدد کو کون آتا ہے؟“

جب [illegible] پاؤں [illegible] پورے وجود کو [illegible] پھر جیسے اللہ کی [illegible]

اور تائید ایزدی آ چکی تھی۔ چند قدم آگے جا کر گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ سب کی نظروں کے سامنے فروزاں اس فرعون کے چنگل سے آزاد ہو کر کھیت میں گری اور اس فرعون کا سر سامنے والے درخت سے ٹکرا گیا۔ اور اس سے بھی بُرا یہ ہوا کہ چوہدری کا پاؤں رکاب میں پھنسا ہوا تھا اور گھوڑا بھاگ رہا تھا اور یہ سب ہم سب دیکھ رہے تھے۔ وہ جو چند لمحے پہلے حواس باختہ، بے بس، مجبور و مقہور بنے کھڑے تھے جیسے سکتے سے بیدار ہو گئے۔ دادا نے بھاگ کر فروزاں کو گود میں اُٹھا لیا۔ وہ بے ہوش تھی۔ ”میری بچی! میری فروزاں! میرے شہید کے بیٹے کی ماں!“ دادا بڑبڑا رہا تھا۔ یوں جیسے اسے کسی نے مسمرائز کر دیا ہو۔ ”ربا! تیرا شکر، تیرا شکر ربا! تیرا شکر ربا۔“ وہ رو رہا تھا۔ ایسا رونا جس کی تہہ میں ہزاروں شکرانے، ہزاروں سجدے اور ہزاروں مسکراہٹیں تھیں۔ اس کی دعاؤں نے فرعون کی اکڑ والے چودھری کا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔ ان گنہگار آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ یقیناً اللہ کی اس ”وارننگ“ کی منہ بولتی تفسیر تھا۔ ”یقیناً تمہیں اسی رب کی طرف لوٹنا ہے۔“ آپ سب ہماری اس وقت کی کیفیت کا صحیح اندازہ لگا ہی نہیں سکتے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فوجیں کھڑی تھیں [illegible] تھا۔ [illegible] حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا [illegible] جوش مارتا [illegible] پہاڑوں کی طرح [illegible] موسیٰ علیہ السلام کی [illegible] نکلی ہیں اور [illegible] پیچھے

کے لئے اور پھر قرآن میں رب عظیم فرماتا ہے ''ہم تجھے عبرت کا نشان بنا دیں گے''۔ وہ بھی عبرت کا نشان بنا مگر کسی نے درس عبرت حاصل نہ کیا اور آج میری ان گنہگار آنکھوں کے سامنے وہ تھا۔ اونچے شملے والا نکا چوہدری 'اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر جس کا شملہ تار تار ہو چکا تھا۔ حویلی کا سب سے اونچا کلس زمین بوس ہو رہا تھا اور سب دیکھنے والے گویا پتھر کے مجسمے بن گئے تھے۔ کوئی ایک قدم بھی آگے نہ اٹھا پایا۔

''او کوئی اس کو بھی دیکھے جا کے!'' دور سے کسی کی آواز نے گویا صور پھونک دیا۔ مجسموں میں جان پڑ گئی اور کچھ لوگوں نے آگے بڑھ کر گھوڑا قابو کیا۔

ڈنڈا ڈولی کر کے چودھری کو ہسپتال پہنچایا گیا اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی اس کا نچلا دھڑ بے جان ہو چکا تھا اور اصل بات جس کی سمجھ سب کو دیر سے آئی یہ تھی کہ فروزاں نے بے بسی کے اس عالم میں اس ظالم کے بازو میں اپنے دانت گاڑھ دیئے تھے۔ جس کی وجہ سے چوہدری کے چنگل سے وہ خود بھی آزاد ہو گئی اور اللہ نے چوہدری کے لئے تباہی کا پروانہ بھی لکھ دیا۔ بہر حال چیونٹی نے ہاتھی کو مار گرایا۔ اور گرانے والا کون ہے؟ یہی وہ اصل ہے جس کو انسان بہت دیر سے سمجھتا ہے۔

اور پھر ان چھ لڑکیوں نے ایس وی کر لیا۔ کس نے کس کی کفالت کی یہ کریدنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ''تعز من تشا'' پر یقین رکھنے والے جانتے ہیں کہ بہترین مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ کی ذات عالی صفات ہے۔

فروزاں' وہ ہستی جس کے گرد یہ ساری روداد گھومتی ہے' کئی بار گرداب بلا میں پھنسی۔ نکے چوہدری سے وہ ایسے خوفزدہ رہتی تھی جیسے کبوتر بلی سے۔ اس فرعون نے کئی بار اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا۔ کئی بار اس کی عزت نفس کو مجروح کرنے کی ناپاک کوشش کی۔ کئی بار اس کے سر سے تقدس کی چادر نوچنا چاہی لیکن رب عظیم نے ہمیشہ اس شہید کی بیوہ کی حفاظت کی۔ وہی فروزاں ایس وی کے بعد تعلیمی مراحل طے کرتے کرتے بی ایڈ اور پھر ایم ایڈ کر گئی۔ اس کی وہ معصوم سی خواہش ''پھر بھی میں بھی میڈم جی بن جاؤں گی'' رب العزت کو بے حد پسند آئی اور وہ ایک بہترین میڈم جی کے روپ میں تعلیم کی دنیا میں ابھری۔ اس کا وہ معصوم شہزادہ اس کے خوابوں کی صحیح تصویر بنا اور سی ایس ایس کا امتحان شاندار نمبروں میں پاس کر کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتا رہا۔

اور میں اس وقت قرآن کی سورۃ العلق کی آیات پڑھتے ہوئے سوچ کے سمندر میں غوطہ زن ہوں کہ یہ آیات تو ابوجہل کی خودسری کے لئے اتاری گئی تھیں۔

ترجمہ: ''ہرگز نہیں اگر وہ شخص باز نہیں آئے گا تو ہم پیشانی کے بال پکڑ کر جو کہ دروغ اور خطا میں آلودہ پیشانی ہے گھسیٹیں گے۔''

کاش ہم قرآن کی تعلیمات کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔ میری نگاہوں میں نکے چوہدری کی پگ کا کلف لگا شملہ اور اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر گھوڑے کی رکاب میں پھنسے ایک پاؤں کی وجہ سے گھسیٹا جانا گھوم رہا ہے۔ یہ پیشانی کہیں گندی اور گند آلود ہے اور کہیں فروزاں جیسی ہستی کی وہ پیشانی ہے جو سدا اپنے رب کے حضور سجدے میں گری رہی۔ فیروزاں ایک ایسا پتھر جس کے متعلق مشہور ہے کہ جسے راس آ جائے شہنشاہ بنا دے، دراصل کسی قوت کسی طاقت کا مالک نہیں ہاں البتہ فیروزہ سے فروزاں بن جانے والی ہستی کی چمک دمک میں ابھرنے والا وہ احساس ضرور ہے کہ اصل طاقت تو اس رب کی ہے جسے نکے

چوہدری جیسے خودسر یہ کہہ کر ارتکاب کفر کرتے ہیں کہ "بلا لے اپنے رب کو آج کوئی بھی تیری مدد کو نہیں آئے گا۔"

کیا کبھی رب نے اپنے بندوں کو تنہا چھوڑا ہے۔ ہاں البتہ آزمائشوں کی بھٹی میں ضرور ڈالتا ہے کہ دیکھے کون اس کی ذات سے وابستہ رہ کر بہترین انجام کی طرف بڑھتا ہے اور کون شر اور فتنہ میں فرعون سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے اور پھر وقت کی ڈور اس کے ہاتھ سے چھین کر کہیں بدر کے میدان میں رسوائی اور ذلت دی جاتی ہے اور کہیں بحر قلزم میں ڈبو کر دنیا کے لئے سامان عبرت بنا دیا جاتا ہے۔ ہاں اگر کوئی عبرت حاصل کرنا چاہے تو؟

اور وہ نوازنے والا اس کو بہت نوازتا ہے جو اس کے ساتھ اپنے رشتے جوڑے رکھتا ہے۔ اسی ایس وی ٹیچر کے ساتھ فروزاں کی شادی ہوئی جس نے اسے فیس کے پینتیس روپے بتائے تھے۔ پھر رب نے اسے تین بیٹوں سے نوازا۔ بڑا تو تھا ہی شہید کا بیٹا اور پھر کارگل کی بلند چوٹیوں پر اس کا یوسف بھی شہید ہوگیا اور تب میری اس سے ملاقات ہوئی تو اس کی آنکھیں گلاب کی پتی پر چمکنے والی شبنم کے نظارے دے رہی تھیں۔

"تمہیں دکھ تو بہت ہوگا فروزاں یوسف کی شہادت کا۔" میں نے جب اظہار ہمدردی کیا تو وہ مسکرادی۔

"میڈم جی! میں کیا تھی۔ گم گشتہ راہ۔ پینتیس روپے فیس کی ادائیگی کے لئے نکے چوہدری جیسے فرعون کے سامنے ہاتھ پھیلانے والی قدم قدم پر اپنی عزت نفس کو بچانے کے لئے رو دینے والی۔ پھر میرے رب نے مجھے اپنی محبتوں، رحمتوں اور شفقتوں کی بڑی سی چادر میں ڈھانپ لیا۔ اس نے مجھے عبیدالرحمان جیسا شوہر عطا کیا۔ تین اور بیٹے چاہتوں کے رس سے بھرے میری گود میں ڈال دیئے۔ ایس وی کی فیس کی بھیک مانگنے والی کو اتنی اونچی کرسی پر لا بٹھایا دولت دی، عزت دی، اولاد دی، کیا نہیں دیا اس نے مجھے، کیا میں اس کا شکر ادا کرسکی۔ اس کی عنایتوں کے بدلے میں جی بھر کر نفل ادا کرسکی..... بس مزے ہی لوٹتی رہی اس کی نعمتوں کے۔ میڈم جی آج اگر اس نے مجھ سے یوسف کی جدائی مانگی ہے جو بہت مشکل امر ہے تو کیا میں اس کی حکم عدولی کردوں؟ اس سے گلے شکوے کرنے بیٹھ جاؤں؟ نہیں میڈم جی! میں خوش ہوں مالک حقیقی کی ہزاروں نعمتوں سے جھولیاں بھر بھر کے مٹانے والی فروزاں اپنے رب سے راضی ہے۔ مجھے اس سے کوئی شکوہ نہیں کوئی شکایت نہیں۔"

وہ مسکرا بھی رہی تھی اور رو بھی رہی تھی اور میں اس عزم و ہمت کی تصویر کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی ہم میں سے کتنے بندے ہیں جو فروزاں جیسے احساسات سے مزین ہیں۔ اس کی حالت تو اس مومنہ جیسی تھی جس کے روبرو یہ آیت پڑھی جا رہی ہو۔

ترجمہ۔ بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے، پس تم کو نہ بہکا دے دنیا کی زندگی۔

اور فروزاں

اے مسلماں ہر گھڑی پیش نظر
آیہ لا تخلف المیعاد رکھ

کی مکمل تفسیر بنی میرے سامنے بیٹھی خاموشیوں کی زبان سے پکار پکار کر کہہ رہی تھی

جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں۔

حنا حبیب

مراقبہ اور اسکی اہمیت وافادیت

بلاشبہ یوگا کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے تاہم بیشتر افراد کو یہ تکنیک کافی مشکل لگتی ہے اسی لیے وہ چاہنے کے باوجود بھی اسے نہیں کر سکتے۔ لیکن مراقبہ ایک ایسی تکنیک ہے جو نہ صرف آسان ہے بلکہ اسکے فوائد بھی یوگا جیسے ہیں۔ اور اس میں کسی قسم کی اٹھک بیٹھک کی بھی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

مراقبہ کیا ہے؟

ایک عام انسان مراقبہ کو عبادت کی طرح سمجھتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ آپ اپنی سوچوں کے تسلسل کو کسی سمت میں لے کر چلتے ہیں یہ مراقبہ ہے۔ مراقبہ کا مطلب آپ کے سوچنے کے عمل پر آپ کی رسائی ہے۔ یہ شعور کی ایک ایسی حالت ہوتی ہے جس میں آپکا دماغ منتشر سوچوں سے آزاد ہوتا ہے۔ مراقبہ ایک سادہ اور آسان طریقہ ہے اسے ذہنی تنظیم کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس میں آپ نے اپنی تمام توجہ اپنے ذہن پر مرکوز رکھنی ہوتی ہے تا کہ آپکا ذہن اپنے مقصد سے ادھر اُدھر نہ ہٹ سکے۔ مراقبہ کے مشہور و معروف ہونے کے باوجود بہت کم لوگ اس؟

کے بارے میں جانتے ہیں۔مراقبہ میں کسی ایسی چیز کو تصور میں لایا جاتا ہے جو ہمیں مطمئن کرتی اور سکون دیتی ہے۔ایک شخص روزمرہ زندگی کے کام کرتے ہوئے بھی مراقبے میں ہوسکتا ہے جبکہ پہاڑ کی چوٹی پر مخصوص انداز میں بیٹھا شخص مراقبے سے کوسوں دُور بھی ہوسکتا ہے۔اگر مراقبے کے دوران ذہن پُرسکون اور خاموش ہو تو گہرا سکون حاصل کیا جاسکتا ہے۔بہت سالوں پہلے مراقبے کو ایک خاص طبقے کے لوگوں کا شیوہ سمجھا جاتا تھا لیکن آجکل یہ قدیم وجدید ہر طرح کے لوگوں میں یکساں شہرت رکھتا ہے۔سائنس وطب کی شہادتوں سے اسکے بے شمار فوائد سامنے آچکے ہیں لیکن مزید فوائد پر ابھی بھی تلاش جاری ہے۔

مراقبہ کے فوائد

مراقبہ ہمارے جسم اور ذہن کے لیے ایک طاقتور ہتھیار ہے۔مطالعہ سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ مراقبے کا سب سے اہم کام ہمارے ذہن کو متوازن رکھنا ہوتا ہے۔یہ صرف ہمارے دباؤ کو کم ہی نہیں کرتا بلکہ ہمارے جسم کو دیگر بیماریوں کے خلاف موثر مقابلہ کرنے کے لیے بھی تیار کرتا ہے۔جاپان میں منسٹری آف لیبر کمیشن نے مراقبہ کے فوائد کا جائزہ لینے کے لیے 447 ملازمین کو اسکی تربیت دی۔مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ ان ملازمین کی نہ صرف کارکردگی بہتر ہوگئی بلکہ وہ دیگر ملازمین کے مقابلے میں کم بیمار رہے۔ڈپریشن، دباؤ اور مختلف امراض کی شکایت بھی عام ملازمین کی نسبت ان میں بہت کم رہی۔بلاناغہ مراقبہ کرنے کے فوائد درج ذیل ہیں:

☆ مراقبہ ذہنی دباؤ اور پریشانی سے نجات دلاتا ہے۔
☆ عمر کے اثرات کو زائل کرتا ہے۔
☆ خوش وخرم زندگی گزارنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔
☆ قوتِ مدافعت بڑھاتا اور بیماریوں کے خلاف لڑنے میں مدد کرتا ہے۔
☆ میٹابولزم کو بہتر بناتا اور وزن گھٹانے میں مدد کرتا ہے۔
☆ آپ کو منظم ومنتظم بناتا اور اچھی اور خوشگوار نیند لاتا ہے۔
☆ آپ کی ذہانت بڑھاتا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت میں اضافہ کرتا ہے۔
☆ بلند فشارِ خون، درد اور تنہائی کے احساس کو کم کرتا ہے۔
☆ جلد کو صاف کرتا اور سننے اور دیکھنے کی صلاحیت کو بہتر بناتا ہے۔

وقت اور جگہ کا تعین ضروری نہیں

مراقبے کی ایک اور اچھی بات یہ ہے کہ اسے آپ کبھی بھی، کسی بھی جگہ اور جب چاہیں کر سکتے ہیں۔اس کے لیے آپ کو دن میں کسی بھی وقت 15 سے 20 منٹ درکار ہونگے۔آپ اسے گھر پر، دفتر میں یہاں تک کہ آپ ٹرین میں ہی کیوں نہ بیٹھے ہوں آرام سے کر سکتے ہیں لیکن ضروری بات یہ ہے کہ اسے روزانہ کی بنیاد پر کیا جانا چاہیے ورنہ اسکے بھرپور نتائج نہیں مل سکیں گے۔

ماہرین نے اگرچہ وقت اور جگہ کا تعین نہیں کیا لیکن پھر بھی انکے خیال میں مراقبے کا بہترین وقت صبح کا ہے خاص طور پر جب آپ سو کر اٹھتے ہیں کیونکہ اس وقت آپ کا ذہن ہلکا پھلکا اور ہر قسم کے دباؤ سے آزاد ہوتا ہے۔لیکن اگر آپ شام کو آسانی محسوس کرتے ہیں تو یہ بات یاد رکھیں کہ مراقبہ کرنے سے کم از کم 10 منٹ پہلے اپنے ذہن کو مکمل طور پر دن میں ہونے والی سرگرمیوں سے آزاد کرلیں۔خاص طور پر

ایسی باتوں کو ذہن سے نکالیں جو آپ کے لیے دباؤ اور پریشانی کا باعث بنتی ہیں۔ اگر آپ تھوڑی دیر کے لیے تیز قدمی کر لیتے ہیں یا کوئی بھی ایسی چھوٹی موٹی ورزش جس سے آپ کی اعصابی توانائی بحال ہو جائے تو مراقبے کے زیادہ بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔

ہوسکتا ہے کہ جب آپ مراقبہ شروع کریں تو اپنے ذہن کی اندرونی آواز سے پریشان ہو جائیں لیکن فکر کی کوئی بات نہیں آپکا ذہن آہستہ آہستہ خالی ہو جائے گا۔ آپ اپنے مقصد پر سوچ مرکوز کر دیں اور اگر کسی چیز سے نجات چاہتے ہیں تو یہ الفاظ منہ سے کہیں جیسے "میں جلد ہی قرض سے نجات حاصل کرلوں گا" وغیرہ وغیرہ۔ آواز اتنی رکھیں کہ آپ کے کان بھی سن سکیں لیکن اگر آپ ہلکی آواز میں بولنا چاہتے ہیں تو بھی بول سکتے ہیں۔ دونوں کے نتائج ایک جیسے ہیں اور سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ آپ کی خصوصی توجہ اپنے سانس پر ہونی چاہیے۔

مراقبہ کیسے کیا جائے؟

1- مراقبہ کرنے کے لیے پرسکون اور آرام دہ جگہ کا انتخاب کریں جہاں کسی بھی قسم کا شور نہ ہو، تا کہ آپ کے تصور کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔ غیر آرام دہ اور چست کپڑے پہننے سے اجتناب کریں۔ ڈھیلے کپڑے پہن لیں جوتے اُتار لیں اور کسی آرام دہ جگہ پر ٹانگیں سیدھی کر کے بیٹھ جائیں۔ اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنی تمام توجہ سانس لینے اور خارج کرنے پر مرکوز کر لیں۔ جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیں۔

2- آہستہ آہستہ اپنے جسم کی طرف توجہ موڑ لیں۔ اپنے پاؤں سے اس کا آغاز کریں۔ مراقبے کے دوران یہ سوچیں کے اب پاؤں ہر قسم کی تھکن سے آزاد ہو رہے ہیں (یہ سوچ جسم کے آخری عضو تک رہے گی) پھر اپنی ٹانگوں کو اٹھا کر کے آلتی پالتی کے انداز میں بیٹھ جائیں۔ اب اگر آپ کسی بھی قسم کے تناؤ یا دباؤ کا شکار ہیں تو تصور کریں کہ سانس کے اخراج کے ساتھ آہستہ آہستہ یہ دباؤ بھی خارج ہو رہا ہے۔

3- مراقبے میں اپنے تصور کو پاؤں سے آہستہ آہستہ اوپر کی طرف لے جایا جاتا ہے اور سانس کے اخراج کے ساتھ جسم کے تمام اعضاء میں موجود دباؤ اور تناؤ کو بھی خارج کر دیا جاتا ہے۔ ٹانگوں سے گھٹنوں تک پنڈلی اور پھر سینے پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔ اس دوران گہرے سانس لینے کا عمل جاری رکھیں۔ ہر سانس کے ساتھ سینے کا پھیلنا اور سکڑنا ضروری ہے۔

4- اب اپنی سوچ اپنے ہاتھوں کی طرف موڑ لیں جو رانوں پر رکھے ہوئے ہیں۔ یاد رکھیں کہ اس دوران آپ کے ہاتھوں میں کسی قسم کی حرکت نہیں ہونی چاہیے آپ کی انگلیاں اور ہتھیلی ایک جگہ پر جمی ہوئی ہوں۔

5- ہاتھوں کے بعد بازوؤں کی طرف سوچ کو آہستہ آہستہ منتقل کرنا شروع کریں۔ اسی طرح بازوؤں سے کندھوں پر آ جائیں پھر گردن اور چہرے پر توجہ مرکوز کریں۔ پیشانی، ناک، گال، ہونٹ، کان، یعنی چہرے کے تمام خطوط پر الگ الگ توجہ مرکوز کرتے رہیں۔ سانس لینے کا عمل جاری رکھیں اور تصور کریں کہ توانائی آپ کے جسم کے تمام حصوں میں آرہی ہے۔ بہتر ین نتائج کے لیے یہ عمل تقریباً 15 سے 20 منٹ تک روزانہ ایک ہی وقت پر کریں۔ جب مثبت چیز سوچیں تو سانس اندر کی جانب لیں اور جب سانس باہر نکالیں تو منفی بات سوچیں۔

حافظ سعید

قاتل آن لائن

تفتیش کی گئی تو خاتون نے اعتراف کرلیا کہ انہوں نے ہیکر کی مدد سے اپنے شوہر کے اکاؤنٹ کو کھنگالا تھا۔ وہ اس بنیاد پر خلع لے رہی تھی کیونکہ ای میل اکاؤنٹ سے ٹھوس شواہد ملے تھے جو ان کے شوہر کے خلاف جاتے تھے۔ خاتون کو کسی قتل کا علم نہیں تھا ان کا کہنا تھا اپنا کام کروانے کے بعد اس نامعلوم ہیکر سے ان کا دوبارہ رابطہ نہیں ہوا۔

جدید دور کے مجرموں کی کہانی جو کمپیوٹر پر جنگ کرتے ہیں

عجیب [illegible] میرا بظاہر کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہماری دوستی، تعلیم، رہائش اور دلچسپیاں غرض کچھ بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ وہ سافٹ ویئر انجینئر جبکہ میں صحافت کے شعبہ سے منسلک تھا۔ ہمیں تقدیر کا چکر ایک دوسرے کے سامنے لے آیا تھا۔ ہوا کچھ یوں کہ میں جس اخبار میں ملازم تھا اس کے مالک نے دفتر تبدیل کرلیا تھا۔ ہم پہلے ایک خستہ حال عمارت کی چھٹی منزل پر دو مرلوں کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ پاکستان کے اکثر چھوٹے اخبارات ایک یا دو مرلوں کے دفاتر سے ہی جاری ہوتے ہیں۔ کئی کئی منزلہ عمارت اور متعدد دفاتر کی "عیاشی" بڑے میڈیا گروپس ہی کر رہے ہیں۔ بہرحال اخبار کے مالک نے ایک روز دفتر تبدیل کرنے کی "خوش خبری" سنا دی۔ موٹے سیٹھ کے پاس کہیں سے کافی

بھاری رقم آ گئی تھی۔ بظاہر اس نے یہی بتایا تھا کہ اس کا پرائز بانڈ نکلا ہے۔ یہ الگ بات تھی کہ سیٹھ نے دفتر تبدیل کرنے میں تو دلچسپی کا اظہار کیا لیکن ہماری دو ماہ کی تنخواہ کی ادائیگی کے حوالے سے اس کے پاس حالیہ نقصانات اور کاروبار میں مندے کی لمبی چوڑی فہرست موجود تھی۔ وہ ہمیں کچھ اس طرح اپنے نقصانات کا بتاتا تھا کہ کبھی کبھی تو ڈر لگنے لگتا کہیں تنخواہ دینے کی بجائے اُدھار ہی نہ مانگ لے۔ بہر حال نئی عمارت اور اچھے دفتر میں منتقل ہونے پر بھی ہم کافی خوش تھے۔ یہاں کم از کم ہم اپنے ''سورس'' اور دوستوں کو بلاتے ہوئے شرمندگی تو محسوس نہ کرتے۔ ہمارا اپنا دفتر ایک نئے تعمیر ہونے والے پلازے کی دوسری منزل پر تھا۔

اخبار کے نئے دفتر کے ساتھ ہی ایک درمیانے درجے کی سافٹ ویئر کمپنی کا دفتر تھا۔ مجیب اس کمپنی میں ملازم تھا۔ اکثر آتے جاتے میرا اس سے سامنا ہوتا تو ہم ایک لمحے کے لئے ایک دوسرے کا حال چال پوچھ لیتے۔ یہیں سے ہمارے درمیان اجنبیت کے پردے ختم ہوئے اور آہستہ آہستہ دوستی کا رشتہ قائم ہوتا چلا گیا۔ ہم پلازے کے نیچے چائے کی دکان پر اکٹھے ہوئے اور پھر دنیا جہان کے موضوعات پر گفتگو کرتے۔ وہ صحافت کے شعبہ سے بہت متاثر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صحافیوں کے تعلقات کا دائرہ کار بہت وسیع ہوتا ہے۔ جسے چاہیں ڈرا دھمکا سکتے ہیں اور ان کی ایک فون کال پر بڑے بڑے افسر فوراً کام کر دیتے ہیں۔ مجھے اس سے اختلاف تھا۔ اسی طرح میرا خیال تھا کہ سافٹ ویئر انجینئرز کی زندگی مزے میں ہے۔ بھاری تنخواہیں لیتے ہیں نہ فیلڈ ورک کا جھنجھٹ نہ تنخواہ کے مسائل، بس مزے سے دفتر میں بیٹھے کام کرتے رہے اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر گھر چلے گئے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے موقف تبدیل کروانے میں ناکام رہے اس کے باوجود ہماری گہری دوستی تھی اور ہم ایک دوسرے کے رازدان بنتے چلے گئے۔

ایک روز مجھے ہیکرز پر ایک فیچر لکھنا تھا۔ میں نے مجیب سے اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا، میرا خیال تھا کہ سافٹ ویئر انجینئر ہونے کے ناطے اس کی اس موضوع پر گرفت ہو گی اور مجھے اس سے آؤٹ آف ریکارڈ بھی بہت سی معلومات مل سکیں گی۔ جب میں نے مجیب سے اس سلسلے میں بات کی تو اس نے یہ بتا کر مجھے حیران کر دیا کہ وہ خود بھی ہیکر کے طور پر کام کرتا ہے۔ مجھے اسی سے معلوم ہوا کہ پاکستان میں بھی ہیکرز کا ایک وسیع نیٹ ورک موجود ہے۔ یہ مختلف ویب سائٹس، ای میلز اور دیگر ڈیٹا چوری کرتے ہیں اور متعلقہ افراد کو بیچ دیتے ہیں اسی طرح ہیکرز کا منظم گروہ مل کر بھی اہم ویب سائٹس پر حملے کرتا ہے۔ تعلیمی اداروں کے کمپیوٹرز تک رسائی حاصل کی جاتی ہے اور پیپرز آؤٹ کر دیئے جاتے ہیں۔ مجیب کے بقول ہیکرز بھی مختلف درجوں کے ہیں، کچھ ہیکرز حب الوطنی کے نام پر پاکستان مخالف ممالک کی سرکاری ویب سائٹس پر حملے کرتے ہیں اور وہاں پاکستانی جھنڈا گاڑ آتے ہیں۔ ردعمل میں ان ممالک کے ہیکرز بھی پاکستانی اداروں کی ویب سائٹس پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح کچھ ہیکرز صرف شوق شوق میں اس جانب آتے ہیں ان میں یونی ورسٹیوں کے طالب علموں کی تعداد زیادہ ہے یہ اپنے دوستوں کے ای میلز تک رسائی حاصل کرنے میں مگن رہتے ہیں۔ ہیکرز کا سب سے خطرناک گروہ ان پروفیشنل ہیکرز پر مشتمل ہے جو دولت کمانے کے لئے یہ کام کر رہے ہیں۔ مجیب کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا تھا وہ خفیہ طور پر لوگوں کو اپنی

خدمات فراہم کرتا تھا اور رقم منگوا لیتا۔ اس طریقہ واردات میں نہ وہ اپنے کلائنٹ کو ملتا اور نہ ہی کلائنٹ اسے ملتا تھا۔ یہ سارا نظام انٹرنیٹ کی مدد سے چل رہا تھا۔ مجیب کے گروپ میں بھی دنیا بھر سے ہیکرز شامل تھے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کو بھی فرضی ناموں سے ہی جانتے تھے۔ اس کے مطابق ہیکرز کے لئے پاکستان کسی جنت سے کم نہیں کیونکہ دیگر ممالک میں ہیکرز جلد پکڑے جاتے ہیں لیکن پاکستان میں ہیکرز کسی بھی انٹرنیٹ کیفے میں بیٹھ کر اپنا کام کر لیتے ہیں اور ان کی شناخت بھی چھپی رہتی ہے۔ اپنے کلائنٹ سے "فیس" منگوانے کا بھی ان کا خاص طریقہ کار تھا جس بارے میں اس نے مجھے کچھ بھی بتانے سے معذرت کر لی البتہ اس نے یہ "آفر" ضرور کر دی کہ اگر میں اکاؤنٹ کی معلومات حاصل کرنا چاہوں تو میرے لئے اس کی خدمات مفت ہوں گی۔

میں نے مجیب سے حاصل کی گئی معلومات کی بنیاد پر فیچر مکمل کر لیا لیکن اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ وہ کھل کر سامنے آ گیا۔ اب وہ مجھ سے اپنے نئے "پراجیکٹس" پر گفتگو کرنے لگا۔ بعض اوقات یہ باتیں انتہائی دلچسپی کی حامل ہوتی تھیں۔ ایک دن اس نے بتایا کہ اسے آن لائن ایک ایسی پیش کش ہوئی ہے جس میں خطرہ بھی نہیں ہے معاوضہ بھی زیادہ مل رہا ہے۔ ان دنوں وہ ہیکرز کے ایسے آن لائن گروپ کا حصہ تھا جہاں متعدد ہیکرز فرضی ناموں سے موجود تھے اور لوگ ان سے رابطہ کر کے کمپیوٹرز سافٹ ویئرز کے مسائل کا حل پوچھتے تھے۔ بظاہر اس گروپ کا یہی کام تھا کہ لوگوں کو کمپیوٹر کے مسائل حل کرنے میں مدد فراہم کی جائے لیکن اندرون خانہ یہ ہیکرز کا "بکنگ آفس" تھا۔ اسی گروپ میں ایک شخص نے مجیب سے رابطہ کیا۔ یہ شخص دراصل ایک خاتون تھی جو فرضی نام سے اس گروپ میں آئی تھی۔ اس کا تعلق اسی شہر سے تھا۔ ابتدائی معلومات کے مطابق تیس سالہ خاتون ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اہم عہدے پر فائز تھی اور شہر کے پوش علاقے میں رہتی تھی۔ اس نے مجیب سے اپنے شوہر کے ای میل اکاؤنٹ تک رسائی حاصل کرنے میں مدد مانگی اور اس خدمت کے عوض ایک لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا۔ اس کا شوہر بھی اسی کمپنی میں ایک درمیانے درجے کے عہدے پر فائز تھا۔ خاتون کو اپنے شوہر پر شک تھا کہ وہ دفتر کی ایک لڑکی میں دلچسپی رکھتا ہے اور معاملہ کافی آگے پہنچ چکا ہے۔

مجیب نے اس خاتون سے ڈیڑھ لاکھ میں معاملہ طے کر لیا۔ خاتون نے روایتی انداز میں کہا کہ اسے اپنے شوہر پر بھروسہ ہے اور وہ محض اپنی تسلی کے لئے اس کا اکاؤنٹ چیک کرنا چاہتی ہے۔ اس نے یہ شرط بھی رکھی کہ مجیب وہ اکاؤنٹ خود نہیں دیکھے گا بلکہ ڈی کوڈ کر کے اس کا پاس ورڈ تبدیل کر دے گا اور تبدیل شدہ پاس ورڈ خاتون کو بتا دے گا۔ یہ محض طفل تسلی تھی، مجیب اسے دھوکہ دے سکتا تھا، اس نے مجیب کو پچاس ہزار روپے ایڈوانس بھی بھیج دیے۔ عموماً ایسا نہیں ہوتا مجیب رقم لے کر غائب ہو سکتا تھا یہ بھی ممکن تھا اس نے خاتون کو فریب دیا ہو لیکن وہ اس پائے کا ہیکر ہی نہ ہو۔ بہر حال خاتون یا تو انتہائی مالدار تھی یا پھر اس نے اجنبی کو رقم دے کر جوا کھیل لیا تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ مجیب اس پایہ کا ہیکر تھا جو اس کا کام کر سکتا تھا۔

مجیب نے ایک ہفتے میں یہ "پراجیکٹ" مکمل کر لیا اور خاتون کو اس کے شوہر کے اکاؤنٹ کی پہلی ای میل بھیج دی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ مجیب اپنے مشن میں کامیاب ہو چکا ہے۔ خاتون نے باقی رقم بھیجی تو مجیب نے اسے نیا پاس ورڈ بتا دیا۔ اس کے ساتھ ہی ان دونوں کا رابطہ ختم ہو گیا۔ مجیب نے ہمیشہ کی طرح پراجیکٹ مکمل ہونے کے بعد وہ ای میل

اکاؤنٹ چھوڑ دیا اور نئے نام سے نیا اکاؤنٹ بنالیا۔ ایک ہفتے میں ڈیڑھ لاکھ روپے حاصل کر لینے پر وہ بہت زیادہ خوش تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ یہی کام شروع کر دے تو چند ماہ میں کروڑ پتی بن سکتا ہے کیونکہ پاکستان میں ہر دوسری خاتون کو اپنے شوہر پر شک رہتا ہے۔ بہر حال ایک آدھ ہفتے میں یہ واقعہ بھی پہلی کہانیوں کی طرح ماضی کا حصہ بن گیا۔

اس واقعہ کے ایک ماہ بعد ایک روز میں دفتر آیا تو ہمارے پلازے کے باہر پولیس اہلکار کھڑے تھے۔ انہیں سے معلوم ہوا کہ گزشتہ رات کسی نے مجیب کو تشدد کے بعد ہلاک کر دیا تھا۔ مجیب کی لاش اسی کے فلیٹ سے ملی تھی۔ اس کے دروازے کے پاس خون کے دھبے نظر آنے پر ہمسائے نے پولیس کو فون کیا اور جب پولیس نے دروازہ توڑا تو اندر مجیب کی لاش پڑی تھی۔ پولیس اس کے دفتر اسی قتل کی تفتیش کرنے آئی تھی۔ اس پولیس ٹیم کے ساتھ آنے والا سب انسپکٹر میرا واقف تھا۔ میں نے اسے ایک طرف لیجا کر بتا دیا کہ مقتول پروفیشنل ہیکر بھی تھا۔ لہٰذا اس جانب بھی غور کرنا کہ کہیں اس قتل کا تعلق اس کے اس کام سے نہ جڑا ہو۔ سب انسپکٹر کے دریافت کرنے پر میں نے اسے مجیب کے حالیہ چند "پراجیکٹس" سے بھی آگاہ کر دیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میری معلومات ناقص ہیں، ہیکنگ کی اس دنیا میں شناخت سے لے کر رابطے تک سبھی کچھ پردوں میں چھپا ہوتا ہے۔ اتفاق سے اس خاتون کی ملٹی نیشنل کمپنی کا نام یاد رہ گیا تھا جس نے اپنے شوہر کا اکاؤنٹ ہیک کروایا تھا۔ یہ محض ایک اشارہ ہی تھا کیونکہ ممکن تھا اس نے کمپنی کا نام بھی غلط بتایا ہو۔ بہر حال سب انسپکٹر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور اسے بھرتی ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس پر روایتی پولیس کا رنگ غالب نہیں آیا تھا۔ وہ اس کیس میں کامیابی کے لئے کافی محنت بھی کر رہا تھا۔ اس نے اس ملٹی نیشنل کمپنی میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ایسی خواتین کا پتہ کروایا جن کے شوہر بھی اسی کمپنی میں ملازم ہوں۔ یہ انتہائی مختصر سی فہرست تھی۔ اس فہرست میں ایک 40 سالہ ایسی خاتون کا نام بھی شامل تھا جنہوں نے حال ہی میں اپنے شوہر پر خلع کا کیس کیا تھا۔ سب انسپکٹر نے کڑیاں ملانی شروع کر دیں۔ خاتون سے تفتیش کی گئی تو انہوں نے اعتراف کرلیا کہ انہوں نے ایک ہیکر کی مدد سے اپنے شوہر کے اکاؤنٹ کو کھنگالا تھا۔ وہ اسی بنیاد پر خلع لے رہی تھی کیونکہ ای میل اکاؤنٹ سے ایسے ٹھوس شواہد ملے تھے جو ان کے شوہر کے خلاف جاتے تھے۔ خاتون کو کسی قتل کا علم نہیں تھا ان کا کہنا تھا اپنا کام کروانے کے بعد اس نامعلوم ہیکر سے ان کا دوبارہ رابطہ نہیں ہوا۔ میری معلومات بھی یہی تھیں کہ مجیب نے اس خاتون سے دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا۔

سب انسپکٹر کا کہنا تھا کہ مجیب نے اس خاتون کا کام ضرور کیا ہے لیکن یہ اس کے قتل کا سراغ لگانے میں معاون ثابت نہیں ہوا۔ اسی اندھے قتل کے سلسلے میں ایک روز سب انسپکٹر اور میرے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ دوست ہونے کی وجہ سے وہ مجھے صورت حال سے آگاہ رکھتا تھا اور میری بھی خواہش تھی کہ مجیب کے قاتل جلد از جلد پکڑے جائیں۔ اس روز اسی کیس پر گفتگو کرتے کرتے ایک نکتہ نے ہمیں چونکنے پر مجبور کر دیا۔ ریکارڈ کے مطابق خاتون کا شوہر آئی ٹی کے شعبے میں ملازم تھا۔ ایک خیال بجلی کی طرح ذہن میں کوندا۔ میں نے سب انسپکٹر کی توجہ اس جانب دلائی تو وہ بھی چونک اٹھا۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ اس نے خاتون کے شوہر کو باقاعدہ اس کیس میں گرفتار کر لیا ہے۔ تفتیش کچھ آگے چلی تو اس شخص نے قتل کا اعتراف بھی کر لیا۔

بظاہر قتل کا کیس اب حل ہو چکا تھا لیکن میرے ذہن میں کچھ باتیں کھٹک رہی تھیں۔ میں جیل میں اس قاتل کا انٹرویو کرنے چلا گیا۔ سب انسپکٹر اس کیس کو حل کرنے کا کریڈیٹ مجھے دیتا تھا۔ دوسرا اس کے ساتھ پرانی دوستی بھی تھی لہٰذا اس نے ملزم سے ملاقات کا اہتمام کر دیا۔ میں نے ملزم سے سوالات کیے کہ آخر اسے مجیب کا علم کیسے ہوا؟ مجیب انتہائی محتاط ہیکر تھا۔ سب انسپکٹر سے گفتگو کے دوران یہی خیال ذہن میں آیا تھا کہ خاتون کا شوہر آئی ٹی ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا ہے۔ اس لئے ممکن ہے اسے علم ہو چکا ہو کہ اس کے اور خاتون کے درمیان جھگڑے کی اصل وجہ کون بنا ہے، یہ محض ایک شک تھا جو بعد میں درست ثابت ہو گیا۔

ملزم نے انکشاف کیا کہ وہ خود بھی پروفیشنل ہیکر ہے۔ اس بات کا علم اس کی بیوی کو بھی نہیں تھا۔ وہ خاتون ویسے بھی شوہر سے برتر عہدے پر فائز ہونے اور صاحب ثروت خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اپنے شوہر کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی۔ بیوی کے اسی رویہ نے اس شخص کو اس سے بے وفائی پر مجبور کیا تھا۔ ملزم کے مطابق جب مجیب نے اس کے ای میل اکاؤنٹ میں گڑبڑ شروع کی تو اسے فوراً اس کا علم ہو گیا تھا، ہیکر ہونے کی وجہ سے وہ اس حرکت پر اشتعال میں آ گیا اور اس نے بھی جواباً گڑبڑ کرنے والے کی تلاش شروع کر دی۔ اسے اپنے اکاؤنٹ پر ناز تھا کہ اس کا پاس ورڈ کوئی نہیں توڑ سکتا۔ اس لئے اس کی تمام تر توجہ گڑبڑ کرنے والے کو ڈھونڈنے پر تھی۔ اسی دوران مجیب نے اس کا پاس ورڈ توڑ دیا اور اس کی بیگم کے حوالے کر دیا۔ ملزم کو معاملے کی سنگینی کا علم تب ہوا جب اسے معلوم ہوا کہ اکاؤنٹ تک رسائی اس کی بیگم کو دی گئی ہے۔ تب تک صورت حال اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ اس کے اکاؤنٹ میں کمپنی میں کیے گئے غبن سے لے کر اس کے معاشقوں تک کی تفصیلات موجود تھیں۔ بیوی اور اس کی دولت کے ساتھ ساتھ اسے نوکری بھی ہاتھ سے جاتی نظر آئی۔ اس صورتحال میں اسے مجیب اپنا سب سے بڑا دشمن لگنے لگا۔ دوسری جانب چونکہ یہ محض میاں بیوی کے اکاؤنٹ کا ''پراجیکٹ'' تھا اس لئے مجیب نے بھی بہت زیادہ احتیاط نہ کی تھی۔

وہ یہ کارروائی اپنے لیپ ٹاپ اور انٹرنیٹ کنکشن کی مدد سے کرتا رہا تھا۔ ملزم نے اس کا آئی پی ایڈریس ٹریس کر لیا۔ مجیب نے ای میل اکاؤنٹ تبدیل کر لیا تھا لیکن انٹرنیٹ کنکشن اور فلیٹ کا پتہ وہی تھا۔ ملزم نے کمپنی کے ایک اور آئی ٹی ایکسپرٹ دوست کو ساتھ ملایا ہوا تھا وہ دونوں مجیب کے فلیٹ تک پہنچ گئے۔ وہاں اسے قابو کرنے کے بعد انہوں نے اس پر تشدد کیا اور پھر کچن میں پڑی چھری گلے پر پھیر کر اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ملزم نے اپنے بیان میں جس ساتھی کا ذکر کیا اسے بھی پولیس نے گرفتار کر لیا تھا لیکن اس نے اس سارے واقعہ سے ہی لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ملزم کسی پرانے جھگڑے کی وجہ سے اسے بھی اپنے ساتھ پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی بدقسمتی تھی کہ مجیب کے دروازے کے پاس خون کے دھبے کے ساتھ ساتھ دروازے پر لگے خون کے نشان سے جو فنگر پرنٹ اٹھائے گئے وہ اسی کے ہاتھ کے تھے۔ پولیس نے دونوں ہیکرز کو قتل کے الزام میں گرفتار کر کے چالان عدالت میں بھیج دیا۔ ہیکرز کمپیوٹرز کی مدد سے جنگ لڑتے ہیں۔ یہ وائٹ کالر جرم کہلاتا ہے لیکن اس کہانی کے ہیکرز کمپیوٹر سے باہر آ کر درندے بن گئے تھے۔

عزت کا رکھوالا

نواز خان

عزت کا رکھوالا

نواز نان

''اس معاشرے کی کہانی جس میں عورت کو وہ حیثیت نہیں دی جاتی، جس کی وہ حق دار ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس خاص معاشرے میں وہ لوگ بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن کی غیرت عورت کیساتھ یہ سلوک گوارا نہیں کرتی۔''

1945ء کی بات ہے میرا تبادلہ امرتسر سے اٹاری کے علاقے میں ہوا تھا۔ میرے یہاں قیام کے دوران ایک ایسی واردات ہوئی تھی جو مجھے ابھی تک یاد ہے۔ میرے تھانے کے قریبی گاؤں برج میں شاید یہ پورا نام مجھے یہی یاد آتا ہے' قتل کی واردات ہوئی۔ زمیندار گوروبخشن سنگھ کی حویلی کی دیوار کے اندر کی طرف اس کے سوئے ہوئے دو بیٹے قتل کر دیئے گئے تھے۔ خنجروں سے ان پر حملہ کیا گیا تھا۔ اطلاع ملنے پر میں موقع واردات پر پہنچا تو لاشوں کے گرد گھر والے چیخیں مار رہے تھے۔ لاشوں کے گلے سے لے کر چھاتیوں کے درمیان تک زخم کی گہری لکیر تھی۔ قاتل نے بہت ہی وحشت سے کام لیا تھا۔ گوروبخشن سنگھ بڑی پہنچ والا سکھ تھا۔ جیسا کہ دیہاتی علاقوں میں کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی کو تحصیل جانے پر کرسی پیش کی جاتی ہے یعنی افسر اس کی قدر کرتے ہیں۔ اسی طرح گوربخشن سنگھ بھی افسروں سے یاریاں رکھنے والا آدمی تھا۔ جس وقت میں لاشوں کا معائنہ کر رہا تھا وہ بڑے حوصلے کے ساتھ اپنی رشتہ دار عورتوں کو سنبھال رہا تھا۔ اس کی پگڑی کھل کر گلے میں پڑی تھی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔ اندر سے تو اس کا کلیجہ پھٹ گیا ہوگا پر اوپر سے وہ برداشت والا آدمی نظر آ رہا تھا۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ گوربخش سنگھ افسروں سے یاریاں رکھنے والا آدمی تھا اور اس علاقے میں آنے کے چند دنوں بعد ہی مجھے اس کے شجرے کا پتہ بتا دیا گیا تھا پر اس میں جاگیرداروں والی روایتی قسم کی اکڑ نہیں تھی۔ میں موقع واردات پر پہنچا تو اس نے اپنی عورتوں کو وہاں سے ہٹا دیا اور خود زمین پر ہی بیٹھ گیا اس کے ہاتھ ایک لڑکے کی چارپائی کے پایوں پر رکھے ہوئے تھے اور گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میں نے اس کے ساتھ افسوس کیا وہ دھاڑیں مارنے لگا۔ میں نے اسے بغل میں ہاتھ دے کر اٹھایا اور کچھ فاصلے پر بچھی ہوئی چارپائی تک لے گیا۔ فوری کام تو لاشوں کا پوسٹ مارٹم کرانا تھا گوربخشن سنگھ نے کورا جواب دے دیا ''خان صاحب بنا شک کچھ نہ کرو۔ میں تاں مر مک گیا ہاں۔'' وہ اس علاقے کی ٹھیٹھ پنجابی میں کہنے لگا۔ ''آپاں خود دیکھ لواں گے۔''

وارث راضی نہ ہوں تو میں کبھی پوسٹ مارٹم پر

زور نہیں دیتا تھا مگر دہرا قتل تھا کارروائی ضروری تھی۔ یہ بہت ضروری ہوتا ہے پھر میں نے تو اپنی تفتیش کرنا تھی میں تھوڑی دیر لاشوں کا معائنہ کر کے اور نقشہ بنوا کر وہاں سے نکل آیا۔ پاکستان بننے سے پہلے یہاں کے انگریز پولیس افسر قتل اور ڈاکے کی واردات پر بہت سخت نظر رکھتے تھے۔ آج کل ہر طرح کا اسلحہ مل جاتا ہے اس زمانے میں ایسا نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ کارتوسی رائفلیں لوگوں کے پاس ہوتی تھیں۔ چاقو، خنجر، چھری اور ڈانگ یہی ہتھیار قتل، ڈاکے میں ساتھ ہوتے تھے۔ دیہی علاقوں میں چوری چکاری، پانی کی تقسیم پر لڑائی ہوتی اور لاشیں گرتی تھیں۔ زمینداری کرنے والے سکھ بھوتر جاتے تو دوہرے تہرے قتل ہو جاتے۔ میلوں پر شراب پی کر کیس کھول کر ناچنا، خرمستی اور دنگا فساد ہوتا تھا۔ سکھ نوجوان لڑکیاں اُٹھانے میں کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ اسے مردانگی اور منڈے کے جوان ہونے کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ جس گھر کا نوجوان سکھ لڑکی نکال لاتا اسے گھر والے لعن طعن نہیں کرتے تھے گھبرو ہونے پر فخر کرنے لگ جاتے۔ دوسرا گھر لاش گرانے کی تیاریوں میں لگ جاتا۔ پنچایتی فیصلے وقتی طور پر کام آتے تھے دلوں کی نفرت ہر روز بڑھتی جاتی تھی۔ گوربخش سنگھ کے گھر سے تھانے واپسی پر میں نے بیٹھ کر اطمینان سے سوچنا شروع کر دیا۔ گوربخش سنگھ ایک باوقار سکھ تھا۔ اچھے گھر بار والا سر پر سفید پگڑی ہوتی حالانکہ زیادہ تر سکھ کالی پگڑیاں باندھتے تھے۔ اس طرح اس کی نفیس طبیعت ظاہر ہوتی تھی۔ اس کا کسی سے جھگڑا تھا بھی تو اس کا چرچا نہیں ہوا تھا۔ سفید پگ خوبصورت تنی ہوئی سفید مونچھیں، سرخ چہرہ، پھرتیلا اور تھوڑا سا بھاری جسم، لمبا قد، پاٹ دار آواز، ایک بارعب آدمی تھا تین لڑکے تھے جن میں سے دو تو قتل ہو گئے تھے ایک باقی تھا۔ رگھوبیر سنگھ وہ بھی قد کاٹھ، مردانہ رعب والا باوقار تیس پینتیس سالہ نوجوان تھا۔ مجھے اس تھانے میں آئے ایک سال ہو چلا تھا اور میں نے علاقے میں کافی جان پہچان حاصل کر لی تھی۔

بلال شاہ میرے ساتھ ہی تھا۔ بیوی بچے اس کے امرتسر میں ہی تھے اور وہ ان سے مل کر آ جاتا تھا۔ میں نے اپنے مخبر بلائے اور ان میں سے ایک سے جو دوسروں سے زیادہ ہوشیار دکھائی دیتا تھا گوربخش سنگھ کے گھر کے بارے میں معلوم کیا۔ یہ کمی کمین سکھ تھا جو گوربخش کی زمینوں پر فصلوں کی کٹائی بھی کرتا تھا اور گھر کے کام کاج کے لئے حویلی بھی جاتا رہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ گوربخش سنگھ ہے تو کڑوے مزاج کا پر اس نے کبھی کسی کے ساتھ جبر زیادتی نہیں کی۔ البتہ اس کا بڑا بیٹا رگھوبیر سنگھ طبیعت کا سخت اور اُلٹے سیدھے کام بھی کر لیتا تھا۔ مزارعوں کو بے دریغ مارتا تھا اور اپنے جوان مرد ہونے کا ثبوت بھی دیتا رہتا تھا۔ انہی دنوں گاؤں کی ایک لڑکی بلوندکور کے ساتھ لمبے یارانے کے بعد اسے چھوڑ دیا تھا۔ بلوندکور جب اس کے ہاتھ چڑھی تھی تو دلبر سنگھ سانڈھو کی منگیتر تھی۔ دلبر سنگھ چار سال ہوئے گھر سے غائب تھا جب بلوندکور اور رگھوبیر کے تعلقات چھپے نہ رہے تو دلبر سنگھ گھر سے غائب ہو گیا پتہ نہیں اسے منگیتر کے زمیندار کے بیٹے کے ساتھ تعلقات پر دکھ ہوا تھا یا وہ برداشت نہ کر سکا کیوں کہ گوربخش سنگھ کے گھرانے سے ٹکر لینا آسان نہ تھا۔ اس لئے بے عزتی برداشت نہ کرتے ہوئے دلبر علاقہ ہی چھوڑ گیا۔ رگھوبیر جیسے زمینداروں کے لڑکے تو شادیوں کے چکر میں نہیں پڑتے انہیں شادی کے بغیر ہی لڑکیاں مل جاتی ہوں تو وہ بدکاریوں کے عادی ہو جاتے ہیں۔ بلوند اس کے دل سے اُتر گئی دلبر کا ماموں بھی گھبرو جوان تھا طبیعت کا اکھڑ اور ہتھ چھٹ تھا۔ اپنے بھانجے کی یہ خواری اور ذلت اس سے برداشت نہ ہوئی۔ اس

نے رگھوبیر سنگھ کو ایک دن موقع پا کر گھیر لیا۔ کرپان نکال کر رگھوبیر پر حملہ کر دیا۔ رگھوبیر بھی آپ نے دیکھ لیا ہے وہ بھی تگڑا آدمی ہے، اس نے اپنے ساتھ آنے والے بدمعاش قسم کے کامیوں کو ہاتھ اُٹھا کر حملے سے روک دیا اور اپنے نیفے میں اڑسا ہوا چاقو نکال کر حملہ آور کو وہیں ختم کر ڈالا۔ آپ سے پہلے یہاں کے تھانہ انچارج رگھوبیر کے دوست تھے ایک تو پولیس کا دبدبہ دوسرے گور بخشن سنگھ کی علاقے میں ٹوہر، اس معاملے پر مٹی ڈال دی گئی۔ سارے علاقے کو کان ہوگئے۔ اب تو گور بخشن سنگھ کے گھرانے کی عزت ایک اور وجہ سے بھی ہونے لگی۔ رگھوبیر سنگھ شریف باپ کا بیٹا ہوتے ہوئے بھی دہشت کی علامت بن گیا تھا۔

دلبر سنگھ کو غائب ہوئے چار برس ہوگئے ہیں رگھوبیر کی دلچسپی کم ہوئی تو بلونت کور کو بھی ہوش آ گیا اور پھر وہ دن اور آج کا دن اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ گاؤں والے سارے یہ بات جانتے ہیں پر کسی کو کہنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

میں نے اس مخبر سے کہا کہ وہ اردگرد نظر رکھے اور یہ معلوم کرے کہ اس قتل میں دلبر سنگھ کا کوئی ہاتھ ہے یا نہیں۔ مخبر کو فارغ کر کے میں ایک بار پھر گور بخش کی حویلی چلا گیا۔ جس جگہ چارپائیوں پر لاشیں پڑی تھیں وہاں زمین پر خون کے چھینٹے تھے۔ حویلی کی باہر والی دیوار پکی ضرور تھی لیکن اس پر گرد کی تہہ جم چکی تھی۔ اس پر دو جگہ ساتھ ساتھ پیروں کی رگڑ کے نشان تھے۔ پھر بھی ان میں اتنا فاصلہ ضرور تھا کہ دونوں ایک آدمی کے پیروں کے نشان نہیں ہو سکتے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ حویلی کے اندر ایک نہیں دو آدمی اُترے تھے۔ ان دونوں میں سے ایک نے یا پھر دونوں نے الگ الگ قتل کیا تھا۔ ان کی واپسی بھی اسی طریقے سے ہوئی تھی۔ میں نے گور بخشن سے چند سوال کئے اور اس کے بیٹے رگھوبیر سنگھ سے ملاقات کی خواہش کی۔ گور بخشن نے ایک نوکر کو اشارہ کیا جو تھوڑی دیر بعد رگھوبیر کو بلا لایا۔ رگھوبیر نے اندر آ کر مجھے ایک نظر دیکھا اس کی آنکھوں میں میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں تھی پر وہ غضب کا ایکٹر تھا۔ ایک دم میری طرف بڑے پیار سے جھکا یوں ظاہر کیا کہ اسے بھائیوں کے قتل کا بڑا دُکھ ہے اور میری مدد پر ہی بھروسہ کر رہا ہے۔ اس نے میرے گھٹنے چھونے چاہے میں نے اس آدھے جھکے ہوئے کو ہی کندھوں سے پکڑ لیا۔ میری ہی عمر کا جوان تھا مجھے شرم محسوس ہوئی رگھوبیر میرے گلے لگ گیا۔ اس کا باپ اپنے کُرتے کے ایک کونے سے آنکھیں صاف کر رہا تھا۔ رگھوبیر نے میرے کان سے اپنا منہ لگاتے ہوئے سرگوشی کی۔ انسپکٹر خان میں کل خود تھانے آ کر بات کروں گا اس وقت خاموش ہی رہو تو بہتر ہے۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے خود سے ہٹایا اور اس کے بازوؤں پر دونوں ہاتھ رکھے رکھے اس کی آنکھوں میں بڑی سختی سے دیکھا جب بھی اس طرح کی بات میں نے جس منہ سے سنی تھی وہ منہ میرے مکوں کی وجہ سے شناخت کے قابل نہیں رہتا تھا۔ مگر میں نے پتہ نہیں کیوں اس نوجوان کا لحاظ کیا جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے وہ بڑا غضب کا ایکٹر لگتا تھا۔

ایک دم اس کے چہرے پر تیمی برسنے لگی۔ اس نے فوراً میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ میں نے اس کے ساتھ تعزیتی رسمی جملے بولے اور تھانے واپس آ گیا۔ مجھے اس کی تھانے آمد کا شدت سے انتظار تھا۔ میری طبیعت سخت الجھی ہوئی تھی میں نے اس مخبر کو بلوایا جو مجھے گور بخشن کے اس بیٹے کی کہانی سنا چکا تھا۔ اسی دوران محرر ایک ادھیڑ عمر آدمی کو اپنے کمرے سے نکال کر میری طرف لایا۔ محرر کے ہاتھ میں ایک بٹوہ تھا میرے پاس آ کر اس نے سلام کیا اور بتایا کہ یہ جیب کترا ٹانگوں والے اڈے سے کل پکڑا گیا ہے۔

پہلے کسی آدمی کی جیب کو رگڑ چکا تھا اور اب ایک دوسرے آدمی کو سلائیاں پھیرنے لگا تھا کہ مالک نے پکڑ کر اسے پولیس کے سپاہی کے حوالے کردیا جو اسے تھانے لے آیا۔ رات میں نے حوالات میں رکھا تھا۔ یہ جیب تراش خاصا پرانا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اس فن میں عمر گالی ہوئی تھی۔

جیب تراشوں کی دنیا بڑی دلچسپ ہے۔ قیام پاکستان سے قبل یہ بڑے فنکاروں کا پیشہ تھا۔ وہ لوگ اس کام کے اتنے ماہر تھے کہ آدمی کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتے تھے کہ اس کے پاس کتنی رقم ہے۔ جیب کترا شکار کا پیچھا شروع کردیتا تھا اور شکار ہوشیار ہوتا تو ناکام رہنے والا جیب کترا اسے اپنی حدود سے باہر نکلتا دیکھ کر اسے دوسرے جیب کترے کے ہاتھ فروخت کردیتا تھا جو اسے اپنی حدود کے اندر شکار کرلیتا تھا۔ لکڑ لگانا' بلیڈ سے بٹوا اور بیگ کی صفائی کرنا ہوتا ہے۔ جیب کترے اپنی ہاتھوں کی انگلیوں کو سلائیاں کہتے ہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے ہاتھوں سے کوئی جیب محفوظ نہیں ہوتی۔ قمیض کی سینہ والی جیب' کھیسہ' کوٹ کی اندرکی دائیں طرف والی جیب ان کے لئے بہت آسان ہوتی ہیں۔ جن آدمیوں کے کندھوں پر پٹکا اس طرح رکھا ہو کہ کُرتے کی اوپر والی جیب ڈھکی ہو وہ بھی آسانی سے جیب کٹوا لیتے ہیں جس آدمی نے چادر اوڑھی ہو وہ بھی آسان شکار ہوجاتا ہے۔ جس آدمی نے رقم سلوکے میں ڈالی ہو اور قمیض پہنی ہو اور قمیض کا پچھلا حصہ نیچے لے کر بیٹھا ہو اس کی سلوکے کی جیب میں ہاتھ ڈالنا مشکل ہوتا ہے۔ بعض استاد تو نوٹ نکالنے کے بعد کاغذ بھی شکار کی جیب میں رکھ دیتے ہیں کہ اگر سفر کے دوران جیب ٹٹولے تو اسے احساس نہ ہو کہ جیب کٹ چکی ہے۔ سلوکے کی جیب میں پیسے رکھ کر اوپر سے قمیض پہننے اور اس کا پچھلا حصہ نیچے لے کر بیٹھنے والے مسافر سے کہتے ہیں کہ میاں جی ذرا شیشہ کھول دیں یا اس کے پاؤں کے پاس پیسے گرادیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ذرا اٹھیں میں پیسے آپ کے پاؤں سے اٹھالوں۔ جب مسافر ذرا سا اٹھتا ہے تو اس کی قمیض پیچھے سے نکال دیتے ہیں اور پھر اس کے سلوکے تک لکڑ بلیڈ لے جانا آسان ہوجاتا ہے۔ عام طور پر یہ بھیڑ والی جگہوں میں کام کرتے ہیں جہاں لوگ جلدی یا رش کی وجہ سے بوکھلائے ہوتے ہیں۔ میں آپ کو جیب کتروں کی باتیں سنانے لگ گیا ہوں۔ محرر جس جیب کترے کو پکڑ کر میرے پاس لایا اس کے پاس بٹوے میں کچھ نوٹ اور لڑکی کی ایک تصویر بھی تھی۔ میں اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہا تھا کہ جس مخبر کو بلوایا تھا وہ آ گیا۔ میرے ہاتھوں میں تصویر دیکھ کر وہ چونک گیا۔ جناب یہ تصویر تو بلونت کور کی ہے۔ اس نے بس اتنا ہی کہا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے ذہن میں جیسے گھنٹی بج گئی۔ میں نے جیب کترے کو گھورا ''اوئے تم نے جس آدمی کی جیب سے یہ بٹوہ اُڑایا ہے اس کا ذرا حلیہ بتاؤ اور وہ کہاں تھا؟''

جیب کترے نے پتہ نہیں میری اس بات کا کیا مطلب لیا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہوگا کہ جیب کٹوانے والا میرا یار دوست یا عزیز ہوگا وہ میرے پیروں پر گر گیا۔

''جناب معاف کریں' غلطی ہوگئی ہے مجھے تو پتہ نہیں تھا کہ......''

میں نے اُٹھ کر اسے پرے دھکیلا۔ اگر یہ تصویر والا بٹوہ دلبر سنگھ کا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنی پراسرار گمشدگی کے بعد واپس آ گیا ہے اور اس نے اپنی منگیتر کے خوار ہونے کا بدلہ لینے کی خاطر رگھوبیر سنگھ کے بھائیوں کو قتل کیا ہے۔ میں نے تھانے کے صحن میں کھڑے کھڑے محرر سے کہا کہ اس جیب کترے کے ساتھ دو کانسٹیبل میرے ساتھ کرو ہم نے تانگوں کے اڈے کی طرف جانا ہے۔ میں نے

جیب کترے کو جھنجوڑا ''بٹوہ تم نے کب نکالا تھا؟'' ے
وہ بولا، ''کل صبح سویرے ہی۔ لیکن نکالا نہیں اور جس کا تھا بڑا ہوشیار تھا۔ میں نے اپنا حلیہ بدل رکھا ہے پر لگتا ہے کہ وہ مجھے پہچان چکا تھا اس لئے کہ میں بھی اسی کے گاؤں کا رہنے والا ہوں اور وہ بھی دیکھا بھالا لگ رہا تھا، وہ جان بوجھ کر مجھے موقع دے رہا تھا کہ میں اس کی جیب کاٹ لوں ایسا شکار دیکھ کر تو ہمارے ہاتھ میں کھجلی ہونے لگتی ہے جو خود ہی موقع بھی دے رہا ہو۔ بہرحال مجھے شک نہیں تھا وہ دلبر ہی ہے بلکہ یقین ہوگیا تھا میں نے اسے پوچھ لیا کہ تم دلبر ہو؟ اس نے مجھے گلے سے لگا لیا اور کہنے لگا بڑی دیر بعد ملے ہو گاؤں کا حال وغیرہ بتاؤ۔ وہ مجھے تانگوں والے اڈے میں جیرے کے ہوٹل میں لے گیا اور کھانا لانے کا کہا۔ جب ہم ہوٹل کے اندر جا رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ تھوڑے فاصلے پر ایک فوجی جیپ کھڑی ہوئی ہے جس میں سفید کپڑوں میں دو اور آدمی بیٹھے جو حلئے سے سکھ نہیں تھے دلبر نے ان دونوں کی طرف ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا اور ہوٹل کے دروازے پر رک گیا۔ دونوں جیپ سے اتر کر آگئے۔ دلبر نے ان میں سے ایک کو کہا کہ صبح دن چڑھنے سے پہلے یہیں آ جانا۔ وہ آدمی مسکرایا اور بولا دھیان سے کام کرنا۔ دلبر مجھے ہوٹل لے گیا اور پھر ہم کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے بعد میں پیسے دینے کا خیال کر کے جیب میں ہاتھ مارنے لگا تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے ایک آدمی کی جیب صاف کی تھی دلبر نے مجھے [illegible] بٹوہ نکال کر کہنے لگا میں ذرا ہاتھ صاف کر لوں تم اس میں سے پیسے نکالو۔ بس جی وہاں مجھ سے غلطی ہوئی۔ دلبر غسل خانے میں جا کر واپس آیا اور مجھے گردن سے پکڑ کر [illegible] بٹوہ میرے ہاتھ میں تھا لوگ جمع ہوگئے اور وہ مجھے ان کے حوالے کر کے وہاں سے نکل گیا۔ ان آدمیوں میں سے ایک نے میرا بازو پکڑا اور یہاں تھانے چھوڑ گئے۔ حیران ہوں کہ آخر دلبر کو مجھ سے کیا دشمنی تھی اور مجھے اس نے اندر ہی کرانا تھا تو بٹوہ کیوں مجھے دے گیا؟ شاید وہ ثبوت میرے پاس رکھنا چاہتا تھا؟''

جو بات اس جیب کترے کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی میں سمجھ چکا تھا۔

دلبر یہاں واردات کرنے آیا تھا۔ تانگوں کے اڈے پر اس جیب کترے نے اسے پہچان لیا دلبر کو ڈر تھا کہ شاید یہ دشمنی جانتا ہے اس لئے رگھوبیر سنگھ کو نہ جا کر بتا دے اس لئے اس نے نہایت چالاکی سے اسے تھانے بھجوا دیا اور رات کو واردات کر گیا۔ میں نے محرر سے کہا کہ جیب کترے کو حوالات میں بند کر دو۔

اگلے دن میں امرتسر چھاؤنی جا پہنچا جیب کترے کے بیان سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ دلبر کے ساتھی ایک فوجی جیپ میں تھے۔ ان دنوں کسی عام آدمی کے پاس جیپ کا کیا کام؟ آج کل تو فوجی رنگ کی جیپیں بھی عام آدمیوں کے پاس نظر آ جاتی ہیں۔ ان دنوں اس کا سوال ہی نہ تھا۔ چھاؤنی میں کس یونٹ میں جانا ہے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ بلال شاہ نے کہا کہ اس کا ایک واقف کار سپاہی ہے وہ اٹاری کا ہی رہنے والا ہے امرتسر چھاؤنی میں ہی پیدل فوج کی بارکوں میں رہتا ہے۔ ہم اس کے پاس آ گئے۔ برج میں اس کی ماں کی بہن رہتی تھی اور وہ اکثر وہاں جا چکا تھا۔ ہم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ ہم کس کام سے آئے ہیں۔ بلال شاہ نے صرف اس سے ملنے کا بہانہ کیا تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے ظاہر کر دیا کہ اٹاری کے بہت سے جوان اسی چھاؤنی میں ہیں اور برج کا دلبر سنگھ تو اس کی یونٹ کے میجر کا جیپ ڈرائیور ہے۔ میں نے اس سے یونٹ کا اتہ پتہ اور میجر کا نام باتوں باتوں میں معلوم کر لیا۔ میجر مسلمان تھا۔ پوٹھوہار کے علاقے کا تھا بہت دلیر مشہور تھا۔ اس سپاہی نے ہماری بڑی مہمان نوازی

کی اور باہر اڈے تک ہمیں چھوڑنے آیا۔ ہم نے اسے اندھیرے میں رکھا۔ وہ اڈے سے گیا اور ہم واپس چھاؤنی پہنچ گئے۔ اس یونٹ کا دفتر بند تھا پتہ چلا کہ میجر صاحب ٹینس کورٹ میں ملیں گے۔ ایک سپاہی ہمیں راہ دکھانے ساتھ ہوگیا۔ ٹینس کورٹ میں میجر سے ملاقات ہوئی میں نے اپنا تعارف کرایا اور پوری بات بتانے کے بعد شک ظاہر کیا کہ دلبر واردات کرکے دوبارہ ڈیوٹی پر حاضر ہوگیا ہے۔ ٹینس کورٹ کے کنارے پڑی کرسیوں پر ہم لوگ بیٹھ گئے۔ بیرے نے میجر کے سامنے پانی لا رکھا اور پسینہ خشک کرنے کے لئے تولیہ دیا۔ میجر نے تولیہ ایک بار اپنے منہ پر پھیرا اور پھر یکایک غصے میں آ کر زمین پر دے مارا اور میری طرف چہرہ کرکے کہنے لگا، خان صاحب دلبر واردات کے لئے گیا تھا یا نہیں پر وہ مرد آدمی ہے اور مرد ہی یہ کام کرتے ہیں۔'' میجر کا رویہ بڑا فرعونی قسم کا تھا۔ تقسیم سے قبل فوجی افسر خود کو بڑی اچھی طرح پولیس کے مقابلے میں اعلیٰ سمجھتے تھے۔ میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا کہ میجر صاحب مجھے کمزور خیال نہ کریں اول تو مجھے چھاؤنی کے کمانڈنگ افسر کے پاس جانا چاہئے تھا وہ خود ہی تحقیق کرلیتا پر میں نے سوچا کہ چلو آپ سے ہی بات کرلوں لیکن آپ سیدھی بات نہیں چاہتے تو میں کمانڈنگ افسر سے بات کرلیتا ہوں۔ میں نے اندھیرے میں ہی تیر چلایا تھا حالانکہ کمانڈنگ افسر کے پاس جانا ہوتا تو پہلے میں باقاعدہ الف آئی آر درج کرتا پھر اپنے ایس پی تک کاغذی کارروائی پہنچاتا پھر فوجی افسر تک بات جاتی اور انکوائری کے بعد ہی دلبر کو ہماری تحویل میں دیا جاتا لیکن میجر میری باتوں میں آ [illegible] کہنے لگا ٹھیک ہے آپ کا شک صحیح ہے۔ یہ بھی تو دیکھیں اس کے ساتھ خود کتنا ظلم ہوا ہے یہ وہ ظلم کرنے والے کو جواب نہ دیتا۔ میں نے کہا میجر صاحب خلافِ قیت پر

پھر کبھی بحث کرلیں گے، مجھے دلبر سے ملوائیں۔ میجر نے اسی بیرے سے کہا کہ جاؤ ڈرائیور کو اس کے کوارٹر سے لاؤ۔ بیرہ چلا گیا اور ہم ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ بیرہ کچھ دیر بعد ہی واپس آیا لیکن دلبر کے بغیر اس نے بتایا کہ دلبر کا کوارٹر خالی پڑا ہے ایسا لگتا ہے وہ یہاں سے بھاگ ہی گیا ہے۔

میں سمجھ گیا کہ میرے ساتھ یہ لوگ ڈرامہ کررہے ہیں۔ آج کل تو پتہ نہیں کیا حال ہے لیکن تقسیم سے پہلے کی بات یہ ہے کہ جن فوجی سپاہیوں کی اپنے علاقوں میں دشمنیاں ہوتی تھیں وہ خود یا ان کے گھر والے انہیں فوج میں بھرتی کروادیتے تھے۔ تاکہ وہ علاقے سے نکل جائیں اور ان کی جان بھی محفوظ رہے جس طرح وہ میجر دلبر سنگھ کی طرفداری کررہا تھا اس سے میرا یقین ہوگیا کہ دلبر سنگھ گاؤں سے غائب ہوکر فوج میں بھرتی ہوگیا ہے۔ اس میجر کا ڈرائیور تھا۔ اس نے میجر کو اپنی مظلومیت کی کہانی سنائی اور اس نے ہمدردی میں اس کا پورا ساتھ دیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس نے یونٹ میں اسے حاضر دکھایا ہو اور اسے وہاں سے کھسکا دیا ہو کہ جاؤ واردات کرکے واپس آجاؤ۔ اس سے پہلے کئی ایسی وارداتیں ہوچکی تھیں کہ فوجی جوان رات کو بیرکوں سے نکلا اور اپنے مخالفوں کو ٹھکانے لگا کر صبح یونٹ میں واپس آگیا۔ اس کے ساتھی اور افسر اسے تحفظ دیتے تھے۔ فوجی سیدھے اور بااصول ہوتے ہیں وہ قانونی چکر میں پڑ کر انصاف نہیں مانگتے ظلم کرنے والے کے اندر اپنے ہاتھ سے گولی اتارتے ہیں۔ جیپ کترے نے بتایا تھا کہ دلبر کے ساتھ فوجی جیپ میں دو اور آدمی تھے۔ وہ یقیناً اس کے ساتھی ہوں گے ہوسکتا ہے میجر کو بھی پتہ ہو لیکن میں کاغذی کارروائی کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

میں اور [illegible] شرہ وہاں سے نکلے اور میں سیدھا ایس ایس پی کے پاس پہنچ گیا کچھ دیر انتظار [illegible]

بعد اس کے دفتر میں جانے کی اجازت ملی۔ ایس ایس پی رام سنگھیا بڑا سخت گیر افسر تھا۔ علاقے کے تھانیداروں کو ذاتی طور پر جانتا تھا اور یہی اس کی اچھی افسری کا راز تھا۔ میں نے سلام کیا اس نے مسکرا کر جواب دیا اور رسمی باتوں کے بعد میں نے تمام کہانی اس کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا اور پھر فون اُٹھا کر فوج کے ایریا کمانڈر سے بات کرنے لگا۔ تقسیم سے قبل فون کی یہ سہولت بڑے بڑے افسروں تک ہی محدود تھی۔ فون بند کر کے ایس ایس پی نے کہا کہ مجھے رپورٹ مل جائے گی تم اس قتل کی پوری تفتیش کرو تم پر کوئی دباؤ ہو تو مجھے بتانا۔ پھر وہ مسکرایا ”تم ویسے بھی ذمہ دار آدمی ہو مجھے پتہ ہے کہ تم وہی کرتے ہو جو تمہارے دماغ میں آتی ہے۔“ میں اُٹھ کھڑا ہوا، اسے سیلوٹ کیا اور ہم واپس اپنے تھانے آ گئے۔ مجھے یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ دلبر چھاؤنی میں نہیں اس نے جو کام کرنا تھا کر کے اب فرار ہو چکا ہے دیکھنا یہ تھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ اسے زمین کے اندر سے بھی نکال لاؤں گا۔ وہ پولیس کے لئے بھی مفرور تھا اور خود فوج کے لئے بھی بھگوڑا تھا۔ میں نے دلبر سنگھ کے گھر کے باہر مخبر لگا دیئے اور رگھوبیر اور بلوندر کے عشق کے بارے میں بتانے والے مخبر سے کہا کہ دلبر کے دو ... رشتہ داروں کی ٹوہ لگائے۔ میرا تجربہ ہے کہ ... مفرور ہونے والے مجرم اپنے کسی نہ کسی رشتہ دار سے ضرور رابطہ کرتے ہیں اور کسی سے ملتے بھی ضرور ہیں۔ ... سنگھ نے چھاؤنی سے بھاگنے کے بعد پہلا رابطہ اپنے چچا ہری ... کے ساتھ کیا مخبر بہت چالاک ... نے ملاقات کا وقت بھی جان لیا تھا۔ یہ ملاقات ... وں سے باہر رات کے وقت ویران کھوہ پر ہونی ... کے لئے ... دن تھا جس دن مخبر اطلاع ... شام ڈھلتے ہی میں اور بلال شاہ دیہاتی لباس میں اس کھوہ کے ویران ... کے ساتھ والے لہسن کے کھیت میں جا چھپے۔

لہسن کی فصل زیادہ اونچی نہیں ہوتی ... پر بیٹھا ہوا آدمی بھی نظر آ جاتا ہے۔ اس لئے ہم فصل کے اندر نیم ... راز تھے۔ کافی اندھیرا ہونے کے بعد ایک آدمی اس کھوہ کے کجاوے کی طرف بڑھا۔ مخبر کو میں نے اپنے مخالف سمت والے کھیت میں لٹایا ہوا تھا شناخت اس نے کرنا تھی۔ میں نے تو دلبر سنگھ یا اس کے چچا کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ آدمی کجاوے میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہ وہ جگہ ہوتی ہے جہاں کھوہ سے نکلنے والا پانی ایک نالی کے ذریعے گرایا جاتا ہے چونکہ وہاں مرد عورتیں نہا لیتے ہیں اس لئے ارد گرد چھوٹی چھوٹی دیواریں بنا دی جاتی ہیں۔ میں نے اور بلال نے کجاوے کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ ابھی تک اندر ایک ہی آدمی تھا جب تک دوسرا نہ آ جاتا ہم نے خاموش رہنا تھا۔ ہمیں تھوڑا ہی انتظار کرنا پڑا دوسرا آدمی بھی ادھر ادھر دیکھتا چلتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ کجاوے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور کسی جنگلی جانور کی طرح ہوشیاری سے ادھر ادھر دیکھ کر ایک دم اندر داخل ہو گیا۔ میں اور بلال اپنی جگہ سے اچھلے اور چھلانگیں مارتے کجاوے کی ٹوٹی ہوئی اینٹوں والے دروازے میں گھس گئے۔ دونوں آدمی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے تھے ہمارے اس طرح اوپر جا گرنے سے ان میں سے ایک خوف سے تھرایا۔

دلبر تھا یا اس کا چچا مجھے نہیں معلوم میرا ایک گھونسہ میرے سامنے والے آدمی کی گردن پر پڑا۔ وہ دوہرا ہو گیا۔ دوسرے کو بلال شاہ نے چھاپ مارا ہوا تھا۔ بلال شاہ کا جن جپھا تو بڑا مشہور تھا۔ اس کے شکنجے سے نکلنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے زور سے مخبر کو آواز دی وہ کانپتی ٹانگوں سے کجاوے کے باہر کھڑا تھا۔ اس نے بلال شاہ کے شکنجے میں آئے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا یہی دلبر سنگھ ہے۔ ... شاہ نے جپھا چھوڑا اور ... شروع ... اس قدر وحشت ... تحرک ... ہوئے میں نے ... آج تک نہیں دیکھا تھا۔ میں نے بڑی مشکل ...

قابو کیا۔ میں نے سروس ریوالور نکال لیا اور دلبر سنگھ اور اس کے چچا سے کہا کہ ہمارے آگے چلو۔ ہم دونوں کو تھانے لے آئے۔ جیب کترے کو حوالات سے نکال کر دلبر کے سامنے کھڑا کیا تو دلبر نے سر جھکا لیا۔

تھانے میں دلبر نے زیادہ ہوشیاری نہیں دکھائی۔ اسے کھوہ پڑی بابا لال شاہ کے غنڈوں کا تجربہ ہو گیا تھا۔ اس نے مزید ... بغیر بتانا شروع کر دیا۔ ''میرے چچا کی بیٹی بلوندر کور میری منگ بننے سے پہلے ہی مجھے پسند کرتی تھی اس نے میرے ساتھ یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ اس کی شادی ہو گی تو صرف میرے ساتھ۔ چاچا کے پاس زمین نہیں، دوسروں کی زمینوں پر محنت مزدوری کر کے گزارہ کرتا تھا۔ ایک دن چاچا کی روٹی لے جاتے ہوئے رگھوبیر نے اسے دیکھا اور اس کے بعد اس نے میرے چاچا پر مہربانیاں شروع کر دیں۔ اسے لالچ دیا کہ اپنی بیٹی کو حویلی میں کام کے لئے بھیج دے رگھوبیر کی نیت اچھی نہیں تھی۔ چاچا نہ مانا پر رگھوبیر نے پیچھا نہ چھوڑا اور مجبور کرتا رہا۔ ایک سال یونہی ہوتا رہا۔ لے دے کر ماموں کا آسرا تھا میں اس کے مویشیوں کی دیکھ بھال کرتا تھا چھوٹی موٹی چوری چکاری اور رسہ گیری کر لیتے تھے۔ باپو کے مرنے کے بعد گھر کی حالت پتلی ہوئی تھی۔ بلوندر بھی رگھوبیر کی طرف سے سخت تنگ تھی۔ وہ اسے قتل کر یہ کہنے لگا تھا کہ وہ اس کی حفاظت میں آ جائے اسے خوش رکھے گا دلبر جیسے نتھرئیے سے اسے کیا ملے گا۔ آپ جانتے ہیں جی غریب آدمی کمزور ہوتا ہے۔ رگھوبیر کو میں قتل تو کر سکتا تھا کسی اور طرح اس سے ٹکر نہیں لے سکتا تھا۔ قتل اس لئے نہ کیا کہ پھانسی لگ جاؤں گا۔ بلوندر اور ماں دونوں ہی برباد ہو جائیں گی کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کروں۔ آخر تنگ آ کر گھر سے نکل گیا۔ پر گاؤں کے حالات کسی نہ کسی آدمی سے معلوم ہوتے ہی رہتے تھے۔ مجھے ماما کے قتل کا بڑا دکھ ہوا۔ زیادہ تکلیف اس بات سے بھی ہوتی کہ بلوندر اب رگھوبیر کی رکھیل بن گئی تھی۔ عورت ذات تھی کہاں تک میرا انتظار کرتی میں امرتسر میں فوجی بھرتی کے دفتر جا پہنچا۔ میری صحت اچھی تھی مجھے بھرتی کر لیا گیا۔ میں نے ڈرائیونگ کا کام سیکھا اور کئی افسروں کے ساتھ ڈیوٹی پر رہا۔ ایک میجر صاحب مجھ پر مہربان ہو گئے میری صحت کی بڑی تعریف کرتے۔ میں دن رات انتقام کی آگ میں جل رہا تھا میں نے میجر صاحب کو بلوندر سے بچھڑنے اپنے ماما کے قتل اور رگھوبیر کی بدمعاشیاں سب کچھ سنایا۔

میجر نے مجھے انتقام سے باز رہنے کی بڑی نصیحت کی۔ پر اب میں وہ بھوکا ننگا دلبر نہیں تھا۔ فوج کی روٹی ملتی تھی جیب میں پیسے تھے اس طرح انتقام روح سے اُترتا ہی نہیں تھا۔ میجر صاحب نے جب دیکھا کہ میں بدلہ لئے بغیر نہیں رہ سکتا تو انہوں نے میری مدد کی حامی بھر لی اور وعدہ کیا کہ تمہیں جیپ اور اسلحہ دوں گا اور چھاؤنی کے ریکارڈ میں تمہیں حاضر رکھوں گا۔ آگے تمہارا کام اور زندہ میرے پاس واپس آ جانا۔ کچھ روز بعد میجر صاحب نے ایک جیپ اور دو جوان میرے ساتھ کئے میرے ساتھیوں کے پاس دو نالی بندوق بھی تھی، پر میں نے بندوق والا معاملہ صحیح نہیں سمجھا۔ رگھوبیر نے میرے ماما کو چاقو مارا تھا میں نے بھی چاقو ہی رگھوبیر کے جسم میں اُتارنا تھا۔ جیپ میں ہم شہر آ گئے۔ تانگوں والے اڈے پر ایک ہوٹل میں اپنے ساتھیوں کو کھانا کھلایا اور باہر نکلے۔ میرے ساتھی جیپ کی طرف چلے گئے ہمارے گاؤں کا ایک سنار جو جیب تراشی کرتا ہے مجھے نظر آ گیا۔ اس نے اپنا حلیہ بدلا ہوا تھا پر میں نے اسے پہچان لیا۔ مجھے ڈر ہوا کہ یہ کہیں رگھوبیر کے آدمیوں کو نہ بتا دے اور وہ ہوشیار ہو جائیں۔ گاؤں سے اتنا عرصہ بھاگے رہنے کے بعد بھی لوگ مجھ پر بہت شک کرنے لگے تھے اور ہوشیار رہتے تھے۔ میں نے اس جیب کترے سے چھپنا بڑا [illegible] مجھ

اور اسے روٹی کھلانے کا کہہ کر ہوٹل میں لے گیا۔ میں کوئی بات سوچنا چاہتا تھا میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرکے پاس بلایا ان سے کہا کہ تم جاؤ اور صبح صبح آجانا۔ وہ چلے گئے تو میں سوچنے لگا اس جیب کترے سے کس طرح جان چھڑاؤں۔ فوجی نوکری آدمی کو ہوشیار بنا دیتی ہے۔ روٹی کھانے کے بعد میں ہاتھ دھونے کے بہانے غسل خانے کی طرف گیا اور اپنا بٹوہ اسے پکڑا دیا کہ اس میں سے پیسے نکالو میں نے غسل خانے کے دروازے میں سے دیکھا کہ وہ بٹوے میں پیسے گن رہا ہے میں تیزی سے باہر آیا اور اسے گردن سے پکڑ کر دو تین تھپڑ لگا دیئے اور ساتھ ہی شور مچا دیا کہ اس نے میری جیب کاٹی ہے لوگ جمع ہوگئے ایک آدمی بڑا جوشیلا تھا میں نے اسے کہا کہ اس آدمی کو تھانے لے چلتے ہیں بٹوہ جیب کترے کے ہاتھ میں ہی تھا کیونکہ وہ تو میرے ڈرامے سے ایک دم حیران رہ گیا تھا۔ اس کا دماغ ہی فیل ہوگیا تھا۔ ہجوم نے اسے آگے لگایا چند قدم چلنے کے بعد میں ہجوم میں سے نکل کر غائب ہوگیا مجھے امید تھی کہ اب یہ رات تھانے میں گزارے گا اور میرے کام میں رکاوٹ نہیں ہوگی۔

میں وہاں سے سیدھا گوربخش کی حویلی پہنچا چاروں طرف پھر کر میں نے پہرے کا اندازہ لگایا باہر کوئی نہیں تھا اور شاید ہی کوئی پہریدار ہوتا۔ میں نے پچھواڑے کا رُخ کیا اور وہاں سے حویلی کے اندر کودا۔ دیوار کے ساتھ گھوم پھر کر اندازہ لگا رہا تھا کہ رگھوبیر کس کمرے میں ہوسکتا ہے کہ اندھیرے میں ایک چارپائی سے جا ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور چارپائی تھی۔ میں نے خنجر نکال لیا لیکن مارتا کس کو تھا چارپائیوں پر رگھوبیر کے دونوں بھائیوں کی لاشیں تھیں۔ مجھے بہت دُکھ ہوا۔ اس بات کا دکھ نہیں کہ وہ کیوں قتل ہوئے بلکہ دُکھ اس بات کا تھا کہ رگھوبیر میرے ہاتھ سے بچ گیا۔ اگر اسے تلاش کرنے لگ جاتا تو یہ قتل میرے کھاتے پڑ جانے تھے۔ میں وہاں سے کھسک گیا۔ واپس تانگوں والے اڈے پہنچا فجر ہونے والی تھی کہ میرے ساتھی جیپ لے کر آگئے چھاؤنی واپس گئے تو میں میجر صاحب کے پاس پہنچا۔ انہوں نے پوچھا کام ہوگیا؟ میں نے کہا ہاں صاحب۔ بولے جاؤ آرام کرو۔ میں کوارٹر میں آکر لیٹ گیا میں اندر سے بہت شرمندہ تھا دشمن کے گھر جا کر بھی ناکام واپس آگیا؟ پھر سوچنے لگا رگھوبیر کے بھائیوں کو میں نے قتل نہیں کیا تو وہ کون تھا؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ رگھوبیر باہر سے شریف اندر سے چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ جس طرح بلوندر کو اُڑا لے گیا اسی طرح کسی اور کے ساتھ دغا کیا ہوگا۔ اس نے بدلہ لے لیا ہوگا۔ رگھوبیر کے بھائیوں کی اپنی دشمنیاں ہوں گی مجھے تو اپنی ناکامی کا صدمہ تھا، رہ رہ کر بلوندر کا چہرہ آنکھوں کے آگے آجاتا جو رگھوبیر کی رکھیل بن گئی تھی ایک تو میرے اپنے اندر شرمندگی دوسرے میجر صاحب سے جھوٹ بولنے کی شرمندگی، میں نے وہاں سے سامان اکٹھا کیا اور بھاگ نکلا۔ لاری اڈے سے بس پکڑی اور گاؤں سے باہر آکر ویران کھوہ میں ڈیرہ ڈال دیا۔ پتہ نہیں کیسے مخبری ہوگئی ہے اور آپ نے مجھے اور چاچا کو وہاں سے پکڑ لیا۔ جناب رگھوبیر کے بھائی میں نے قتل نہیں کئے آپ سے کچھ نہیں چھپا رہا۔ اب بھی آپ کے سامنے حلفاً کہتا ہوں کہ رگھوبیر کو قتل کرنے آیا تھا وہ نہیں ملا زندگی میں اگر کہیں آمنا سامنا ہوگیا تو اسے مارنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ پر یہ دونوں قتل میں نے نہیں کئے۔

میں نے گھوم کر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کردیا۔ تھپڑ کی سختی سے اس کا جسم لرز گیا۔ میں نے یک لخت اسے معاف اور نظروں پر رکھ لیا۔ میری اس مارکٹائی کا مقصد تھا کہ اگر وہ جھوٹ بول رہا ہے تو سچ بک دے اس طرح کے نفسیاتی اور جسمانی تشدد سے ملزم مان جاتے ہیں اچھی خاصی ٹھکائی کے بعد میں

نے اسے اپنے محرر کے حوالے کیا کہ اسے حوالات میں بند کردے۔ وہ اگرچہ قتل کے کیس میں زیر تفتیش تھا لیکن ایک فوجی سپاہی بھی تھا اور ابھی تک حاضر سروس تھا اگر وہ مجھے قتل کے کیس میں مطلوب تھا تو فوجیوں کو بھی مطلوب تھا ایسے بھگوڑوں کیخلاف کارروائی ہوتی ہے۔ میں اسے زیادہ حوالات میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ مجھے فوجی افسروں کو اطلاع دینا تھی کہ ان کا فوجی پکڑا گیا ہے۔ میں نے اپنے ایس ایس پی کو اطلاع کردی انہوں نے مجھے کہا کہ دلبر سنگھ کو میرے پاس پہنچا دو میں یہاں سے اسے فوجیوں کے حوالے کردوں گا۔ میں نے دلبر کو ایس ایس پی کے دفتر پہنچا دیا لیکن وہاں لے جانے سے پہلے تھانے میں اس سے اچھی طرح پوچھ گچھ کرلی۔ دلبر نے مجھے قائل کردیا کہ قتل اس نے نہیں کیے اگر رگھوبیر اسے مل جائے تو وہ اسے ضرور قتل کرے گا۔ پولیس کے سامنے اس طرح دھمکیاں دینا بھی ایک جرم ہے اور میں اس کیخلاف مقدمہ درج کرسکتا تھا لیکن چونکہ اسے فوج کے حوالے کرتا تھا اس لئے میں اس چکر میں نہیں پڑا۔ جانے سے پہلے اس نے کہا کہ اس کے چچا ہری سنگھ پر رحم کروں اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ میری محبت میں کھوہ پر ملنے آگیا تھا۔

اب تک کے واقعات میں کسی کو بلوندر کور کا خیال آیا نہ آیا البتہ مجھے شروع سے ہی دھیان تھا کہ چپ چاپ طریقے سے دیکھوں کہ بلوندر کیا کررہی ہے؟ مطلب یہ کہ اس کی سرگرمیاں کیا ہیں؟ میں نے اسی مخبر کو بلایا اور اسے ٹوہ لگانے کے لئے کہا۔ وہ اب تک بڑا کامیاب رہا تھا اس نے دو دن کے بعد مجھے رپورٹ دیدی۔ بلوندر اپنے چچا ہری سنگھ کے ساتھ ہی رہتی تھی اور جس دن دلبر سنگھ گرفتار ہوا تھا اسی دن بلوندر اور اس کی چاچی یعنی ہری سنگھ کی گھر والی دونوں ہی غائب تھیں اب ہری سنگھ سے صحیح طرح پوچھنے کا وقت تھا۔

دلبر کی ماں تو بے چاری کمزور بوڑھی عورت تھی بیٹے کے غائب ہوجانے نے اسے پریشان کررکھا تھا کئی سال تو روتی پیٹتی رہی جب ہری سنگھ کے دلبر کے ساتھ رابطے شروع ہوئے تو اسے سکون آگیا تھا کہ دلبر زندہ تو ہے۔ میرا خیال تھا کہ ہری سنگھ بہت کچھ بتائے گا میں نے اسے حوالات سے نکالا اور پوچھ گچھ کرتا رہا ساتھ ہی میں نے تھانے کا پرانا ریکارڈ بھی نکلوالیا۔ اس کا قتل ہونے والا ماموں چور تھا۔ ایک آدھ ڈکیتی کی واردات اس کے کھاتے میں تھی۔ دلبر کے مقتول ماموں کے ساتھ ایک اور آدمی نلوہ سنگھ کا بھی نام تھا وہ اس تھانے کا پرانا ہسٹری شیٹر تھا اور کم از کم دس بارہ سال سے اشتہاری تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ کہاں ہے۔ کم از کم پولیس کے ہاتھ بھی نہیں چڑھا تھا۔ ہری سنگھ سے جب میں نے پوچھ گچھ شروع کی تو نلوہ سنگھ کو بھی ذہن میں رکھا۔ ہری سنگھ روایتی قسم کا بدمعاش نہیں تھا کہ اس سے اگلوانا مشکل ہوتا میں نے اس سے پہلے اس قسم کے کمزور آدمیوں سے تفتیش میں دیکھا تھا کہ انہیں اپنی عزت اور پولیس سے بے عزتی کا بڑا خیال ہوتا ہے۔ ہری سنگھ سے میں نے صاف کہا کہ وہ اپنی عزت چاہتا ہے تو کھل کر بات کرے ورنہ وہ حوالات کی مار چند منٹ بھی نہیں سہے گا۔ ہری سنگھ یہ بات سمجھ گیا مجھے کہنے لگا۔

”خان صاحب میں نے آپ کو دھرمی قسم کا افسر پایا ہے۔ اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ دلبر کا ماموں چور بھی تھا اور ذیت بھی پر رگھوبیر سنگھ نے اسے ختم کردیا۔ گوربخشن ٹھیک ہے مال و دولت والا ہے پر وہ سکھ بھی ہے اور سکھوں کے اصول بھی جانتا ہے۔ جب اس کے بیٹے نے دلبر کی منگ پر ہاتھ ڈالا تھا تو اسے اسی وقت دخل دے کر معاملہ ختم کرنا چاہئے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہم ذن ہیں اس نے دولت کی اکڑ میں یہ سمجھا ہے تو اب وہ بھگتے بھی۔ بلوندر تو گئی جہاں اسے جانا چاہئے تھا۔ اب ہماری آپس میں چل گئی ہے قتل والا کام دلبر سے

نہیں کیا اگر کر لیتا تو ہماری ناک بھی اونچی رہتی آپس میں چل گئی ہے تو شاید اور بھی چل چلاؤ ہوں گے میں نے تو زندگی دیکھ لی ہے چاہتا ہوں کہ دلبر اس کی لپیٹ میں نہ ہی آئے۔

دلبر کا چچا یہ قتل اپنے سر لینے پر راضی تھا پر میں ایسا کس طرح ہونے دیتا مجھے تو اصل قاتل کو پکڑنا تھا۔ ہری سنگھ کے بیان کے بعد میں نے مقتولوں کے باپ گور بخشن سے بات کرنا ضروری خیال کیا۔ بے چارہ بہت بری حالت میں تھا۔ بیٹوں کے قتل نے اس کی ہمت توڑ دی تھی۔ جس دن واردات ہوئی تھی اس دن میرے حویلی پہنچنے پر گور بخشن نے کہا تھا کہ وہ تو مرمک گیا ہے اور وہ خود ہی اپنے بیٹوں کے قاتل یا قاتلوں کو دیکھ لے گا۔ اس وقت تو وہ غم اور تکلیف کی حالت میں تھا اس لئے میں نے اس سے کوئی اعتراض نہ کیا پر اب دوسری بات تھی۔ حویلی جا کر میں نے گور بخشن سے کہا کہ وہ اگر بڑا زمیندار ہے تو مجھے اس سے سروکار نہیں، میں نے قاتل پکڑنے ہیں اور خود تمہارا بھی فائدہ اسی میں ہے کہ میرے ساتھ تعاون کرو۔ اس دن تم نے کہا تھا کہ تم خود ہی قاتلوں سے نبٹ لو گے۔ اب بتاؤ تمہیں کس پر شک ہے یا واقعی تم کسی کو جانتے ہو۔ گور بخشن منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ پھر بہت آہستہ سے کہنے لگا۔ ''خان صاحب آپ کی کرپا ہے کہ آپ اتنا کشٹ کر رہے ہو، یہ لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ گور بخشن سنگھ یہ سب کچھ برداشت کر جائے گا میں نے آج تک علاقے میں خود کوئی جرم کیا نہ کرایا۔ رگھوبیر نے جو غلطی کی اس کا مجھے بھی احساس تھا ایک تو اسے اس لڑکی ...... کیا نام ہے اس کا ...... بلوندر کو منہ نہیں لگانا چاہئے تھا دوسرے بات یہاں تک نہیں بڑھانی چاہئے تھی۔ اب تو اس بات کو کئی سال ہو گئے پر دشمن ہمیشہ کمینہ کردار کرتا ہے سو اس نے کر دیا ہے۔''

میں نے گور بخشن کو ٹوکا۔ ''گور بخشن مجھے یہی معلوم کرنا ہے کہ تمہاری دشمنی کس کے ساتھ کس وجہ سے ہے۔'' میں بالکل انجان بنا رہا۔ اس پر یہ ظاہر نہ کیا کہ میں بلوندر کے واقعہ سے آگاہ ہوں اور ہری سنگھ اور دلبر سنگھ میرے ہاتھ میں ہیں۔ گور بخشن نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''میرے ساتھ کسی نے دشمنی کیا کرنی ہے؟ بس اپنے آپ کو ہری سنگھ بھی بدمعاش سمجھنے لگ گیا ہے اور دلبر سنگھ بھی۔ دلبر تو خیر یہاں سے نکل ہی گیا ہے۔ اس کا سارا ٹبر ہی لچے لفنگوں کا ہے۔ مرنے والا ان کا ماما بھی اپنے بڑوں کی راہ پر چل نکلا تھا۔ چوری چکاری اور ڈاکہ کسی چیز سے دریغ نہیں کرتے تھے۔'' گور بخشن کھل کر بات کرنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ ''میں نے یہی دیکھا ہے کہ ہری سنگھ اور اس کے بھتیجے نے کبھی نیکی کا کام نہیں کیا خود ہری سنگھ کا بڑا بھائی نلوہ سنگھ تھا۔ اصل اسی کی بدمعاشی نے دوسرے گھر والوں کو اس راہ پر لگایا ہے۔'' ...... گور بخشن سنگھ نے موٹی سی گالی دی۔

''اگر یہ لوگ نلوہ سنگھ کی بدمعاشی پر میرے ساتھ متھا لگا رہے ہیں تو میں اس کا بھی بندوبست کر رہا ہوں تھانیدار صاحب آپ ایک طرف ہو کر بس تماشا دیکھو بندے میں خود تمہارے پاس لے آؤں گا۔ بے شک کہہ دینا تم نے پکڑے ہیں پر میری راہ کھوٹی نہ کرو مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔''

جب تک گور بخشن راہ پر نہ آتا میرے لئے آگے بڑھنا مشکل تھا۔ میرے اندر کا نواز خان باہر آ گیا۔ میں چارپائی سے اٹھا اور گور بخشن کو گھور کر کہا۔ ''گور بخشن تم مجھے اچھی طرح نہیں جانتے مجھے چودھراہٹ یا زمینداری کا رعب بھی نہ دینا خطا کھاؤ گے۔ دوسرے میں ایک سرکاری افسر ہوں اور اس قتل کی تفتیش میں نے کرنی ہے مجھے سیدھی طرح بتا دو گے کہ معاملہ کیا ہے تو اچھی بات ورنہ نواز خان کے سامنے کسی کی زبان بند رہے یہ ممکن نہیں ہوتا۔''

گور بخش نے میرے چہرے کی سختی دیکھی تو نرم پڑ گیا۔ مجھے کہنے لگا، ”میں تو تم ناراض ہو گئے۔ میرا مطلب تھا کہ نلوہ سنگھ سے نبٹنا شاید تمہارے لئے ممکن نہ ہو۔ اس کے لئے بندوں کا انتظام بھی کر سکتا ہوں مجھے یقین ہے کہ مجھ پر وار کرنے والا نلوہ سنگھ ہی ہے میں کھوج کر رہا ہوں کہ ان دنوں اس کا ٹھکانہ کہاں ہے واہگورو کی قسم خان صاحب تمہیں بتا دوں گا۔“

میں حویلی چلا آیا۔

گور بخش سنگھ کی حویلی سے واپس آ کر میں نے ہری سنگھ کی اچھی طرح ٹھکائی کی۔ میں خود حوالات کے اندر گیا اور وہاں سے کانسٹیبلوں کو باہر نکال کر ہری سنگھ کو سامنے کھڑا کر لیا۔ مار نے اس کے سارے کس بل نکال دیئے تھے میں نے اسے کہا کہ وہ ساری بات کھل کر بتائے۔ ”وہ تو جی میں بتا چکا ہوں“۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بلوندر کہاں ہے؟“ اس کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ میں اُٹھ کر اس کے قریب آیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک جھٹکا دیا۔ ”نلوہ سنگھ کہاں ہے؟“ ہری سنگھ کی ٹانگوں میں جیسے جان نہ رہی۔ وہ لرزنے لگا، میں نے زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ ”نواز خان سے چھپاؤ گے تو جان عذاب میں کر دوں گا۔ اب بک دو ورنہ بعد میں پچھتاؤ گے۔“

ہری سنگھ کے لئے شاید ایک تھپڑ کافی نہیں تھا۔ وہ خاموش رہا میں نے حوالات کے باہر کھڑے ایک کانسٹیبل کو اشارہ کیا کہ بید پکڑاؤ‘ ہری سنگھ اب بھی ڈھیٹ بنا کھڑا تھا پھر جب میں شروع ہوا تو ایک دو منٹ ہی اس کے لئے کافی تھے۔ وہ فرش پر گر کر ہانپنے لگا اور ہاتھ اُٹھا کر مجھے رُکنے کا اشارہ کیا سر سے اوپر نیچے اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے بید ایک طرف کونے میں پھینک دیا اور گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اٹک اٹک کر نلوہ سنگھ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

ہری سنگھ کا بیان بہت طویل تھا۔ اس نے کہانی سنائی کہ اس کا بھائی نلوہ سنگھ ڈاکو کیسے بنا۔

”نلوہ سنگھ میرا بڑا بھائی ہے ہمارا باپ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ ماتا نے سکول بھیجنا شروع کر دیا۔ چھ جماعتوں تک سکول میں پڑھتے رہے پھر سکول سے بھاگ گئے نلوہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں ہی کافی جوان ہو گیا تھا۔ ہم ڈاکے ڈالنے لگے۔ یہ صلاح نلوہ نے ہی دی تھی ماتا کا جمع جتھہ نکالا اور ایک قبائلی سے پرانی بندوق خرید لی۔ ماموں کے پاس مال ڈنگر میں تین گھوڑیاں تھیں دو ہم نے نکالیں اور پہلا ڈاکہ ساتھ والے گاؤں میں مارا۔ جس گھر میں گئے تھے نلوہ نے مجھے باہر کھڑا کیا، بندوق مجھے دی اور کہا کہ جو اندر آئے اسے گولی مار دینا۔ نلوہ اندر گیا گھر والوں نے بغیر جھگڑا کئے زیور اور پیسے اس کے حوالے کر دیئے۔ نلوہ باہر آیا ہم گھوڑیوں پر چڑھے میں نے تین فائر کئے کہ اگر کوئی پیچھے آنا چاہتا ہے تو ڈر جائے۔ زیور ہم نے سنیارے کے پاس بیچا اور رقم اُڑا دی۔ ہمارا تیسرا بھائی بڑی غربت میں مرا تھا اس کی بیوی بھی اس کے پیچھے ہی چلی جاتی پر ہم نے سنبھال لیا اس کا ایک ہی بیٹا ہے دلبر سنگھ۔ نلوہ کے ساتھ میں نے چار ڈاکے ڈالے۔ پولیس ہم تک پہنچ گئی نلوہ اشتہاری ہو گیا میں بچ گیا۔ دراصل نلوہ مجھے ڈاکے والی جگہ پر گھر سے باہر رکھتا تھا۔ کسی نے آج تک میری شناخت نہیں بتائی تھی۔ پولیس کی وجہ سے نلوہ کا اس علاقے میں رہنا مشکل ہو گیا۔ وہ ہماچل کی طرف نکل گیا وہیں اس نے شادی کی اور تین سال کی لڑکی میرے حوالے کر گیا۔ بلوندر کور کی ماں ہماچل میں ہی کسی بیماری سے مر گئی تھی۔ نلوہ نے بلوندر کا بیاہ دلبر سے کرنا تھا نلوہ کبھی کبھار آ کر بلوندر کو دیکھ جاتا۔ اب جانے اسے

نصیبر کے معاملے کا کس طرح پتہ چلا اس نے ایک
رات مجھے مارا کہ میں اس کی بیٹی کی حفاظت نہیں
کرسکا اور ماسے کو بھی مروادیا۔

نلوہ نے مجھے کہا کہ تیار ہو جاؤ گوربخشن سنگھ کی جد
مارنی ہے۔ قتل والی رات وہ میرے پاس آیا۔ مجھے ساتھ
لیا اور پہلے کی طرح مجھے گوربخشن کی حویلی کے باہر کھڑا
کردیا۔ نلوہ نے دیوار پھاندی اور اندر چلا گیا۔ اس بار
میں باہر نہیں رُکا۔ اندر نلوہ مارا جاتا تو میری زندگی حرام
ہوجاتی یہ ڈر بھی تھا کہ گوربخشن نے کوئی انتظام نہ کر رکھا
ہو۔ نلوہ اسے پیغام بھجوا چکا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی بے عزتی
کا بدلہ لینے ضرور آئے گا یہی اس کی غلطی تھی ورنہ کوئی ہم
تک نہ پہنچ سکتا۔ میں بھی دیوار پھاند کر اندر پہنچ گیا نلوہ
گھوم پھر کر اندر جانے کی راہ دیکھ رہا تھا مجھے دیکھ کر
ناراض ہوا۔ ہم پھر رہے تھے کہ چارپائیوں پر گوربخشن
کے بیٹے نظر آئے ہم نے خنجر نکالے اور دونوں کے گلے
چیر دیئے جس طرف سے آئے تھے ادھر ہی نکل گئے۔
نلوہ نے گھر تک میرا ساتھ دیا پھر نکل گیا۔"

میں بڑی خاموشی سے اس کی کہانی سنتا رہا۔
دونوں بھائی بلاشک جی دار تھے۔ ان کا آگے بیٹا بھی
جی دار ہی نکلا پر جرم سے مجھے نفرت ہے نلوہ کی باتیں
سن کر میرے دل میں شدید خواہش ہوئی کہ اس کی
گردن دبوچ لوں۔ اسی لئے میں ہری سنگھ کو زیادہ
بولنے کا موقع دے رہا تھا۔ ہری سنگھ بات ختم کر چکا تو
میں نے اس سے نلوہ سنگھ کا پوچھا۔ اس نے وہ بھی
بتانے میں دیر نہیں کی۔ میں نے گوربخشن سنگھ کے
بیٹوں کے قتل کا پرچہ کاٹا اور ہری سنگھ کو نامزد کر کے
اسے حوالات میں بند کردیا۔ میں نے ایس ایس پی کو
رپورٹ بھجوا کر درخواست کی کہ فوجی افسروں سے کہا
جائے کہ دلبر سنگھ کی قتل کے کیس میں کسی وقت بھی
ضرورت پڑسکتی ہے۔ اس لئے جب ہم چاہیں اسے
ہمارے حوالے کردیا جائے۔ میں نے قتل کے بڑے
ملزم کو پکڑنے کی خاطر دفتر سے چند دن کی چھٹی کی
درخواست دی اور اے ایس آئی کو تھانے کا انتظام
دے کر بلال شاہ کے ساتھ ایک ایسے سفر پر روانہ
ہوگیا جس کا مجھے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ ایس ایس
پی نے میری مدد کے لئے کچھ انتظام بھی کردیا تھا۔

امرتسر سے ہمالیہ کی طرف جانے کے لئے ایک
طویل راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ہری سنگھ نے نلوہ کے
بارے میں بتایا تھا کہ وہ مہینوں کے بعد اس علاقے کا
چکر لگاتا ہے۔ اس کا ٹھکانہ ہمالیائی ریاست باجور پور
کے جنگلوں میں ہے اور وہاں کے راجہ کا سرکاری
شکاری بن چکا ہے۔ باجور پور پہنچنے میں ہمیں کئی دن
لگ گئے بلال شاہ کی عجیب طرح کی بے چینی تھی۔
میں نے اسے ذہنی طور پر تیار کردیا تھا کہ اسے جنگل
میں رہنا ہے اور وہاں سے ہی مجرم پکڑنا ہے۔ باجور
پور کا داروغہ گجراج سنگھ موٹا سکھ تھا۔ پچاس پچپن کے
پیٹے میں تھا گوشت جیسے ہڈیوں نے چھوڑ رکھا ہو۔ اس
کے جسم سے اندازہ ہوتا تھا کہ جوانی میں بہت مضبوط
اور تگڑا رہا ہوگا۔ ہونٹوں پر کمینی مسکراہٹ رہتی۔ نلوہ
سنگھ کی بات سن کر ہنسا میری طرف دیکھا اور بولا۔"تم
نے اتنے بڑے کام کو ہاتھ میں لے لیا ہے جس میں
تمہاری جان بھی جاسکتی ہے ایک ماہر شکاری جنگل میں
اپنی جان خطرے میں سمجھتا ہے۔ یہاں تمہارا واسطہ
جس آدمی سے ہے وہ کسی جنگلی جانور سے کم نہیں اس
کا نشانہ خطا نہیں جاتا اور پھر تم یہ نہ بھولو تم ملازم سرکار
ہو تو وہ بھی اس راجیہ (تقسیم سے پہلے راجاؤں کی
چھوٹی چھوٹی ریاستیں راج کہلاتی تھیں) کا سرکاری
ملازم ہے۔ دوسرے یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے
علاقے میں اس طرح گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں
دی جاسکتی۔ اول تو میرا ہی فرض ہے کہ تمہیں گرفتار
کرلوں چلو تم سے رعایت بھی کروں تو یہ معاملہ راجہ
کے نوٹس میں لاؤں گا۔ فیصلہ وہی دیں گے۔ رات
کے لئے تمہارا انتظام سرکاری ریسٹ ہاؤس میں کردیا
گیا ہے۔ ریسٹ ہاؤس شہر سے باہر تھا شہر کی پرپیچ

گلیاں اور بازاروں سے گزر کر ہم راج محل کے باہر سامنے کی طرف ریسٹ ہاؤس میں پہنچے۔ روشن جگمگاتا راج محل تھا۔ بہت اونچا پتھروں کی دیواریں باہر اخروٹ کے درختوں کے جھرمٹ، محل کے باہر کم از کم سو آدمیوں کی گارڈ تھی۔ راجواڑوں کی شان کچھ اور تھی بہرحال ریسٹ ہاؤس میں رات کے وقت بلال اور میں نے سوچ بچار کیا ہم دونوں کی رائے یہی تھی کہ راجہ اور داروغہ دونوں ہی ہمیں ملوہ کو پکڑنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ہم نے ایک سکیم بنالی اور دن نکلنے سے پہلے ہی ریسٹ ہاؤس سے نکل گئے اس طرف آتے ہوئے دن میں ہم نے گلیاں بازار دیکھے تھے۔ وہاں پوچھتے پوچھتے ہم کھالوں کے کاروبار کرنے والی دکان پر جا پہنچے جس کا مالک گنجا چوٹی والا ہندو تھا۔ اس سے ہم نے کسی مقامی شکاری کا پتہ پوچھا پہلے تو ہندو سمجھا کہ ہم جانوروں کی کھالیں خریدنے والے ہیں وہ ہماری خوشامد کرنے لگا پھر مایوس ہوکر ہمیں ہردیال کے گھر کا راستہ دکھا دیا ہم نے دن وہیں گلیوں اور دکانوں پر گزارا۔ رات ہوتے ہی ہم اس گلی میں داخل ہوئے۔ داروغہ سے چھپ کر رہنا تھا وگرنہ وہ ہمیں پکڑوا دیتا۔ گلی میں مکمل سناٹا تھا آخری سرے پر ہردیال شکاری کا مکان تھا میں نے دروازے کی باہر لٹکتی کنڈی کھڑکائی اور اندر سے کچھ برتنوں کے گرنے، چارپائی کی الٹ پلٹ اور آہستہ آہستہ پریشان سی آوازیں آئیں پھر خاموشی چھاگئی۔ چر کی آواز سے دروازہ کھلا ایک لمبا اور پلا ہوا آدمی باہر نکلا۔ ’’کون ہو؟ کیا بات ہے‘‘۔

’’تم ہردیال ہو‘‘ اس نے گردن ہلائی۔ ’’تم سے بات کرنا ہے۔‘‘ وہ شک کی نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا پھر اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کمرے میں دو چارپائیاں تھیں ان پر بچے سو رہے تھے ایک طرف لکڑی کا ٹوٹا ہوا دیوان تھا۔ اس نے ہمیں بیٹھنے کے لئے کہا۔ ’’تمہارے لئے چائے بناؤں؟‘‘ میں نے اور بلال نے ایک ساتھ انکار کر دیا۔ ’’لو اسے پیو۔‘‘ اس نے حقہ ہمارے آگے کر دیا۔ ہمارے انکار پر خود ہی حقے کی نڑی منہ میں لے کر کش لگایا۔

’’اب بولو کیا کہتے ہو۔‘‘

میں نے اسے بہت مختصر طریقے سے بتایا کہ میں سرکاری شکاری ملوہ سنگھ کو پکڑنا چاہتا ہوں خود بھی سرکاری آدمی ہوں ساتھ ہی میں نے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا ’’اس کے ٹھکانے تک رہنمائی کردو تمہاری محنت دے رہا ہوں۔‘‘

ہردیال نے دو تین گہرے کش لئے فضا میں تمباکو کا دھواں بھر گیا۔ دھوئیں کے مرغولوں میں سے دبی ہوئی ایک تلخ آواز آئی ’’تم اس تک نہیں پہنچ سکتے وہ دوسرے راجہ کے علاقے میں ہے بھگوان نے اس علاقے میں اتنے بڑے جنگل اور پہاڑ بنائے ہیں ملوہ سنگھ اسی جنگل کا درندہ ہے‘‘۔

’’کیا تم شکاری نہیں ہو؟‘‘ میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ وہ تڑپ گیا۔ زور سے حقے کا کش لگایا۔ ’’درشنا‘ اے درشنا‘‘ اس نے زور سے آواز لگائی۔ میرا رک سیک اور بندوق لاؤ ساتھ والے کمرے میں کھڑبڑ ہونے لگی۔ ہردیال اُٹھ کر ادھر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے بلال شاہ کی طرف دیکھا اس نے آنکھ مار کر خوشی کا اظہار کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہردیال واپس آگیا۔ ایک ہاتھ میں بندوق کندھے پر تھیلا تھا۔ ’’تمہارے پاس ہتھیار ہے اس جنگل میں خالی ہاتھ کا مطلب ہے تم خود اپنی موت کے منہ میں چلے جاؤ۔‘‘ میں نے ہاں میں سر ہلایا۔ میری جیب میں سروس ریوالور اور کافی گولیاں تھیں۔ بلال شاہ کے پاس دیسی ریوالور بھی تھا۔

پہاڑی پگڈنڈی پر چلتے چلتے دن چڑھنے والا تھا۔ ہردیال کسی بندر کی طرح چل رہا تھا۔ اگرچہ تھک میں بھی گیا تھا پر بلال جیسے گینڈے کے لئے یہ مشقت سخت تھی۔ اس کا سانس پھول چکا تھا

ہردیال نے ہماری طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ آرام کی ضرورت ہے۔ ایک پتھر پر ہم بیٹھ گئے ہمارے سامنے اوپر اٹھتی ہوئی گھاٹی تھی جس کے دوسری طرف ہردیال نے بتایا کہ کالی ہوڑہ کا ڈاک بنگلہ تھا جس پتھر پر ہم بیٹھے تھے وہ ہردیال کے حساب سے پہاڑ کے آخری حصے کے قریب تھا۔ جنگلی انگوروں کی بیلیں ہر طرف نظر آ رہی تھیں باجور کا شہر بیس میل پیچھے رہ گیا تھا تھوڑے آرام کے بعد ہم پھر اُٹھے اور چل دیئے۔ اوپر پہنچے تو کالی ہوڑہ کا ڈاک بنگلہ نظر آیا ہم کالی ہوڑہ کے گاؤں کے اوپر چکر لگا کر گزرنے لگے۔ دو تین کوس کے بعد پھر جنوبی راستے کی طرف پلٹے ہردیال کالی ہوڑہ گاؤں سے ہٹ کر نکلنا چاہتا تھا۔ راستہ اب بہت دشوار ہو گیا تھا خطرناک اونچائیاں جان لیوا اترائیاں' گہری کھڈیں' پرشور پہاڑی نالے جن پر کوئی پل نہیں ہوتا۔ بلال شاہ ایک قریبی پتھر پر بیٹھ گیا۔ اب آگے جانا اس کے بس کی بات نہ تھی ہردیال مسکرایا۔ اس نے اپنا تھیلا زمین پر رکھا اور اس میں اسے ایک بوتل نکال کر اس میں شربت نما کوئی چیز گلاس میں ڈال کر بلال شاہ کو دی پھر گلاس میرے لئے بنایا کوئی دوا جیسا مگر بڑا مزیدار ذائقہ تھا۔ چند منٹ بعد ہی ہماری تھکن غائب ہوگئی۔ کالی ہوڑہ کا گاؤں اب پیچھے رہ گیا تھا۔ ہمارے مغرب کی طرف دور تک دیوداس کے درختوں کا جنگل تھا۔ اس جنگل کے شروع میں ہی ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ اس علاقے کی تمام رکھوں' ڈاک بنگلوں اور شکار گاہوں کا ایک طرح سے ہیڈکوارٹر تھا۔ ہماری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوگئی تھیں۔ ہمارا رُخ اب اس گھر کی طرف تھا گھر کے اردگرد لکڑی کی مضبوط باڑ تھی جس کا دروازہ لکڑی کے ایک بڑے ہک کے ساتھ بند تھا مگر نیم بند کیونکہ ہک ٹوٹا ہوا تھا۔ باڑھ کے اندر سبزی کی بیلیں تھیں گیٹ سے برآمدے تک گھاس میں جگہ جگہ پتھر پڑے تھے۔ ہم بے آواز چلتے ہوئے برآمدے میں آئے جس میں جگہ جگہ لکڑی کے ستون تھے بائیں جانب کا برآمدہ خالی تھا۔ دائیں جانب کے برآمدے میں پرانی سوکھی بیلوں اور لکڑی کے چھوٹے چھوٹے پھٹوں کا ڈھیر تھا۔ اسی ڈھیر کے پیچھے سے ہوکر میں جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایسے لگا جیسے پہاڑی جنگل کی خاموشی میں کسی نے گرنیڈ کا دھماکہ کر دیا ہو۔ پکی رائفل کی گولی ٹھائیں کی آواز سے نکلی اور میرے دائیں بازو کو تقریباً چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے سوکھی بیلوں کے ڈھیر پر چھلانگ لگائی اور اپنے جسم کو لڑھکاتا ہوا اس کے ڈھیر کے پیچھے ہو گیا۔ میں نے بلال شاہ کو آواز دی میری آواز پوری نہیں نکلی ہوگی کہ بلال شاہ نے اپنے دیسی پستول کا فائر کر دیا۔ میں بیلوں کے ڈھیر کے پیچھے سے کھسکتا ہوا برآمدے کے ساتھ بنے لکڑیوں کے پھٹوں سے بنائی گئی چھوٹی سی دیوار کی طرف بڑھنے لگا۔ میں فائر کر کے اپنے پر حملہ کرنے والے کو بھگانا نہیں چاہتا تھا۔ یکا یک ایک اور فائر کا کڑاکا ہوا۔ اور جتنی دیر میں کچھ سمجھ سکتا کوئی آدمی دھڑ دھڑ کرتا ٹوٹے ہک والے گیٹ کو جھٹکے سے کھول کر باہر نکلا۔ ہمارے دوڑ کر وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ وادی کی اترائی میں غائب ہو گیا ہم اس گھر سے باہر نکل آئے ہری سنگھ کو یقین تھا کہ یہ نلوہ ہی تھا۔ ورنہ ان رکھوں کا کوئی سرکاری شکاری ہم پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے کیا خبر کہ ہم کون ہیں ہماری کسی سے کیا دشمنی تھی ہم پر گولی وہی چلا سکتا تھا جسے پتہ تھا کہ ہم کون ہیں یا تو وہ نلوہ ہو سکتا تھا یا داروغہ کا آدمی جو ہمارے پیچھے بھیج دیا گیا ہو۔ ہردیال نے کہا کہ اب دوسرے ڈاک بنگلے جانا ہوگا تین ایک میل کی چڑھائی تھی میں راتوں رات ہی یہ کام کرنا چاہتا تھا۔ دن کے اجالے میں نلوہ پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔ یہ تین میل بلال شاہ نے منہ میں بڑبڑاتے اور نلوہ کو

گالیاں دیتے ہوئے گزارے۔ ایک اونچی کھائی کے پیچھے خودرو جھاڑیوں میں ہم رُک گئے۔ ہردیال نے ایک جھاڑی کے اندر گھس کر اس کی شاخیں توڑ کر دوربین نما سوراخ بنا لئے جن سے ہم سامنے دیکھ سکتے تھے۔ سامنے ہی اونچا اور بڑا عالی شان ڈاک بنگلہ تھا۔ اونچی چٹان کاٹ کر بنایا گیا تھا اس کے پیچھے چڑھ کے جنگل تھے ڈاک بنگلے کی ایک کھڑکی سے بڑی مدھم روشنی نکل رہی تھی باقی عمارت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میرے پیروں کے پاس سرسراہٹ ہوئی، خرگوش گزر رہے تھے۔ ان کی آنکھیں لال انگارہ تھیں۔ ہردیال نے آسمان کی طرف دیکھا، وہ ستاروں کے ذریعے وقت معلوم کررہا تھا۔ میرے پاس گھڑی تھی لیکن باجوڑ کے اس جنگل کے بے پناہ اندھیرے میں بالکل بےکار تھی۔ ہری سنگھ کے حساب سے رات ختم ہونے میں بس ایک دو گھنٹے باقی تھے۔ دن نکلنے سے پہلے ہمیں اس ڈاک بنگلے کے اندر ہونا تھا۔ ورنہ نلوہ نکل جاتا میرے خون نے جوش مارا میں اُٹھ کر بھاگنے لگا پتھر کھڈے' جھاڑیاں سب روند رہا تھا۔ بلال شاہ میرے پیچھے اور اس کے پیچھے ہردیال تھا۔ میں ڈاک بنگلے کے پیچھے پہنچ گیا اور جنگل سے نکل کر عمارت کے اندر آنے میں پانچ منٹ لگے۔ مجھے ایسے لگا جیسے ایک کھڑکی کے پیچھے سے مجھے کوئی دیکھ رہا ہے۔ میں ایک ستون کی اوٹ میں ہوگیا اگر یہ نلوہ تھا تو مجھے آسانی سے گولی مار سکتا تھا میں نے عمارت کے صحن میں داخل ہوتے ہوئے بلال شاہ اور ہردیال کو نیچے لیٹ جانے کا اشارہ کیا خود دبے پاؤں کھڑکی کی طرف بڑھا۔ یہاں کوئی پہریدار نہیں تھا۔ کھڑکی کا اوپر والا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا میں نے کھڑکی کا دروازہ کھولا اور اندر کود گیا۔ بلال کو میں نے باہر رکنے کا اشارہ کیا۔ یہ غسل خانے کی کھڑکی تھی۔ غسل خانے سے باہر ایک راہداری نکل رہی ہے کوریڈور کے آخری کونے میں کوئی زمین پر بیٹھا تھا اس کی پیٹھ دیوار کے ساتھ تھی۔ اس کے جسم کے پیچھے چھپی ہوئی لالٹین کی بڑی کمزور روشنی آرہی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا اس کا چہرہ زرد اور کمزور سا لگ رہا تھا۔ وہ گہری نیند میں تھا میں نے واپس جاکر ہردیال کو اندر بلایا اس نے قریب سے اس آدمی کو دیکھا اور دانت نکال دیئے۔ یہ یہاں کا چوکیدار ہے افیمی ہے میں جواب دیئے بغیر غسل خانے کے راستے باہر نکلا۔ اس ستون کے پاس سدابہار کے اونچے اونچے پودوں کے پاس مجھے ایسے لگا کہ کوئی سایہ میرے پیچھے لہرایا ہے میں تیزی سے مڑا اسی ایک سیکنڈ میں میں نے ایک آدمی کو خود پر جھپٹتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبا سا چاقو تھا۔ ریوالور نکالنے کا موقع ہی نہیں تھا مجھے یاد ہے کہ بالکل خواب کی طرح میرا دائیاں مکا اٹھا اور اس آدمی کا چھرا لگنے سے پہلے میرا مکا اس کے پیٹ کے اوپر والے حصے میں دب چکا تھا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے اُچھلا اور وہ دوہرا ہوگیا۔ ہردیال نے رائفل گھما کر لاٹھی کی طرح ماری پر اس کا اندازہ غلط ہوگیا۔ رائفل اس دوہرے ہوتے ہوئے آدمی کے اوپر سے ہوتی ہوئی میرے بائیں کندھے پر لگی اور میں چکرا کر زمین پر گرا۔ ہردیال میری طرف لپکا اور وہ آدمی آدھا دہرا ہوکر پھر تیزی سے اٹھا اور باہر کی طرف بھاگا۔ بلال شاہ نے مجھے زمین پر گرتے دیکھا تو میری طرف بھاگا اگر وہ ایسا نہ کرتا تو مجھ پر حملہ کرنے والا اس کے قابو آسکتا تھا۔ میں تیزی سے اٹھا اور بلال شاہ کو پرے ہٹا کر اس آدمی کے پیچھے بھاگا۔ چڑھتے دن کی ہلکی سی روشنی میں وہ ڈاک بنگلے کے پورچ سے نکل کر نیچے ڈھلان کی طرف بھاگ رہا تھا۔ ہر درخت' چٹان یا کھڈ کی آڑ لے رہا تھا۔ ایک جانور کی طرح چوپائے کی طرح اس نے ہمارے دیکھتے دیکھتے شمال کی طرف جنگل میں پناہ لے لی۔ ہردیال نے میرے

بازو پر ہاتھ رکھ کر مجھے روک لیا۔ صاحب بہادر یہ جنگل ہے آپ جوان ہیں جی دار بھی ہر جنگل کے قانون اپنے ہیں اس قانون کو ماننے والا ہی یہاں زندہ رہتا ہے۔ تلوہ جہاں جائے گا مجھے معلوم ہے ہردیال فوراً واپس ریسٹ ہاؤس کے اندر چلا گیا اور ایک تھیلا لے آیا۔ ہم بھی ڈھلان سے اترے جنگل کا یہ حصہ چھوٹا ہی تھا جھاڑیوں سے گزر کر باہر نکلے جھاڑیوں کے پار ویران میدان تھا۔ پتھروں کے ڈھیر ہی ڈھیر ہر طرف تھے شاید یہ کسی سوکھے ہوئے نالے کی گزرگاہ تھی دور ایک ہلکی سی پانی کی لکیر تھی اس لکیر کے کنارے اونچی چٹان تھی جس میں سیڑھیاں کاٹی گئی تھیں اوپر ایک شوالہ بنا ہوا تھا۔ شوالے مندروں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی عمارتیں ہوتی تھیں جن میں مسافر ٹھہرتے تھے۔ یہ شوالہ جس میں ہم پہنچے پتہ نہیں کئی سو سال پہلے بنایا گیا ہوگا۔ دیواریں کالی ہوچکی تھیں سیڑھیوں پر کائی تھی شاید برسات میں نالے کا پانی ان کے اوپر سے گزرتا ہو۔ ہردیال نے شوالے میں پہنچ کر رسد کا سامان رکھا تھیلے سے کھانے پینے کی چیزیں نکالیں بلال شاہ ان پر ٹوٹ پڑا۔ اس دیو کو کھائے بغیر ایک دن اور ایک رات ہوگئے تھے ہم نے احتیاط سے کم خوراک استعمال کی۔ کھانے کے بعد جسم میں جان نہ رہی اور بے سدھ ہوکر ہم لیٹ گئے۔ بلال شاہ تو خراٹے لینے لگا مجھے بھی اونگھ آگئی۔

کچھ دیر آرام کے بعد ہم اٹھ بیٹھے۔ ہردیال کے چہرے پر فکر کے آثار تھے۔ جس کام کو آسان سمجھا تھا وہ مشکل نکلا۔ خود مجھے بھی احساس تھا کہ داروغہ اب تک اپنی ریاستی پولیس ہمارے پیچھے لگا چکا ہوگا۔ اس وقت ہردیال بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اس نے اس خوف کا اظہار بھی کردیا۔ جس جگہ ہم بیٹھے ہیں، یہ دوسالہ ہے یہاں سے چار راجواڑوں کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں یہ راجا اپنی پرجا و رعایا کے لئے خواہ کچھ نہ کریں ایک دوسرے کے لئے بہت کچھ کرتے ہیں اور ان کی حکومت چلانے والوں کا دوسرے راجوں، ریاستوں سے کھانا پینا اکٹھا ہوتا ہے۔ گجراج سنگھ کا مفرور ان سب کا مفرور ہوگا۔ گویا ہردیال مجھے ڈرا رہا تھا کہ شاید چار ریاستوں کی پولیس میرے پیچھے ہے اور میں تلوہ ڈاکو کے پیچھے جو یہاں کا سرکاری شکاری بنا بیٹھا ہے۔ ہم اس کھنڈر سے اب باہر نکلے۔ اب جنگل گھنا نہیں رہا تھا آخر یہ ختم ہوگیا اور سامنے پہاڑ جیسی چٹانیں کھڑی تھیں انہی چٹانوں کے پار تلوہ سنگھ ہوسکتا ہے۔ جس ریسٹ ہاؤس سے ہم نکلے ہیں اور تلوہ بھی نکلا ہے میرا دشواس ہے کہ وہ ابھی یہ چٹانیں عبور کرکے اپنے ٹھکانے پر نہیں پہنچا ہوگا۔ راستہ بڑا جان جوکھم کا ہے۔ رات سر پر آرہی ہے تو یہیں گزار لیتے ہیں دن چڑھے نکل جائیں گے۔ وہ کھوہ تلاش کرنے لگا میں اور بلال شاہ مشورہ کرنے لگے ہماری آوازیں آہستہ تھیں کہ ہردیال سن نہ لے۔ میرا خیال تھا کہ اس شکاری نے شاید ہمیں الجھا دیا ہے۔ تھا وہ بھی اسی راجواڑے کا ملازم اپنے راجا کی حکومت سے کیوں غداری کررہا ہے شاید پیسے کے لالچ نے اسے یہ کام کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

''خان صاحب تلوہ سنگھ آدمی ہے کہ چھلاوہ ہے کہ چند دن میں وہ اس قدر دشوار پہاڑی اور جنگل کا علاقہ عبور کرکے اپنے اڈے پر چلا جاتا ہے۔'' میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔ مجھے ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی میرے ذہن نے فوراً اس طرح اس کا احساس کیا جس طرح دوست اور دشمن کی آہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ میں نے پلک جھپکنے کے وقت جتنے وقت میں اپنا سروس ریوالور نکالا اور اس جھاڑی کی طرف کرلیا جہاں سے آواز آئی تھی عین اسی وقت کسی نے پیچھے سے گولی چلائی مجھے اپنی ٹانگ کے ساتھ ہلکی سی مالش کا احساس ہوا قسمت اچھی تھی گولی ٹانگ چھو کر گزر گئی تھی بلال شاہ اور میں نے تقریباً ایک ہی

وقت میں جھاڑیوں کی طرف چھلانگ لگائی۔ ہردیال بھی شاید وہیں دبک گیا تھا مجھے اس کا تھیلا اور بندوق سامنے چٹان کے ساتھ رکھے دکھائی دیئے۔ ہم پر حملہ کرنے والے نے ڈاک بنگلے کے بعد دوسری کوشش کی تھی اس کا مطلب تھا کہ یہ نلوہ ہی تھا۔ اور وہ بھی ہمارے آس پاس ہی تھا۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی یہ آدمی بہادر بھی تھا ہم پر حملہ بھی کر رہا تھا اور پھر فرار ہو جاتا تھا شاید وہ نہیں چاہتا کہ ہم اس علاقے سے زندہ بچ کر نکل جائیں اسے داروغہ نے یقینی طور پر ساری بات سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ اسے علم ہوگا کہ اس کے پیچھے آنے والے کون ہیں۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ کر لیا۔ میں نے نلوہ کو آواز دی نلوہ سنگھ اگر تم ہو تو سامنے آ جاؤ اگر تم بڑے شیر بنتے ہو یاد رکھنا میرا نام بھی نواز خان ہے اگر میں یہاں تک تمہارے پیچھے آ سکتا ہوں خود تمہارے علاقے میں تو یہاں سے جہاں بھی جاؤ گے میں تمہارے پیچھے ہوں گا۔ میری اس آواز پر بلال شاہ حیرانگی سے میری طرف دیکھ رہا تھا آواز کی گونج چٹانوں میں تھی یہ گونج ختم نہیں ہوئی تھی کہ قریب سے ہی ایک اونچا قہقہہ لگا اور کوئی زور سے بولا مجھے پکڑ سکتے ہو تو پکڑ لو۔ اچھا تھا گور بخشن کو ہی ساتھ لے آتے آواز سن کر میرا خون کھول گیا۔ سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کروں کہ پھر گولی چلی۔ میں نے چونک کر سامنے دیکھا ہردیال زمین پر گرا تڑپ رہا تھا پھر قہقہہ لگا تمہیں یہاں لانے والے کا دیکھ لو کیا حشر ہوا ہے۔ یہ قہقہہ میری برداشت سے باہر ہو گیا۔

میں نے ایک جھاڑی کا اندازہ لگا کر فائر کیا۔ ہلکی سی چیخ نکلی اور ایک لمبا چوڑا مضبوط آدمی جھاڑیوں سے نکل کر میری طرف آیا۔ ایک ہاتھ میں رائفل، رنگ سانولا بڑی بڑی مونچھیں، قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ اس میں بلا کی پھرتی تھی بلال شاہ نے اس کے قریب آنے سے پہلے ہی اس پر چھلانگ لگائی لیکن وہ واقعی چھلاوہ تھا۔ مجھے دھوکہ دینے کے لئے میری طرف آیا تھا مقصد اس کا یہی تھا کہ قریب کی دوسری جھاڑیوں میں غائب ہو جائے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ بلال کی چھلانگ ہوا میں ہی رہی اور نلوہ سانپ کی طرح دوسری طرف کی جھاڑیوں میں رینگ گیا۔ ہردیال ختم ہو چکا تھا اور اس علاقے میں ہم انجان تھے۔ ہمارا مقابلہ نلوہ سنگھ سے تھا جو اس علاقے کا چپہ چپہ جانتا تھا۔ میری طبیعت بے چین ہو رہی تھی مجھ پر چلائی گئی گولی سے ہڈی نہیں ٹوٹی تھی البتہ گوشت پر ہلکا سا زخم آیا تھا۔ یہ وقت مرہم پٹی کا نہیں تھا۔ میں نے بلال کا ہاتھ پکڑا اور ہم بھی اندازے سے انہی جھاڑیوں میں رینگ گئے یہ جھاڑیاں صرف ایک فرلانگ تک ہی پھیلی ہوں گی۔ اس کے بعد ہم باہر تھے میں باہر نکل کر جو کچھ دیکھ رہا تھا اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سامنے نیچی جگہ تھی جیسے کسی نے زمین کو نیچے دبا دیا ہو اس کے بعد ٹیلا اونچائی زیادہ نہ تھی لیکن دور تک پھیلا ہوا تھا۔ نلوہ ٹیلے کی آدھی بلندی طے کر کے نیم دائرے کی شکل میں پرلی طرف اتر رہا تھا دیکھتے دیکھتے وہ غائب ہو گیا۔ میں نے اور بلال شاہ نے دوڑ لگا دی اب اگر نلوہ ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا تو پھر وہ غائب ہو جاتا۔ ہم اسے شاید تلاش نہ کر سکتے۔ ٹیلے کے پچھلی طرف پہنچے تو روح فنا ہو گئی۔ ایک گہری دراڑ یہاں موجود تھی۔ ہزاروں فٹ گہری اس میں درخت لٹکے ہوئے تھے ان کی جڑیں اس دراڑ کے کناروں میں تھیں کبھی کوئی چٹان کا ٹکڑا آ کر دراڑ میں خوفناک آواز پیدا کرتا۔ نیچے گہرائی کی طرف جاتا سنائی دیتا تھا۔ اس پر ایک درخت کا تنا جھکا ہوا تھا نلوہ اس پر سے گزر کر دوسری طرف جا چکا تھا میں نے اس تنے پر چھلانگ لگائی اور بلال شاہ سے کہا کہ پیچھے آ جاؤ کوئی ایک سو فٹ کا فاصلہ ہم نے پل صراط کی طرح طے کیا۔ پل سے نکل کر ترائی میں آئے تو سامنے ہی لکڑی کے تختوں سے بنا شکاریوں

کا کیبن تھا۔ نلوہ اس میں گھس گیا تھا ہم ایک بڑے سے پتھر کی آڑ لے کر بیٹھ گئے اب میں نلوہ سنگھ کو مزید مہلت نہیں دے سکتا تھا میں نے بلال شاہ سے کہا کہ وہ حملے کے لئے تیار ہو جائے۔ میں نے اپنا سروس ریوالور اور بلال شاہ نے اپنا دیسی پستول نکال لیا اور ہم کیبن کے دروازے کی طرف دوڑ پڑے دروازے سے دور ہی تھے کہ اندر سے نلوہ کا فائر آیا۔ میں نے اور بلال نے شاید اکٹھے فائر کئے گولیاں دروازے سے گزر گئیں میں نے پھر فائر کیا میری آواز میں بہت سخت غصہ تھا۔ ”نلوے! باہر آ جاؤ میرا نام نواز خان ہے اور میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

”میرا نام بھی نلوہ ہے! ادھر سومیل کے دائرے میں گجراج سنگھ کا راج ہے اور میں اس کا ملازم ہوں یہ سومیل گزارو گے تو اس حد سے باہر نکلو گے۔“

میں نے شدید غصے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی دو سو گز کی چڑھائی کے بعد جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ درختوں کی جھگیاں بنی ہوئی تھی آسمان نظر میں نہیں آتا تھا غصے کی حالت میں میرے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ نکل گئی۔ میں نے سوچا کہ دیکھا جائے گا اور اٹھ کر کیبن کی طرف آخری چھلانگیں لگانا شروع کر دیں اندر سے نلوے نے فائرنگ کھول دیا۔ صرف ایک گولی میرے بازو سے ٹکرائی وہ بھی خطرناک ثابت نہ ہوئی میرے ٹھڈے نے کیبن کا دروازہ دھڑاک سے کھول دیا اندر اندھیرا سا تھا ایک دو سیکنڈ میں نے بہت ہی خطرناک حالت میں گزارے نلوہ کافی دیر سے اندر تھا اور اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھ سکتی تھیں میں تازہ باہر سے آیا تھا اس لئے ایک دو سیکنڈ کچھ نظر نہیں آیا۔ اس عرصے میں نلوہ مجھے گولی مار سکتا تھا لیکن شاید اس وجہ سے نہ مار سکا کہ میرے پیچھے ہی بلال شاہ اندر گھس آیا تھا میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے لگیں یہ کوئی

پچاس فٹ لمبا اور تیس فٹ چوڑا لکڑی کا کمرہ تھا۔ لکڑی کے شہتیروں پر جھاڑیاں ڈال کر چھت بنائی گئی تھی لکڑی کی چارپائی تھی جس پر لکڑی کے تختے لگے ہوئے تھے۔ سامنے کی دیوار پر چیتے اور جنگلی جانوروں کے سر لگے ہوئے تھے۔ یہ مہاراجہ کے شکاریوں کے کیبنوں میں سے ایک تھا۔

ایک کونے میں تہہ کی ہوئی کھالیں تھیں۔ سارے کمرے میں وحشی جانوروں کی ان کھالوں کی بدبو تھی کیبن کے اندر ایک اور دروازہ تھا۔ شاید یہ کیبن اندر سے دو حصوں میں تقسیم تھا۔ نلوہ اس دروازے کی طرف کھسکا مگر میرے ٹھڈے نے اس کے پیٹ میں ہلچل مچا دی ہوگی میں اسے ٹھڈوں پر رکھنے ہی والا تھا کہ بلال شاہ نے اسے جپھے میں لے کر زمین پر دھڑام سے گرا دیا۔ مجھے حیرانگی ہوئی چھ فٹا یہ ڈاکو اور بلال کے ایک ہی رگڑے سے زمین پر جا گرا پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا تھا ہم دونوں نے اسے وحشیوں کی طرح مارا۔ میں کسی عورت کی چیخوں سے ہوش میں آیا۔ نلوہ جس دروازے کی طرف لپکا تھا اس میں ایک نوجوان عورت نما لڑکی کھڑی تھی آنکھوں میں آنسو اور منہ پر ہاتھ رکھے وہ بری طرح رو رہی تھی۔ بلال کا ہاتھ رک گیا اور میں نے بھی ایک لمحہ بھر نلوے کی طرف سے دھیان ہٹایا اسی وقت ہی نلوہ اتنی مار کے باوجود کھسکا اور اس کی رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اس عورت کو گھسیٹ لیا نلوہ مجھ پر فائر کرنے ہی والا تھا کہ رک گیا۔ اس کے منہ سے خون کی لکیر نکل رہی تھی بلال کے گھونسوں سے اس کے ہونٹ پھٹ چکے تھے۔ اس کی نظر میرے چہرے پر ٹھہر نہیں رہی تھی۔ بلوندر کو چھوڑ دو۔ اس نے زمین پر خون تھوک کر بڑی نفرت سے میری طرف اشارہ کیا۔ میں نے بلوندر کو

آگے کی طرف دھکا دیا نلوہ میری طرف بڑھا اس کی انگلی بندوق کے گھوڑے پر تھی اور یہ آدھا دب چکا تھا کہ بلال کی لات نے اس کا منہ نلوے کی طرف اٹھا دیا اور پھر گولی کے دھماکے کے ساتھ ہی نلوے کا منہ گوشت کا بڑا سا لوتھڑا نظر آنے لگا۔ وہ دائرے کی شکل میں گھوم کر زمین پر جا پڑا۔ بلوندر تیر کی طرح اس پر گری اور چیخیں مار کر رونے لگی اس کی چیخوں کے ساتھ ہی اس کمرے سے ایک اور عورت برآمد ہوئی اور نلوے کی لاش سے چمٹ گئی یہ ہری سنگھ کی بیوی تھی۔

نلوہ سنگھ مر چکا تھا۔

چند لمحے تو میں اور بلال اپنے حواس درست کرتے رہے جس قاتل کو میں پکڑنے آیا تھا وہ اپنی ہی گولی سے ختم ہو چکا تھا۔ میں نے بلوندر کو اپنے پتا کی لاش پر جی بھر کر رونے دیا پھر ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوا۔ یہاں آئے تو ہم دو تھے واپسی پر ہمارے ساتھ ایک جوان لڑکی اور اس کی چاچی دو لاشیں بھی ہونا تھیں۔ نلوہ سنگھ اور ہردیال کی لاشیں یہاں آتے ہوئے ہردیال ہمیں جس راستے لایا وہ تھوڑا بہت میرے ذہن میں نقش ہو گیا تھا ہم نے نلوہ کی لاش وہیں چھوڑی اور بڑی مشکل سے بلوندر کور اور چاچی کو ساتھ لے کر واپس باجور پہنچے۔ داروغہ گجراج سنگھ ہماری تلاش میں تھا اور سخت غصے کی حالت میں تھا۔ میں نے اسے ٹھنڈا کیا کہ اگر وہ کسی راجواڑے کا تھانے دار ہے تو میں انگریز حکومت کا ملازم ہوں اور اس کے خلاف وائسرائے کے دفتر میں شکایت بھی کی جا سکتی ہے۔ اسے عقل آ گئی۔ میں نے اسے ہردیال اور نلوہ کی لاشیں اٹھوانے کا کہا اور بلوندر اور اس کی چاچی کو لے کر اپنے علاقے میں آ گئے۔

ہری سنگھ اپنے بھائی کی موت پر باولا سا ہو گیا۔ کیس کا چالان تیار کرنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئی ہری سنگھ نے اقبالی بیان دے دیا اور عدالت میں بھی اپنے بیان پر قائم رہا چونکہ نلوہ مارا گیا تھا اس لئے اس کیس میں بڑے ملزم کی مدد کرنے پر اس کے بھائی کو عدالت نے عمر قید کی سزا دی بعد میں دلبر سنگھ نے اوپر والی عدالتوں میں اپیلیں کیں جس کے بعد یہ سزا سات سال میں تبدیل ہوئی۔

دلبر کے گھرانے میں سے اس کا ماما قتل ہو چکا تھا ایک چچا قتل ہو گیا دوسرا قید ہو گیا۔ ماں اور بلوندر کی دیکھ بھال اس پر آ پڑی تھی ایک دن وہ مجھ سے مشورہ کرنے تھانے آ گیا۔ وہ فوج چھوڑ کر کھیتی باڑی کرنا چاہتا تھا میں نے اسے مشورہ دیا کہ ایسا نہ کرے۔ گوربخش سنگھ کے گھر والوں نے اس کی زندگی حرام کر دینا تھی۔ فوج میں اسے حفاظت تو مل سکتی تھی میرے مشورے پر اس نے عمل کیا بلوندر سے شادی کر کے اسے اور ماں کو چھاؤنی ساتھ لے گیا گوربخش سنگھ مجھ سے ناراض ہی رہا۔

وہ نلوہ کو قتل کرانا چاہتا تھا اور میری ڈیوٹی کو اپنے انتقام کی آگ میں رکاوٹ سمجھتا تھا۔ میں نے رگھوبیر سنگھ کو صاف کہہ دیا کہ اپنے باپ کی زمینداری کی دھونس چلانی چھوڑ دے اپنی بدمعاشیوں میں وہ دو بھائی مروا چکا ہے ایسا نہ ہو کہ اب باپ کو بھی مروا لے یا خود پار ہو جائے۔ میری [illegible] میں تعیناتی تک تو رگھوبیر اپنی حرکتوں سے باز ہی رہا۔ دلبر سنگھ کبھی کبھار مجھے ملنے آ جاتا تھا خدا جانے اب کہاں اور کس حال میں ہو گا۔ آج بھی کبھی کبھی مجھے نلوہ کے ساتھ مقابلہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

یہ کچھ کہنے اور سننے کی بات نہیں آج اسلامی جمہوریہ پاکستان اسلام اور جمہوریت تو خیر بس تکلف کے لئے ہی رہ گئی ہیں جبکہ زندگی کے تمام شعبوں پر مافیا کا راج ہے۔ لینڈ مافیا اس ملک میں سب سے زیادہ مضبوط ہے۔ اس کے علاوہ مہنگائی مافیا' بلیک مارکیٹنگ مافیا' منشیات مافیا' ٹارگٹ کلنگ مافیا اور نہ جانے اس طرز کے کتنے مافیا ہیں جنہوں نے اس ملک کے مظلوم عوام کا جینا حرام اور زندگی کو جینے کی سزا بنادیا ہے۔

جرائم کو کنٹرول کرنیوالی پولیس فورس جس کا قبلہ کبھی درست نہ ہوسکا حتیٰ کہ اعلیٰ عدلیہ نے بھی اس کو لاعلاج قرار دے دیا اب نہ جانے کس بھلے کی تجویز پر پنجاب پولیس کی وردی کا رنگ تبدیل کرنے کا منصوبہ بنایا جارہا ہے۔ جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ بجٹ میں وردیوں کے لئے رقم مختص کی جائیگی۔ ذرائع کے مطابق آئی جی پنجاب سے لیکر ایک پولیس کانسٹیبل تک کی وردی تبدیل ہوگی۔ مگر سوال یہ ہے کہ وردی کا رنگ تبدیل کرنے سے کیا پولیس والوں کی ذہنیت اور سوچ بھی بدل جائے گی کیا وہ جرائم مافیا کی سرپرستی چھوڑ دے گی اور سیاسی اثرورسوخ سے بھی باہر نکل آئے گی۔ کیا وردی کا رنگ تبدیل کرنے سے وہ عوام دوست بن جائے گی اور کیا اس سے ہمارے تھانے جو خوف کی علامت بن چکے ہیں وہاں سے عوام کو ٹھنڈی ہوائیں آیا کریں گی یقیناً ایسا ہرگز نہیں ہے اور اگر وردی کا رنگ تبدیل کرنے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تو پھر کیوں یہ تکلف کیا جارہا ہے اگر اس بہانے کسی گارمنٹس کمپنی کو ٹھیکے کے ذریعے فائدہ پہنچانا مقصود ہے تو اس کے اور کئی طریقے ہیں ایسے میں وردی تبدیل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

اگر پولیس کی کارکردگی دیکھنی ہو تو کسی ایک دن کا کوئی بھی قومی اخبار اٹھا کر دیکھ لیں اور ایک دن میں ہونے والی قتل چوری ڈکیتی اور زنا بالجبر کی وارداتوں کا جائزہ لے لیں اس سے آپ کو خود اندازہ ہوجائے گا کہ ہماری پولیس کیا کررہی ہے یہاں ہم ایک ہی دن کی جرائم کی کچھ خبروں کو حوالے کے طور پر پیش کرنا چاہیں گے۔

1۔ لاہور میں 14 سالہ لڑکا زیادتی کے بعد قتل، لواحقین اور اہل علاقہ کا شدید احتجاج۔

2۔ فیصل آباد میں کمسن لڑکے کی لاش برآمد۔

3۔ سانحہ پولیس لائنز میں حملہ آور کی معاونت کرنے والے دو پولیس اہلکار گرفتار۔

4۔ ماڈل بننے کی خواہش مند لڑکی اریبہ کی آبرو ریزی کرکے ملزمان اس کی لاش بیگ میں ڈال کر لاری اڈے پر چھوڑ آئے۔

5۔ اسلام آباد باتھ روم سے غیر ملکی صحافی کی لاش برآمد' خاتون صحافی کا تعلق روس سے ہے۔ جسم پر تشدد کے کوئی نشانات نہیں۔

6۔ لاہور میں دیرینہ دشمنی پر 25 سالہ نوجوان کو قتل کردیا گیا۔

7۔ شاہدرہ ٹاؤن پولیس نے چیکنگ کے بہانے 200 ڈالر اُڑا لئے۔

8۔ جوہر ٹاؤن میں 45 سالہ شخص اغوا کے بعد قتل' بوری بند لاش برآمد۔

بظاہر ان وارداتوں کی ذمہ دار پولیس نہیں۔ عوام اس وقت مہنگائی بیروزگاری اور لوڈشیڈنگ کے باعث ذہنی دباؤ کا شکار ہیں اس کے نتیجہ میں قتل' خودکشیاں اور دیگر وارداتیں ہورہی ہیں ان جرائم کی روک تھام کے لئے اولین شرط تو یہ ہے کہ حکومت عوام کی معاشی بدحالی کا سدباب کرے۔ خاص طور پر سستا اور فوری انصاف مہیا کرے مگر حکومت کا اپنا یہ حال ہے کہ ہر قومی ادارہ کرپشن اور لوٹ مار کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ سیاسی بنیادوں پر بھرتی کئے گئے نااہل بیوروکریٹس جنہیں حکومت کی آشیرباد حاصل

ہے وہ خود بھی بہتی گنگا سے ہاتھ دھو رہے ہیں اور اپنے سرپرستوں کو بھی فائدہ پہنچا رہے ہیں کونسا ایسا محکمہ ہے جس کے ذمہ داران کے ہاتھ کمیشن رشوت اور کرپشن سے نہیں رنگے ہوئے حتیٰ کہ قومی کھیل کرکٹ کو جوا مافیا نے ہائی جیک کرلیا ہے۔ قومی وقار اور عزت کو بیچا جارہا ہے اور جس قومی کرکٹ ٹیم کا چیف سلیکٹر ورلڈ کپ کے دوران کسینو میں پایا جائے اور ٹیم کرکٹ کی گراؤنڈ میں ذلت آمیز شکست پر شکست اٹھائے جارہی ہو اس کے بارے میں بھی چیئرمین پی سی بی یہ کہیں کہ وہ جائزہ لے رہے ہیں ثبوت ملیں گے تو کارروائی کریں گے یہ سب ملی بھگت نہیں تو اور کیا ہے۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کچھ سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوتا ہے۔ چوری کرنے اور چور پکڑنے والے دونوں ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہیں انصاف کہیں بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا کہ جب قانون سازی کرنے والے اداروں کے ارکان بھی ہارس ٹریڈنگ کریں گے تو پھر اس ملک میں قانون کی عملداری اور بالادستی کہاں ہوگی اگر ان اداروں میں بیٹھے لوگ اتنے ہی ایماندار ہوتے تو حکومت کو ہارس ٹریڈنگ روکنے کے لئے آئینی ترمیم کا فیصلہ کیوں کرنا پڑتا۔

ذرائع کے مطابق آئینی ترمیم پر اپوزیشن سے مشاورت آخری مرحلے پر ہے اب یہ بھی تجویز ہے کہ انتخابات خفیہ بیلٹ کی بجائے شو آف ہینڈ سے کرائے جائیں مگر سوال یہ ہے کہ آئینی ترمیم سے ارکان کو ہارس ٹریڈنگ سے روکا تو جاسکتا ہے مگر ان کے ذہن اور سوچ کو تو تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ انہیں جب بھی موقع ملے گا قانون سے بچ بچا کر وہ وہی کچھ کریں گے جس مقصد کے لئے وہ منتخب آئینی اداروں میں آکر براجمان ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ قومی خسارے پورے کرنے کے لئے جب بھی

انجام

میرے گاؤں سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک دوسرا گاؤں ہے۔ وہاں شیرا فقیر نامی ایک شخص رہا کرتا تھا۔ تقریباً چھ فٹ قد تھا اُس کا۔ آواز خوب کراری تھی۔ ''ہیر'' شوق سے گایا کرتا، لیکن تھا بہت ہی جاہل، اکھڑ مزاج، ماں سے بہت بدتمیزی سے پیش آتا، گالیاں دیتا اور ہاتھ بھی اُٹھانے سے دریغ نہ کرتا۔ شیرے کی شادی ہوئی تو اُسے بیوی نیم پاگل سی ملی۔ وہ اُس کی بدمزاجی اور غصیلے پن کی وجہ سے مکمل پاگل ہوگئی۔ بچے ہوئے تو وہ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے معذور تھے۔ شیرے کا حشر بڑا ہی عبرت ناک ہوا۔ اس کے سگے بھانجے نے اُسے نہر کے کنارے پر گولی مار کر قتل کر دیا۔ وہ گرفتار ہوا، مگر چھ ماہ بعد ہی ضمانت پر رہا ہوکر آ گیا کہ کوئی بھی شخص قاتل کے خلاف گواہی دینے پر تیار نہیں ہوا تھا۔

جی ایس ٹی کا نفاذ ہوتا ہے یا اضافی ڈیوٹی لگائی جاتی ہے اس کا سارا بوجھ غریب عوام پر ہی ڈال دیا جاتا ہے مگر جو با اثر اور با اختیار لوگ یہاں سے دولت غیر قانونی ذرائع سے سمیٹ کر باہر منتقل کردیتے ہیں ان سے کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں ذرائع کے مطابق 24 ارکان پارلیمنٹ نے بیرون ملک اثاثوں کا اعتراف کرلیا ہے۔ جمع کرائے گئے گوشوارے میں 1173 میں سے 715 نے کوئی جواب ہی نہ دیا 80 فیصد سے زائد ارکان نے آمدنی میں گزشتہ سال اضافہ یا کمی کا کوئی جواب نہ دیا جن 24 ارکان پارلیمنٹ کا تذکرہ کیا گیا ہے بیرون ملک ان کے اثاثوں کی مالیت 1.4 ارب روپے بتائی جاتی ہے ان میں 620 ملین روپے کی جائیداد 6 ایم این ایز کی ملکیت ہے جبکہ 62 ملین کی جائیداد 4 سینٹرز' 500 ملین روپے کی جائیداد پنجاب اسمبلی

”فرق“

ایک فقیر آم والے کی دکان پر گیا اور اس سے کہنے لگا کہ اللہ کے نام پر ایک آم دے دو۔ دوکان دار نے ایک خراب سا آم فقیر کو دے دیا۔ پھر فقیر نے دس روپے کا نوٹ نکالا اور بولا کہ اس کا بھی آم دے دو۔ دکان دار نے ایک اچھا سا آم اٹھا کر اسے دے دیا۔ فقیر بولا۔ ”اللہ میاں! دیکھ لے اس شخص نے تجھے کیا دیا ہے اور مجھے کیا دیا ہے۔“

انڈونیشیا کا شہر ”باتم“ جہاں شور مچانے والوں کو داخل نہیں ہونے دیا جاتا

باتم، انڈونیشیا کا شہر ہے۔ یہ شہر دراصل ایک جزیرہ ہے۔ صنعتی شہر ہونے کے ساتھ ساتھ باتم میں سیر وتفریح کے لیے دل چسپی کی بہت سی چیزیں اور مقامات ہیں۔ اس کے خوب صورت قدرتی نظارے سیاحوں کے لیے کشش رکھتے ہیں۔ باتم کا سنگاپور سے فاصلہ محض بیس کلومیٹر ہے۔ روزانہ سنگاپوری شہریوں کی بڑی تعداد سیر وتفریح کی غرض سے اس شہر کا رخ کرتی ہے تاہم اس کے لیے انھیں امیگریشن کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ باتم جانے کے خواہش مندوں کو امیگریشن آفس سے اجازت نامہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ سنگاپور کے باشندے باتونی ہونے کی بے شہرت نہیں رکھتے، تاہم یوں معلوم ہوتا ہے کہ انڈونیشی امیگریشن حکام کو ان کی معمولی بات چیت بھی پسند نہیں۔ اسی لیے باتم کی سیر کرنے کے خواہش مندوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ امیگریشن آفس کے باہر قطار میں بالکل خاموش کھڑے ہوں، بصورت دیگر انھیں دفتری حدود سے نکال باہر کیا جائیگا اور باتم میں رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ لگتا ہے کہ سنگاپوریوں [illegible] بھی تک اس ہدایت کو سنجیدگی سے نہیں لیا اس [illegible] روزانہ درجنوں شہری امیگریشن [illegible] سے غصے اور مایوسی کے عالم میں واپس لوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔

کے 7 اراکین جبکہ 215 ملین روپے کی جائیداد سندھ اسمبلی کے اراکین کی ملکیت ہے۔

پہلے جرائم سے لیکر منتخب آئینی اداروں کے اراکین کی کرپشن تک جن واقعات کا ہم نے ذکر کیا ہے کیا اس کے بعد ہم اس ملک کے روشن مستقبل کا خواب دیکھ سکتے ہیں؟ ذرا اور آگے بڑھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ روشن مستقبل کے لئے کسی بھی قوم کے لئے تعلیم اور صحت شرط اولین ہوتی ہے مگر یہی دو شعبے ہیں جہاں جی بھر کر کرپشن اور لوٹ مار کی جاتی ہے پچھلے دنوں ہائر ایجوکیشن کے سرکاری شعبے میں کروڑوں کی کرپشن کا سکینڈل سامنے آیا جس کی انکوائری جاری ہے جہاں تک صحت کا تعلق ہے تو اس کا بھی اللہ ہی حافظ ہے۔ مثلاً مغربی ممالک میں جن ادویات کی ایکسپائری ڈیٹ میں چند ماہ باقی رہ جاتے ہیں وہ ادویات 25 فیصد پر ہمارے ملک کی کمپنیاں خرید لیتی ہیں اور ان پر نئے سرے سے ایکسپائری ڈیٹ لکھ کر اپنے ہم وطنوں کو کھلا دی جاتی ہیں۔ اس سے کتنی انسانی جانیں ضائع ہوتی ہیں اور کتنے لوگوں کی صحت برباد ہوتی ہے اس سے کسی کا کوئی تعلق نہیں۔ ہم دوست ملک چین کی ترقی پر تو رشک کرتے ہیں مگر اس ترقی کا راز جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ چین دنیا کا واحد ملک ہے کہ جہاں کرپشن کی سزا موت ہے جبکہ ہمارے ہاں کرپشن کو چالاکی ہوشیاری اور ذہانت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس وقت من حیث القوم اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہمارا کردار کیا ہے اور کیا ہم ایک زندہ و پائندہ قوم کہلانے کے حقدار ہیں۔ اس کا جواب ریاست کے ذمہ داران کو دینا چاہیے کہ جن کے پاس پورا اختیار اور وسائل ہیں غریب عوام کا کیا دوش [illegible] بھیڑ بکریاں ہیں [illegible] طرف ہانکا جائے وہ چل پڑتے ہیں۔

مقابلہ

• صغیر ملال

مرغوں کے ایک مقابلے کی رُوداد، مُرغوں کے لیے یہ بقا کی جنگ تھی، مُرغ بازوں کے لیے غیرت وحمیت کی!

دونوں مرغے اب اس حالت کو پہنچ چکے تھے جب وجود میں زندگی کے آثار آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگے تھے اور اعضاء میں موت کے سائے ناتوانی کی شکل میں پھیلتے ہیں اور اعلیٰ حسب نسب والے جانوروں کو احساس ہوجاتا ہے کہ مدمقابل بہت سخت جان اور ضدی نکلا۔

دونوں مرغوں کو لڑتے تین گھنٹے گزر چکے تھے اور فضا پر ہول ناک سکوت طاری تھا۔ دونوں حریف اب اس حالت کو پہنچ چکے تھے جب وجود میں زندگی کے آثار آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگتے ہیں اور اعضا میں موت کے سائے ناتوانی کی شکل میں پھیلتے ہیں اور اعلیٰ حسب نسب والے جانوروں کو احساس ہوجاتا ہے کہ مدمقابل بہت سخت جان اور ضدی نکلا اور ان کی آخری خواہش یہ رہ جاتی ہے کہ وہ خود مرنے سے پہلے اسے بھی مرتے ہوئے دیکھ لیں حملہ کرنے اور مدافعت کی تمام قوت اور صلاحیت خرچ کردینے کے بعد وہ ایک دوسرے کے سینے سے سینہ جوڑ کر کھڑے ہوجاتے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ فقط حریف کا جھکا ہوا سر اٹھنے کا انتظار

کر رہے ہیں تاکہ دوبارہ حملہ آور ہوں لیکن ان کی کانپتی ہوئی ٹانگوں اور بار بار بدن سے چپک جانے والے پروں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اچھی نسل والوں نے پیٹھ دکھانے کے بجائے موت قبول کر لی ہے اور اس طرح ایک بار پھر ثابت ہوتا ہے کہ اصیل جانوروں کا حق ہے کہ ان کی ناز برداری کی جائے اور انہیں بہترین خوراک مہیا کی جائے اور ان کی تربیت تجربہ کار ہاتھوں سے انجام پائے۔ زمین کو ان کے خون کے آخری قطروں سے رنگین ہوتے دیکھ کر ان کے مالکوں کا جی چاہتا ہے کہ کسی طرح تماشائیوں کی آنکھیں بند ہو جائیں تاکہ وہ اپنے جاں نثار کو مرنے سے پہلے گود میں اٹھا سکیں اور یقین دلا سکیں کہ اس کی تکلیف سے انہیں کس قدر دکھ پہنچا ہے اور یہ کہ اس کی دلیری انہیں زندگی بھر یاد رہے گی۔

آس پاس کے باغوں میں بہار کی پہلی نشانی آلوچوں کے سفید پھولوں کی شکل میں ظاہر ہو چکی تھی اور بکریاں پالنے والے خانہ بدوش میدانوں سے واپسی کا سفر اختیار کر چکے تھے اور ان دنوں حسب دستور راستے میں پڑنے والے قصبے کے نواح میں ڈیرے ڈال کر پہاڑوں پر لوٹنے سے قبل چوٹیوں کی طرف پگھلنے کا انتظار کر رہے تھے موسم کھلتے ہی شان پور کا کہر بستہ سکوت ٹوٹ گیا تھا اور گھروں کے فرش اور دیواروں پر ایک مرتبہ پھر چیونٹیوں کی قطاریں نمودار ہو گئی تھیں اور صبح دم چھتوں اور دریچوں سے چڑیوں کی چہچہاہٹ زندگی کی سخت جانی کا ثبوت بن کر اُبھرنے لگی تھی اور ڈھولک کی تھاپ اور شادی کے گیتوں کی آوازیں راتوں کی خاموشی میں دُور دُور تک سنائی دینے لگی تھیں۔

ندی کے کنارے موسم بہار کا پہلا جوڑ شروع ہوئے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔

لڑائی کے ابتدائی لمحوں میں بھی ایسی ہی خاموشی طاری ہوئی تھی جب خانہ بدوشوں کا ''سنہرا'' چھوٹتے ہی زور آوری کرتا ہوا ریاست والوں کے ''ست رنگے'' کو دھکیلتا چلا گیا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ست رنگے پر رقمیں لگانے والوں کے اندازے غلط تھے اور خانہ بدوشوں کے سنہرے مرغے کا بھاری تن و توش چربیلا نہیں تھا۔

''قندھاری نسل ہے۔'' ایک بوڑھا چیخا تھا اور شان پور والوں کا ہذیانی شور یک لخت ماند پڑ گیا تھا لیکن جب دوسرے ہولے میں ریاستی اصیل نے اپنے گٹھے ہوئے بدن کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے انتہائی پھرتی سے پھینٹیاں مارنی شروع کیں تو خانہ بدوشوں کا بھاری بھرکم سنہرا چکرا کر اُلٹے قدموں زمین چھوڑتا چلا گیا تھا۔

''رام پوری خون ہے۔'' وہی بوڑھا چلایا تھا اور مجمع ایک مرتبہ پھر جھومنے لگا تھا۔

انہی اچھالوں کے دوران ست رنگے نے ایک ایسی نشست باندھی تھی کہ اس کے دائیں پنجے کے ٹوٹے ہوئے خار پر بندھا ہوا پیتل کا نوکیلا انگوٹھا خانہ بدوشوں کے مرغ کی بائیں آنکھ چھیدتا چلا گیا تھا اور بے گھروں کی ٹکڑی میں کسی نے زور سے ''آ...... ہاں'' کہہ کر اپنا سینہ کوٹا تھا۔

''کانا پرندہ آدھا وجود ہوتا ہے۔'' حکیم جی نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے ظہور کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

''اب اسے اپنی اکیلی آنکھ سامنے رکھنی پڑے گی۔'' ظہور کے ماموں نے ایسے سینکڑوں جوڑ دیکھے تھے۔

''اسی لئے کہتے ہیں کہ اندھا ہونے سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ کانا ہونے سے بچا

جائے۔'' دوسرے ماموں نے اپنے سیانے ہونے کا ثبوت پیش کیا تھا۔

ظہور احمد کا اُڑا ہوا رنگ اس کے چہرے پر واپس آ گیا تھا۔ پہلا پانی کرانے تک ریاست کے ست رنگے نے خانہ بدوشوں کے شاندار مرغے کا سراپا بگاڑ دیا تھا۔ اس کی ضائع ہو جانے والی آنکھ کی جگہ پڑ جانے والے گڑھے میں بار بار خون کا ایک جیتا جاگتا قطرہ تشکیل پا کر زمین پر ٹپک جاتا تھا۔

ہنگامہ پانیوں کی بات پر ہوا تھا۔ پانی کے وقفے کے بعد دیکھنے والوں کو ایک مرتبہ پھر یوں محسوس ہوا تھا جیسے بے گھروں کا سنہرا کچھ دیر میں ست رنگے کے پرخچے اُڑا دے گا۔ اس نے پانی کے بعد چھوٹتے ہی گردن اونچی کر کے ریاست کے پرندے کو کلغی کے پیچھے سے پکڑ کر اوپر تلے تین ایسی پٹخنیاں ماری تھیں جن سے ست رنگا لڑکھڑا گیا تھا اور مجمع پر دوسری مرتبہ خاموشی طاری ہو گئی تھی۔

''صدقے'' خانہ بدوشوں کی ٹکڑی میں سے کوئی پکارا تھا۔ ''اول تو شان پور والوں کو ریاست کے جانور کا جوڑ اپنے کسی پالتو سے کرانا چاہیے تھا۔'' حکیم صاحب نے ظہور کے کان میں کہنے کی کوشش کی تھی۔ ''ہم نے تو نہیں سنا کہ راجوں نے کبھی چنگڑوں اور بکریالوں سے جوڑ ڈالے ہوں۔''

''بکریاں پالنا پیغمبری پیشہ ہے حکیم جی!'' ظہور کے ماموں نے حکیم صاحب کی بات سن لی تھی۔

''بکریال بے گھر ضرور ہوتے ہیں مگر مردار نہیں کھاتے۔ چنگڑوں سے ان کا کیا تعلق ہے؟'' دوسرے ماموں نے کہا تھا۔

''مگر ریاست میں پانی ایک ہوتا ہے۔ جانوروں کے گرم ہونے کے فوراً بعد پھر وہ ہوتے ہیں اور کھلا میدان ہوتا ہے شان پور والوں کی طرح ہم چار پانی نہیں کراتے۔ یہ زنانہ طریقہ ہے۔'' حکیم صاحب کے جواب سے ظہور سناٹے کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ شان پور بہرحال اس کی ماں کا قصبہ تھا۔

''حکیم جی! جو جانور چار پانیوں والے جوڑ کے لئے تیار کیا جائے اس کے لئے ایک پانی کی تکلیف تو سمجھ میں آتی ہے مگر ایک پانی کے عادی کو چار پانیوں سے کیا نقصان ہو سکتا ہے؟'' ظہور کے ننھیالی رشتے داروں میں سے کوئی بولا تھا۔

''ہم خدمت گار ساتھ نہیں لائے۔'' حکیم صاحب کے لہجے کی پریشانی چھپی نہیں رہی تھی۔ دوسرے پانی پر شان پور والوں کے اپنے آدمی ریاست کے مرغے کی خدمت کے لئے حاضر ہو گئے تھے۔ لیکن پانی کے دوسرے وقفے کے بعد بھی خانہ بدوشوں کا مرغا ریاست والوں کے ست رنگے پر بھاری پڑنے لگا تھا۔

''یہ کیا بات ہے حکیم جی! کہ وقفے پر بے گھروں کا پرندہ ہمارے جانور سے زیادہ تازہ دم ہو جاتا ہے؟'' ظہور حیرت سے بولا تھا۔ حکیم صاحب نے اپنا منہ ظہور کے کان کے نزدیک لا کر سرگوشی کی تھی ''خانہ بدوش اپنے ساتھ مرغی بھی لے کر آئے ہیں اور وقفے پر اپنے مرغے کو آواز دینے کے بجائے اسے مرغی کے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اس سے ان کے جانور کی طبیعت کھلتی ہے اور وہ پھر جان پکڑ جاتا ہے۔''

''لیکن ہم تو کبھی ایسا نہیں کرتے۔''

''یہ صرف ان زناکاروں کا طریقہ ہے۔'' حکیم صاحب بڑبڑائے تھے۔ لیکن ریاست کے

اصیل پرندے نے اپنے سے کہیں زیادہ بھاری حریف کے حملے جی داری سے برداشت کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر اسے واپس رگیدنا شروع کردیا تھا۔ اس دوران اس کا سینہ چھلنی ہوگیا تھا اور اب دیکھنے والوں کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوگیا تھا کہ زمین پر گرنے والا خون خانہ بدوشوں کے سنہرے کی پھوٹ بہنے والی آنکھ سے ٹپکا ہے یا ست رنگے کے سینے اور گردن کی کٹی ہوئی شریانوں سے ابل پڑا ہے کچھ ہی دیر بعد وہ مرحلہ آ گیا تھا جب دونوں جان دار ایک دوسرے کے لہولہان وجود سے یوں لپٹ گئے تھے جیسے اپنا بوجھ اپنے حریف کی ٹانگوں پر ڈالنا چاہتے ہوں۔

تیسرے پانی پر حکیم صاحب نے گڑ اور باداموں اور منقا کا مرکب تیار کرکے ست رنگے کی چونچ کے اندر دھکیل دیا تھا اور شان پور کے خدمت گاروں سے اس کی ٹانگیں اپنی ہدایات کے مطابق دبوائی تھیں۔ اور جب گرم پھونکیں مارنے کی باری آئی تو انہوں نے شہور کو ہٹا کر خود اپنا منہ اس کی پیٹھ سے جوڑ دیا تھا۔ اسی دوران موقع پاکر ظہور خانہ بدوشوں کی ٹولی کی طرف گیا تو اس کی فحش گالی اس کے تمام ننھیالی بزرگوں نے سنی تھی۔

خانہ بدوشوں کا مرغا سر سے پاؤں تک خون میں لتھڑا ہوا ہونے کے باوجود ایک چھوٹی عمر کی سفید مرغی سے کھیل رہا تھا اور اٹھکیلیوں کے دوران مرغی کے سفید چمک دار پروں پر اس کے خون کی دھاریاں عجیب طرح کے نقش و نگار بنا رہی تھیں۔

شان پور والوں کی خشک برساتی ندی میں بہار کے پہلے جوڑ کا دردناک حصہ پانی کے تیسرے وقفے کے بعد شروع ہوا تھا۔ جب بے گھروں کا سنہرا حسب سابق چھوٹتے ہی اپنے حریف کو مستقل پھینیاں مارتا ہوا دائرے کے وسط سے اس جگہ تک دھکیلتا چلا گیا تھا جہاں شان پور کے گھبرو بھڑک دار کپڑے پہنے سگریٹ کی پھٹی ہوئی ڈبیاں اُلٹا کر اپنے گھٹنوں پر رکھے شرطوں کا حساب لگا رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے اور وقفے وقفے سے اپنے رقم لگے مرغے کو با آواز بلند داؤ پیچ بتا رہے تھے۔ ریاست والوں کے پرندے کا پانی کے وقفے کے فوراً بعد کمزور پڑ کر پیچھے ہٹتے چلے جانا وہ پہلے بھی دیکھ چکے تھے مگر اس دفعہ وہ اپنی چھوڑی ہوئی زمین واپس حاصل کرنے میں ناکام ہوگیا تھا اور تمام جوابی اچھالوں میں اپنے حریف سے ہوا میں ٹکرانے کے بعد کچھ اور پیچھے کی طرف پلٹ کر گرا تھا اور آخر کار اس نے سانس درست کرنے کے لئے اپنی چونچ مدمقابل کے سینے میں چھپانے کی کوشش کی تو مجمع پر ہولناک سکوت طاری ہوگیا تھا۔

اگر ریاست کے جانور نے مقابلے کے ابتدائی لمحوں ہی میں اپنے حریف کی آنکھ نہ ضائع کردی ہوتی تو شان پور والے بھی اس پر بڑی رقمیں لگانے کی غلطی نہ کرتے۔

اس موقع پر ظہور نے مقابلہ دوبارہ بیچ میدان میں لے جانے کے بہانے چیل کی طرح جھپٹ کر اپنا مرغا اُٹھالیا تھا اور اس دوران مرغے کا منہ اپنے منہ میں ڈال کر اس کی آنکھوں اور چونچ میں جم جانے والا خون چوس کر صاف کرنے کی کوشش کی تھی جس پر خانہ بدوشوں کی ٹولی سے دھیمی سی صدائے احتجاج بلند ہوئی تھی۔

''پانی سے پہلے پرندے کو ہاتھ لگانا نہیں بنتا!'' اگر یہ بات خانہ بدوشوں میں سے کسی نے کہی ہوتی تو ظہور اس کا سر پھاڑ دیتا مگر اعتراض کرنے والا اس کا بڑا ماموں تھا جو اصولوں کی اتنی

کھلی خلاف ورزی پر شرما گیا تھا۔ یہ بات بچوں تک کے علم میں تھی کہ سوائے اس صورت کے کہ پرندے کی چونچ میں حریف کے بدن کا کوئی پر پھنس جائے لڑائی کے دوران اسے بازوؤں میں اٹھالینا تو درکنار ہاتھ سے تھپ تھپانا بھی منع تھا۔

''میں چوتھا پانی کرا رہا ہوں۔'' ظہور نے انتہائی خجالت سے جواب دیا تھا۔

ہجوم پر چھانے والا سکوت مزید ہول ناک ہوگیا تھا۔ ریاست والوں نے پہلے چار پانیوں کے قانون پر اعتراض کیا تھا اور اب خود چوتھے پانی کے لئے مقابلہ رُکوا رہے تھے۔

آخری وقفے کے دوران ان لمحوں کے سوا جب حکیم صاحب نے مرغے کو کشتہ کھلایا تھا بقیہ تمام وقت ظہور خود اپنے ست رنگے کے ساتھ لپٹا رہا تھا۔ اس نے سوئی دھاگے سے اس کے سینے اور کلغی کے زخموں کو ٹانکے لگائے تھے اور اپنے منہ میں چبائے ہوئے کھوپرے کے ریزے زبان پر رکھ کر اس کا تمام بدن چاٹا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی دم اٹھا کر منہ سے ٹھنڈے پانی کی پچکاریاں مارنے کا کام بھی اس نے خود انجام دیا تھا اور ان تمام کاموں کے دوران وہ اس سے ہمدردی کی باتیں کرتا رہا تھا اور اپنی آنکھوں میں بار بار جمع ہوجانے والے آنسو سر کے جھٹکے سے دائیں بائیں گراتا رہا تھا۔ ان تمام کاموں کے بعد بچ جانے والے وقت میں اس نے اپنے پالتو کو چادر میں لپیٹ کر بازوؤں میں اٹھالیا تھا اور اسے گرم سانس کی پھونکیں مارنے کے ساتھ ساتھ ہلکورے دیتا رہا تھا۔

جب حتمی مقابلے کے لئے ظہور نے اپنا پرندہ میدان میں اُتارا تو وہ سر سے پاؤں تک لعاب دہن کے ساتھ چپکائے ہوئے کھوپرے کے سفید ٹکڑوں سے اٹا ہوا تھا جب کہ خانہ بدوشوں کا سنہرا اسی طرح لہو میں تھڑا ہوا واپس آیا تھا۔

''زناکاروں نے اسے اس دفعہ بھی صرف مرغی کے ساتھ چھوڑے رکھا ہے'' حکیم صاحب پھر بڑبڑائے تھے۔

آخری پانی کے بعد بھی ابتدائی چند لمحوں میں خانہ بدوشوں کے قندھاری حسب نسب والے اصیل نے اپنی بھاری تن و توش سے ایک مرتبہ پھر فائدہ اٹھایا تھا مگر اس مرتبہ اس کی کامیابی اتنی بھرپور ثابت نہیں ہوئی تھی اس لئے کہ ریاست والوں کا ست رنگا پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونے کے بعد انتہائی پھرتی سے جھکائی دے کر سنہرے کے حاوی ہوتے ہوئے پروں کے نیچے سے نکل آیا تھا۔ اس کے بعد اس نے میدانی علاقوں کی لڑاکا نسلوں کی مخصوص پھرتی سے کام لیتے ہوئے مسلسل کئی ایسے پینترے دکھائے تھے جس سے اس کے حریف کا سر چکرا گیا تھا اور ٹانگیں لرزنے لگی تھیں۔ سب جانتے تھے کہ وہ مقابلہ جو سنہرے کی طاقت اور ست رنگے کی پھرتی کے درمیان شروع ہوا تھا اب فقط بہتر سانس کا مسئلہ ہوکر رہ گیا ہے۔ دیکھنا یہ تھا کہ کون زیادہ دیر اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہتا ہے شرط یہ تھی کہ کس کا دم دیر سے ٹوٹے گا۔

دونوں مرغوں کو لڑتے ہوئے تین گھنٹے گزر چکے تھے اور فضا پر مکمل سکوت طاری تھا دونوں حریف اب اس حالت کو پہنچ چکے تھے جب وجود میں زندگی کے آثار آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگے تھے اور اعضاء میں موت کے سائے ناتوانی کی شکل میں پھیلتے ہیں اور اعلیٰ حسب نسب والے جانوروں کو احساس ہوجاتا ہے کہ مدمقابل بہت سخت جان اور ضدی نکلا اور ان کی آخری خواہش یہ رہ جاتی ہے کہ وہ خود مرنے سے پہلے اسے بھی

مرتے ہوئے دیکھ لیں۔

آخر جب حملہ کرنے اور مدافعت کی تمام قوت اور صلاحیت خرچ کر دینے کے بعد دونوں مرغے ایک دوسرے کے سینے سے سینہ جوڑ کر بے حس و حرکت کھڑے ہو گئے تو شان پور والوں کے چہروں پر آنے والے لمحوں کا خوف سائے سے ڈال گیا جبکہ خانہ بدوشوں کی ٹولی میں پہلی مرتبہ زندگی کی ہلچل نمودار ہوئی۔

دونوں ٹولیوں کی بُری اور بھلی توقعات کے عین مطابق لڑائی کے اس مرحلے پر سنہرے نے جلد ہی اپنی طویل قامتی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حرکت کئے بغیر اپنی چونچ کے نیچے کھڑے ست نگے کی کلغی اور گردن نوچنا شروع کر دی جب یا ت کا نسلی پرندہ اپنی جان توڑ کوشش کے باوجود جوابی حملے کے لئے جست لگانے سے معذور رہا تو وہ خانہ بدوش بوڑھا جو کسی دائمی خزاں رسیدہ درخت کی طرح جگہ جگہ سے نچا کھچا اور اکھڑا ہوا تھا اور مقابلے کی ابتداء میں سنہرے کی آنکھ ضائع ہونے پر اپنا سینہ کوٹ کر ناتوانی اور صدمے سے زمین پر بیٹھ گیا تھا' بے اختیار اپنی ٹیڑھی ٹانگوں پر اچھل کر کھڑا ہوا اور چیخا ''جی او شیرا!''

بوڑھے کے ہذیانی نعرے نے ایک لمحے کے لئے ظہور کی نظریں میدان کے وسط سے اکھاڑ دیں اور پھر اس کی آنکھیں انتہائی تیزی سے پھیلنے کے بعد سکڑ گئیں اور بوڑھے کی دائیں بغل پر مرکوز ہو کر رہ گئیں جس پر اس نے خوبصورت پروں والی نرم و نازک مرغی داب رکھی تھی۔ مرغی کے پروں پر سنہرے کے خون سے بنے ہوئے نقوش بدستور موجود تھے اور وہ بار بار پلکیں جھپکا کر اپنے ساتھی کو حریف پر حاوی ہوتے دیکھ رہی تھی۔

ظہور کی پہلی چیخ آس پاس کے ٹیلوں پر سینہ پھلا کر کھڑے ہوئے اپنی باری کا انتظار کرتے اصیل مرغوں کی غصیلی بانگوں تلے دب سی گئی اور صرف حکیم صاحب کے کانوں تک رسائی حاصل کر سکی مگر دوسری مرتبہ وہ میدان کے وسط میں پہنچ کر اپنے مرغے کو اٹھاتے ہوئے چیخا۔ ''ٹھیک ہے بڑے ماما جی ٹھیک ہے اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے خون میں ڈوبے ست رنگے کو بازوؤں میں تھام لیا۔

شام ڈھلے جب ظہور کی جیپ حویلی کے صحن میں داخل ہوئی تو اس کی نئی نویلی دلہن اس کے بگڑے ہوئے تیوروں سے سب کچھ سمجھ کر سہم گئی اور اپنے دوپٹے کی اوٹ سے اسے حکیم صاحب سے علاج معالجے کے سلسلے میں مشورے لیتی دیکھتی رہی۔ حکیم صاحب کو رخصت کر کے ظہور اپنا نیم مردہ مرغا اٹھائے ہتھیاروں والے کمرے میں چلا گیا اور وہیں سے چیخ چیخ کر نوکروں کو مختلف مرہموں اور معجونوں کے لئے ادھر ادھر دوڑاتا رہا۔

رات گئے وہ ہتھیاروں والے کمرے سے نکلا اور کپڑے بدلے بغیر بستر پر لیٹ کر خاموشی سے سگریٹ پر سگریٹ سلگاتا رہا۔ آدھی رات کو اس نے دفعتاً ساتھ لیٹی ہوئی دلہن کا کمبل کھینچ کر فرش پر پھینک دیا اور اس کے لمبے بال مٹھی میں لپیٹ کر ایک جھٹکے سے اسے کھڑا کر کے خواب گاہ کے مدھم روشنی والے بلب کے نیچے تک گھسیٹتا ہوا لے گیا چند لمحوں تک وہ نیم تاریکی میں اپنی کانپتی ہوئی بیوی کا خوب صورت چہرہ غور سے دیکھتا رہا پھر حاکمانہ لہجے میں بولا اس وقت تو ہتھیاروں والے کمرے میں جا کر اس کے ساتھ بیٹھ صبح دوسرا انتظام ہو جائے گا۔''

سونف...... کرشماتی دوا

● حکیم راحت نسیم سوہدروی

قدرت کے عطا کردہ اصول علاج کے بارے میں معلوماتی مضمون، جس کا

سونف کو عربی میں رازیانج، فارسی میں بادیاں اور انگریزی میں (Fennel) کہتے ہیں۔ جبکہ اردو اور پنجابی میں سونف ہی کہتے ہیں۔ سونف ایک پودے کے بیج ہیں۔ یہ پودا ایک گز لمبا خوبصورت، باریک باریک پتیوں والا ہوتا ہے جس کے سر پر جا کر سونف کا گچھا بالکل اُلٹی چھتری کی طرح لگتا ہے۔ ایک ایک گچھے میں سو سو پچاس پچاس دانے ہوتے ہیں۔ شروع میں چھوٹے چھوٹے پھول کی طرح بیج ہوتے ہیں جن میں خوشبو آتی ہے۔ پھر یہ سونف میں بدل جاتے ہیں، گچھوں کو کاٹ کر سونف کو الگ کر لیا جاتا ہے اور جڑ الگ کر لی جاتی ہے۔

سونف کی دو اقسام ہیں: جنگلی اور بستانی۔

سونف کا پودا تقریباً تمام دنیا میں پایا جاتا ہے، اطباء نے اس کا مزاج گرم خشک بتایا ہے۔ سونف

راستہ بتانے والے جُوتے

بھارت میں جی پی ایس ٹیکنالوجی کے حامل اسمارٹ اسپورٹس جُوتے جلد ہی اپنے پہننے والوں کے لیے رہنمائی کا کام کرتے نظر آئیں گے۔ یہ جُوتے ارتعاش کے ذریعے مقررہ راستے تک لے جایا کریں گے۔ انگریزی فلم "وزرڈ آف اوز" میں ہیروئن کو بس ایک بٹن دبانے کی ضرورت ہوا کرتی تھی اور اس کے سرخ رنگ کے جُوتے لمحوں میں اسے کنساس میں واقع اس کے گھر تک لے جایا کرتے تھے۔ تاہم ہالی وڈ کی فلم کی یہ خیالاتی ایجاد اب جلد ہی اپنی حقیقی شکل میں بھارت میں نظر آئے گی۔ بھارت کے "لے چل" نامی یہ جوتے جلد فروخت کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں، جو اپنے پہننے والے شخص کو نہ صرف راستہ درست بتائیں گے بلکہ یہ بھی بتائیں گے کہ کتنے قدم چل لیے گئے، کتنا فاصلہ طے ہوا اور کتنی کیلوریز استعمال ہوئیں۔ یہ جوتے بلیوٹوتھ ٹیکنالوجی کے حامل ہیں اور پہننے والے کے اسمارٹ فون سے منسلک ہوں گے اور اسمارٹ فون میں موجود گوگل میپس کی سہولت استعمال کرتے ہوئے یہ تمام سرگرمیاں انجام دیں گے۔ بتایا گیا ہے کہ جوتوں میں نصب یہ ڈیٹیچ ایبل بلیوٹوتھ آلہ دائیں مڑنے کے لیے دایاں اور بائیں مڑنے کے لیے بایاں جوتا مرتعش کرے گا اور پہننے والے کو مڑ جانے کا اشارہ دے دے گا۔

(مرسلہ: ضیغم بٹ، لاہور)

ہمارے ہاں بکثرت استعمال ہوتی ہے اسے منہ کو خوشبو دار بنانے کے علاوہ کھانے کی مختلف اشیاء مثلاً اچار، مٹھائی، ٹھنڈائی، سردائی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ پان سپاری سے بہتر ثابت ہوئی ہے۔ طب میں بطور دوا اس کا استعمال صدیوں سے ہے۔ سونف مدر بول یعنی پیشاب آور ہے۔ اس مقصد کے لئے سونف کا عرق و شربت استعمال کرایا جاتا ہے۔ مدر حیض جوشاندوں میں بھی سونف ایک اہم جزو ہے۔

سونف خواتین میں دودھ کی مقدار بڑھاتی ہے۔ اپنے پیشاب آور اثرات کے سبب پتھری نکالنے والی ادویہ کے ہمراہ استعمال کرایا جاتا ہے۔ درد قولنج میں فائدہ دیتی ہے۔ جدید تحقیقات کے مطابق سونف میں روغن فراری، پٹیاسوں، پیکٹن، نشاستہ، کوٹیکسن، آیوڈین، وٹامن اے، تھایا سین، رائبوفلاوین، نیاسین اور وٹامن سی پایا گیا ہے۔ ایلومینیم، بیریم، لیتھیم، کاپر، منگانیز، سیلیکان اور ٹاسٹیم بھی خفیف مقدار میں ہوتے ہیں۔ سونف کے تیل کا اہم جزو اَنتھول ہے اور اس کے بنیادی اجزاء رینیل ڈی ہائیڈ اور انیک ایسڈ ہیں۔

دستوں کے لئے

بادیان دیسی گھی میں بھون کر اس میں شکر ملا کر صبح و شام 9، 9 گرام کھانے سے دست بند ہو جاتے ہیں اگر ان میں بیل گری کا اضافہ کرلیا جائے تو دست روکنے کی بہترین دوا ہے۔

جگر:

جگر کے امراض میں بادیان کی جڑیں مفید ہیں۔ معدہ، جگر اور گردوں میں بادیان کی جڑیں استعمال کرائی جاتی ہیں۔

قبض:

بادیان چھ گرام، سنائی چھ گرام دونوں کو جوش دے کر چھان کر حسب ضرورت چینی ملا کر پی لیا جائے تو قبض جاتی رہے گی۔

خفقان:

جن لوگوں کو وحشت و خوف اور دل تیز دھڑکنے

کی شکایت ہو وہ بادیان پانچ گرام' گل گاؤزبان پانچ گرام' جوش دے کر چھان کر شہد ایک چمچہ ملا کر چند روز صبح نہار منہ پی لیں تو بہت مفید ہے۔

تیزابیت:

بادیان اور سونٹھی مقشر ہم وزن پیس کر رکھ لیں۔ صبح' دوپہر' شام کو کھانے سے قبل ہمراہ شربت بادیان 1' 1 چمچہ 2' 2 گرام لینے سے معدہ میں جلن اور تیزابیت میں فائدہ ہوتا ہے۔

تبخیر معدہ:

کاسر ریاح ہونے کی وجہ سے تبخیر معدہ میں بہت مفید ہے۔ طبیعت کو سکون دیتی ہے۔ تبخیر معدہ والے لوگ بادیان کو پیس کر صبح و شام پانچ پانچ گرام بعد از غذا کھالیا کریں یا جوش دے کر پی لیا کریں۔

سفوف تبخیر:

بادیان اور دانہ الائچی کلاں ہم وزن لے کر پیس لیں اور دوپہر شام کھانے کے بعد دو' دو گرام تازہ پانی سے کھالیا کریں۔

ضعف بصارت:

بادیان کا سفوف پانچ گرام ہمراہ گاجر کا رس ایک گلاس چند روز تک مسلسل پینا مفید ہے۔

سفوف مقوی بصر:

بادیان 250 گرام صاف کر کے میٹھے بادام 125 گرام' کالی مرچ 50 گرام ان تینوں کو برابر وزن شکر ملا کر سفوف بنالیں۔ روزانہ صبح دو چمچے ایک گلاس دودھ کے ساتھ کچھ عرصہ تک استعمال کرنے سے بصارت کو طاقت ملے گی دماغ کو تقویت ہوگی جس سے نظر بہتر ہو جائے گی۔

ہاتھ پاؤں جلنا:

جن لوگوں کے ہاتھ پاؤں جلنے کی شکایت ہو ایسے لوگ روزانہ صرف بادیان چھ گرام تازہ پانی سے کھالیا کریں انہیں فائدہ ہوگا۔

بچے کی ریاح:

چھوٹے شیر خوار بچے عموماً پیٹ کے امراض کا شکار ہوتے رہتے ہیں جن میں ریاح بھر جانا سب سے زیادہ ہے۔ ایسے بچوں کو چھ گرام بادیان جوش دے کر چھان کر دن میں چار یا پانچ مرتبہ ایک ایک چمچہ پلانا مفید ہے۔

قے ابکائی متلی:

بادیان 3 گرام' پودینہ 3 گرام' دار چینی 1 گرام' الائچی سبز تین عدد جوش دے کر چھان کے پی لیں۔

بھوک نہ لگنا:

جن لوگوں کو بھوک کم لگنے کی شکایت ہو وہ ذیل کا جوشاندہ پندرہ روز پی لیں' بھوک اچھی طرح لگے گی۔

پودینہ خشک چھ گرام' بادیان چھ گرام' مویز منقی 9 دانہ' آلو بخارا خشک پانچ عدد' آدھے گلاس پانی میں جوش دے کر چھان کر روزانہ صبح نہار منہ پی لیا جائے۔

عرق بادیان:

بادیان کا عرق بھی کشید کیا جاتا ہے جو طب مشرقی میں صدیوں سے مستعمل ہے۔ یہ معدہ اور امعاد کے لئے بہتر ہے' ریاح خارج کرتا ہے اور پیشاب آور ہے۔

حصار

• شفقت طاہرہ ورک

توصیف کی ماں کو نورین کے گھر میں قدم رکھتے ہی مکینوں کی حسرت حالی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ انھوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی کے لئے درخواست ایسے گھرانے کر جائیں گی کہ جس گھر کا صحن اینٹوں کا اور دیواریں پلستر سے بے نیاز ہونگی۔ وہ بیٹے کی ضد کے آگے بے بس تھیں۔

ایک شخص کی کہانی جس کی آنکھوں میں ایک منظر آ کر ٹھہر گیا تھا

ایک سیال مادہ اس کی نگاہوں میں اُترتا چلا گیا اور ہر منظر ساکت ہو گیا۔ وہ ایک وجود اپنے اندر اُترتا محسوس کرتا پھر ہر منظر آہستہ آہستہ دھند میں بدل جاتا اور وہ خود کہیں کھو جاتا۔ یہ فریب نظر ہے یا کوئی حقیقت وہ سوچتا چلا جاتا۔ گزشتہ کئی ماہ سے ایسا ہو رہا تھا۔ وہ لڑکی تھی جس کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آجاتا تو جیسے سانس کا زیروبم مدھم ہو کر رہ جاتا وقت کی رفتار میں دھیما پن آجاتا۔ اگر اس منظر سے پہلو تہی کرتا تو وہ سیال ایک روشنی بن کر دل میں اُترتا چلا جاتا۔ وہ تھک گیا تھا وہ جانتا بھی تھا وہ چہرہ آس پاس ہے مگر پہلو تہی کر رہا تھا۔ وہ کسی ٹرانس میں آنا نہیں چاہتا تھا مگر وہ آسیب دھیرے دھیرے اسے گرفت میں لے رہا تھا وہ بے بس سا ہو چکا تھا۔ میں کیا کروں؟ کیا مجھے اس سے بات کرنی چاہیے'

کیا جواب ملے گا؟ سوال سبھی تھے جواب نہ تھا ایک ایسا احساس جو لفظوں کے بیان سے بے نیاز اور ایسا خواب جو تعبیر سے خالی تھا۔ وہ اندازہ کر چکا تھا کہ وہ اس لڑکی کی محبت کا اسیر ہو چکا ہے جسے وہ بارہا سڑک عبور کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ یہ وہی پیکر تھا جو سیال بن کر اس کے اندر اُترتا تھا۔ وہ باغی تھا مگر بے بس۔ وہ ایسا آسیب تھی جو اس کو اپنے حصار میں لیے جا رہی تھی اور وہ محصور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کوئی راہ فرار بھی نہ تھا کیا مجھے محبت تو نہیں ہو گئی اس نے بے بسی سے سوچا اور سوچتا چلا گیا۔

''تم ابھی تک سوئے نہیں ہو؟'' وہ ماں کی آواز سن کر چونک گیا۔ ''میں سو جاتا ہوں ابھی رات پڑی ہے۔''

''کیا تم رات بھر نہیں سوئے۔ کونسی رات پڑی ہے فجر کی اذان ہو رہی ہے صبح ہو رہی ہے۔'' ماں حیران تھی۔ واقعی دُور سے اذان کی آواز سنائی دے رہی تھی کہیں سے مرغ کی بانگ بھی ہلکے سے کانوں سے ٹکرائی۔ ''اوہ، ایک خیال میں میری ساری رات کٹ گئی۔ کیا میں خواب دیکھ رہا تھا۔ نہیں نہیں خواب تو نیند میں آتے ہیں میں کھلی آنکھوں سے ایک منظر دیکھتا رہا ہوں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ وہ زچ ہو گیا۔

''کوئی پریشانی ہے توصیف بیٹا'' ماں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''نہیں امی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں رات بھر سوتا رہا ہوں تھوڑی دیر پہلے آنکھ کھلی تو میں نے سوچا فجر کی نماز پڑھ لوں ایسا نہ ہو کہ دوبارہ آنکھ لگ جائے اور نماز قضا ہو جائے۔ اس لئے میں نے کمرے میں چہل قدمی شروع کر دی پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس من گھڑت جھوٹ سے وہ نہ اپنے آپ کو بہلا سکا نہ ہی ماں کو تسلی دے سکا۔

''تم نے جھوٹ کہاں سے بولنا سیکھا ہے؟ آنکھوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رات بھر جاگ کر گزاری ہے۔ بیڈ پر رکھے کمبل کی تہیں نہیں کھلیں۔ بیڈ کی چادر جوں کی توں بے سلوٹ ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ رات سوتے رہے ہو۔'' ماں نے پیار بھرے انداز میں پوچھا۔

''امی آپ یقین نہیں کر رہیں مگر میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں''۔

''چلو میں مان لیتی ہوں کہ تم جھوٹ نہیں بول رہے مگر تمہارے الفاظ میرا دل مطمئن نہیں کر پا رہے۔ تو اس کا یہی مطلب ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو اور یقیناً ایسا ہی ہے۔ کتنے دن ہو گئے ہیں کہ میں دیکھ رہی ہوں تم ساری ساری رات کمرے میں چکر لگاتے کاٹ دیتے ہو۔ سب ٹھیک ہوتے ہوئے بھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کچھ ٹھیک نہیں ہے اور جو ٹھیک نہیں ہے وہ ہی تمہاری پریشانی کا سبب ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''۔ اس نے ماں کا نرم لہجہ اپنے اندر تک اُترتا محسوس کیا۔ ''امی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر میں خود کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ وقت آنے پر آپ کو بتاؤں گا'' وہ بے بسی سے بولا۔

پھر وہی منظر اس کی نگاہوں کے سامنے تھا وہی گرم سیال آنکھوں میں اُترتا ہوا اپنے حصار میں لپٹا وہی وجود وہی پیکر۔ وقت کی رفتار دھیمی کرتا ہوا وہی منظر۔ وہ اپنے پیچھے گاڑیوں کے مسلسل تیز ہارن سے چونک اٹھا اور آگے نکل تو گیا مگر وہ منظر آنکھوں سے ہٹا نہیں تھا۔ وہی وجود جو آہستہ آہستہ سڑک عبور کرتے ہوئے سامنے سے گزر گیا۔ درجنوں افراد نے اس سگنل پر سڑک عبور کی مگر اس پر نگاہ کیوں ٹھہر جاتی ہے۔ میں کیوں محو سا ہو جاتا ہوں۔ وہ زچ ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا یہ کنفیوژن دُور ہو، وہ بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ صورتحال سے نمٹنے کیلئے اس وجود کی پُراسراریت کو توڑنے کیلئے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا۔ وہ حصار کو توڑنا چاہتا تھا۔

وہ اس حصار سے آزاد تھی۔ اس جکڑ لینے والی

کیفیت سے بے خبر تھی۔ وہ کرب کو اظہار دینا چاہتا تھا مگر وہ کشمکش میں تھا۔ وہ حیرانگی سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو بلا اجازت خاموشی سے اس کے مقابل آن بیٹھا تھا۔ پہلی نظر میں وہ اس کو کم گو لگا۔ ''میرا نام توصیف احمد ہے میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ اس کی نگاہوں میں سوالیہ انداز دیکھتے ہوئے شائستگی سے گویا ہوا۔ اس کا لہجہ نرم اور چہرہ پُرسکون تھا۔

''کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟'' لڑکی نے پُراعتماد انداز میں پوچھا۔

''میں دو سال پہلے فارن سے بزنس ماسٹر کرنے کے بعد اپنے والد کے ساتھ بزنس میں ہوں۔ ہم تین بہن بھائی ہیں میں سب سے بڑا ہوں۔ آپ کو کئی بار یونیورسٹی سگنل پر سڑک عبور کرتے دیکھا تھا۔ اگر آپ کو برا نہ لگے تو میں بنا کسی روک ٹوک کے اپنی بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اگر آپ میری پوری بات کو سن لیں تو میں آپ کا شکرگزار رہوں گا۔''

''سن رہی ہوں۔'' وہ محتاط سی ہوگئی۔

''میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تو اس کے کئی دن بعد تک وہ منظر میری نگاہوں کے سامنے آتا رہا۔ اس منظر میں ایک تسلسل ابھی تک قائم ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے میں ایک حصار میں جکڑا گیا ہوں۔''

''مسٹر توصیف آپ جو کوئی بھی ہیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس سٹوری سے جو آپ مجھے سنا رہے ہیں۔ یہ آپ کی بھول ہے کہ میں آپ کی لفاظی سے متاثر ہو جاؤں گی یا آپ پر اعتبار کرلوں گی۔ کسی بھی انسان کے لئے الفاظ کا سہارا لیکر جذبات کی رسائی آسان ہوتی ہے مگر ایک احساس بن کر روح میں اتر جانا فطرت کسی کسی کو ودیعت کرتی ہے۔ یہ دنیا ایک جال ہے اور یہاں جگہ جگہ کسی بھی ہو صیاد ہی ہوتا ہے۔ جس کا کام جال میں پھانستا ہوتا ہے اور کسی صیاد کے جال سے رہائی پانا یہ کسی کے بس کا کام نہیں ہوتا۔ آپ صیاد ہیں یا نہیں اور آپ کے پاس کیسا جال ہے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آپ اس سٹوری کو چاہت یا محبت کا کوئی بھی نام دیں بے معنی ہے۔ کیونکہ لفظوں میں کھوکھلا پن ہو یا وجود بے روح، دل احساس سے خالی ہو یا جذبات بے مایہ، اپنا اصل کھو دیتے ہیں اور جو چیز بھی اپنا اصل کھو دیتی ہے اس کا اپنا کوئی نام نہیں ہوتا۔

''آپ مرد ہیں آپ کے لئے اعتراف کرنا آسان ہے کہ آپ نے جو دیکھا یا محسوس کیا وہ بلا جھجک مجھ سے کہنے چلے آئے ہیں۔ اس اعتراف نے تو آپ کے کردار پر دھبہ لگایا ہے نہ آپ کی حیثیت پر کوئی حرف آیا ہے۔ یہی بات اگر عورت ڈھکے چھپے الفاظ میں کرے تو بھی معاشرہ اس کی حیثیت تبدیل کر دیتا ہے۔ اس پر فرد جرم عائد کرتا ہے مگر مرد ایسی پوزیشن میں باعزت بری ہوتا ہے۔ مسٹر توصیف احمد میں آپ سے درخواست کرتی ہوں آئندہ آپ میرے سامنے نہیں آئیں گے۔ مجھے اپنی عزت عزیز ہے اور عزت اور خاندان پر حرف آئے تو کسی یتیم بے باپ کی لڑکی پر کیچڑ زیادہ اُچھلتا ہے اور اس کی بیوہ ماں کی زندگی زیادہ دشوار ہوتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کر چلی گئی مگر توصیف ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔

وہ مزید محصور ہو چکا تھا۔ وہ اب خیال نہیں رہی تھی۔ وہ زندہ حقیقت تھی جس کے پُراعتماد الفاظ نے اس کے اندر کے حقائق کو بے نقاب کر دیا تھا وہ کم عمر مگر پختہ ذہنیت کی مالک تھی۔ وہ اس کے دل کو چھو چکی تھی۔ وہی منظر نظر کے زاویہ بدل کر سوئے قلب میں اُتر رہا تھا۔ ابر آلود موسم صاف ہو چکا تھا۔ وہ حصول کا ارادہ کر چکا تھا۔

''تم رات دیر تک کیوں جاگتے رہتے ہو، مسئلہ کیا ہے جو تم بتانے سے پہلو تہی کر رہے ہو۔'' رات اسے پھر دیر تک جاگتے دیکھ کر ماں نے استفسار کیا۔

''امی ایک لڑکی ہے جو مجھے اچھی لگتی ہے۔''

''کون ہے وہ؟''

''امی، اس کا نام نورین ہے۔ چار بہن بھائی ہیں، وہ دوسرے نمبر پر ہے۔ باپ کا انتقال ہوچکا ہے۔ ماسٹر کرنے کے بعد وہ آج کل پرائیویٹ ملازمت کررہی ہے۔ امی مجھے اس لڑکی سے شادی کرنی ہے۔ چاہے شرط کیسی بھی ہو اور قیمت کوئی بھی ہو۔''اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

توصیف کی ماں اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کوئی بھی ارادہ کرلیتا تھا تو اسے پورا کرنے میں انتہا تک چلا جاتا۔ وہ بلا کا ضدی تھا وہ بچپن میں بھی ایک مشکل بچہ رہا تھا۔ انتہائی ضدی' غصہ والا۔ بچپن کی ہر بات اسے یاد تھی۔ سرکس میں جوکر کا کھیل دیکھ کر وہیں ضد کرنے لگا کہ یہ جوکر گھر لے کر جائے گا۔ اس کے والد اس وقت تو کسی طرح بہلا پھسلا کر گھر تک لے آئے مگر گھر آ کر بھی اس ضد کی تکرار میں اس نے دو تین دن بغیر کھائے پیئے گزار دیئے۔ پھر اس کو نیم بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال لے جانا پڑا پھر باپ نے پورے پاکستان کے سرکس چھان مارے۔ آخر ایک جوکر خانہ بدوشوں کی بستی سے پکڑ کر لے آئے۔ اگلے تین ماہ تک سارا گھر جیسے سرکس میں بدل گیا۔ اس وقت توصیف کی عمر نو سال تھی۔ کبھی کوئی چیز پسند آجاتی تو کبھی میوزیم میں رکھی نوادرات پر نگاہ پڑ جاتی۔ وہ ضدی تھا اور اپنی ضد میں انتہائی قدم بھی اٹھالیتا۔ اپنے بیٹے کی بات سن کر ماں پریشان تھی اور یہ پریشانی ایک فطری امر تھا مگر کوئی بھی ماں بیٹے کو کسی لڑکی کی محبت میں اسیر دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ محبت ایک ایسا طبعی امر ہے جو ہر انسان کی زندگی پر کسی نہ کسی روپ میں ساری زندگی اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ چاہے وہ اپنے کسی خونی رشتے سے ہو یا اپنے ہی خود ساختہ آئیڈیل سے۔ ریل کی پٹڑی کی طرح ایک لمحے کا فاصلہ رکھ کر خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔ اس احساس کو محبت چاہت الفت یا اپنائیت کوئی بھی نام دے دیں مگر یہ ہمیشہ انسان کے ساتھ رہتی ہے۔

اس کی آنکھوں میں چمک تھی وہ پرجوش دکھائی دے رہا تھا۔ محبت کے نشے سے سرشار تھا۔

توصیف کی ماں کو نورین کے گھر میں قدم رکھتے ہی مکینوں کی حسرت حالی کا اندازہ ہوچکا تھا۔ انھوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی کے لئے درخواست ایسے گھر لے کر جائیں گی کہ جس گھر کا صحن اینٹوں کا اور دیواریں پلستر سے بے نیاز ہونگی۔ وہ بیٹے کی ضد کے آگے بے بس تھیں۔ واپسی کا کوئی راستہ توصیف نے نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے کس امتحان میں ڈال دیا ہے میرے بیٹے نے۔ انہوں نے دل میں سوچا۔

خاتون خانہ نے اس بن بلائے مہمان کا اپنے گھر استقبال کرتے ہوئے بیٹھنے کو کہا۔ ''میں توصیف کی ماں ہوں۔ اپنے تعارف کے لئے بیٹے کے حوالے کے علاوہ اُن کے پاس کچھ تھا بھی نہیں۔ ''کون توصیف؟''۔ نورین کی ماں نے اجنبی لہجے میں کہا۔ ''میں دراصل اپنے بیٹے توصیف کے لئے آپ کی بیٹی نورین کے لئے درخواست لیکر آئی تھی، مجھے مایوس نہ کیجئے گا۔'' انہوں نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ ''مگر میری بیٹی کی بات طے ہوچکی ہے۔'' جواب غیر متوقع تھا۔ وہ بھی مجبور تھیں خالی ہاتھ واپسی کا سوال ہی نہیں تھا۔ ''میرا بیٹا ایک کامیاب بزنس مین ہے۔ ہمارے ہاں کسی چیز کی کوئی کمی نہیں۔ میں اپنے بیٹے کی خواہش پر یہاں آئی ہوں۔ میں سوالی بن کر آئی ہوں مجھے خالی ہاتھ مت لوٹائیں۔'' انہوں نے منت کرتے ہوئے کہا۔

وہ شرمسار بھی تھیں لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔

''مگر میں زبان دے چکی ہوں۔'' نورین کی ماں نے دوٹوک جواب دیا۔ ''اس لڑکی کی بات، پکی

ہو چکی ہے۔''

توصیف کی ماں نے جب توصیف کو یہ بات بتائی تو وہ ایک دم آگ بگولہ ہوگیا۔ ''اسے مجھ سے شادی کرنا ہی ہوگی۔ میں شادی کروں گا تو نورین شاہد سے، یہ میرا فیصلہ ہے۔''

''توصیف اس ضد کو اب چھوڑ دو۔ وہ بن باپ کی بچی ہے جس کی بات طے ہو چکی ہے۔ یہ معاملات بہت نازک ہوتے ہیں اور زندگی کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں یہ سرکس کا جوکر نہیں ہے کہ تمہاری تفریح کی خاطر کچھ عرصہ کے لئے مہیا کیا جائے۔ جب جی بھر جائے تو چھوڑ دیا جائے۔ رشتے نہ تو زبردستی کئے جاسکتے ہیں نہ ہی کسی کی ضد کی بھینٹ چڑھائے جاسکتے ہیں۔ تم اب بڑے ہو چکے ہو تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔'' ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''امی یہ ضد نہیں ہے۔ ایک سال سے زیادہ ہو چکا ہے میں خود اس کیفیت سے اپنے آپ کو نکالنے کی جتنی کوشش کرسکتا تھا کر چکا ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کرسکا۔ میں خود تنگ آ چکا ہوں۔ میں اس حصار سے نکلنے کی کوشش میں محصور ہوتا جارہا ہوں، بے بس ہو رہا ہوں۔ پلیز اس صورت حال کو سمجھیں۔ اس معاملے کو جو کر کے ساتھ نہ جوڑیں۔'' اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ''مجھے اس لڑکی سے واقعی محبت ہوگئی ہے۔''

بیٹے کے اس برملا اظہار نے ماں کو کنفیوژ کردیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی ضدی طبیعت سے خوب واقف تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ بیٹا اپنی کوئی بھی ضد پوری کرنے میں انتہائی قدم اٹھانے سے گریز نہیں کرے گا ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو اور گھر والوں کو کسی آزمائش میں ڈال دے۔ وہ معاملے کی نزاکت کو بھانپ چکی تھیں اور محتاط رہتے ہوئے اس کا کوئی حل کرنا چاہتی تھیں۔

وہ ایک بار پھر نورین شاہد کے گھر جانے کا ارادہ کر چکی تھیں۔ اس مرتبہ نورین شاہد گھر پر تھی۔ دراز قد' سانولی رنگت' کم گو' گہری آنکھیں' پرسکون چہرہ' نہایت سادہ لباس ان کو دل میں اُتر جانے والی یہ لڑکی اچھی لگی۔ یہ لڑکی تو واقعی چاہے جانے کے قابل ہے۔ پہلی بار توصیف کا انتخاب انھیں اچھا لگا تھا۔ ''میں آپ کے سامنے ایک بار پھر سوالی بن کر آئی ہوں۔''

''آپ دیر کر چکی ہیں۔ میں زبان دے چکی ہوں۔'' نورین کی ماں نے نرمی سے جواب دیا۔

''آپ نے پہلے بھی ایسا ہی کہا تھا مگر اس بار میں پھر سوالی بن کر آئی ہوں۔ آپ کسی بھی شرط پر میرے بیٹے کا رشتہ قبول کرلیں میں آپ کا احسان مانوں گی۔'' انہوں نے منت کی۔

''میں آپ کی حالت کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں مگر یہ بھی سچ ہے کہ رشتے کسی شرط یا قیمت سے مشروط نہیں ہوتے بلکہ ان کی اصلیت تو تقدیر سے جڑی ہوتی ہے۔ میں زبان دے چکی ہوں۔ ہم لوگ دنیاوی وسائل سے تہی دامن ضرور ہیں مگر ہم زبان کی پاسداری سے انحراف بھی نہیں کرتے۔''

ان کو اس بار بھی خالی لوٹنا پڑا۔ وہ بوجھل قدموں سے اس گھر کی دہلیز سے واپس اپنے گھر کی طرف جارہی تھیں۔ اُترے چہرے کے ساتھ گھر پہنچ کر انھوں نے بیٹے کو پھر سمجھانے کی کوشش کی مگر توصیف بضد تھا۔ توصیف کی ماں اپنے بیٹے کی جلد از جلد شادی کردینا چاہتی تھیں۔ اُن کے نزدیک یہی ایک حل تھا توصیف کو خیالوں کی دنیا سے نکالنے کا۔

اب توصیف کی شادی کو برسوں ہو چکے ہیں، وہ آج بھی ایک کامیاب بزنس مین ہے مگر وہ اب بھی ایک حصار میں ہے۔ وہ اس الجھن سے نکلنے کی سعی میں ہے۔

تنگ آ کر اس نے اپنی بیوی کے ساتھ ایک سائیکاٹرسٹ سے وقت لیا اور اس کے سامنے اپنا

مسئلہ پیش کر دیا۔ اس کی نظروں میں وہی منظر جیسے ٹھہر گیا تھا جب برسوں پہلے اس نے نورین کو سڑک عبور کرتے دیکھا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ آج بھی ایک سیال مادہ میری نگاہ میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ میں اپنے اندر ایک وجود محسوس کرتا ہوں پھر آہستہ آہستہ یہ منظر دھندلا جاتا ہے۔ میں خود کہیں کھو جاتا ہوں اور میرا اپنا وجود کہیں بہت دُور اجنبی سا لگتا ہے۔ وہ ایک چہرہ ہے ایک سایہ ہے جو اپنے تمام وجود کے ساتھ میری نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں محسوس کرتا ہوں کہ وہ میرے اندر اُتر آیا ہے اور میرے احساسات کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور میں بے بس ہوتا ہوں۔ یہ کوئی خواب یا خیال نہیں ہے میں ایک حقیقت کی طرح اپنی کھلی آنکھ سے دیکھتا ہوں اور میں آج بھی اس نورین شاہد کی تلاش میں ہوں، جس کی کشش مجھے پوری قوت کے ساتھ اپنی طرف کھینچتی ہے اور میں بے اختیار اس مرکز کی جانب کھنچتا ہوں۔ مگر دائرے کے باہر میرے قدم جامد ہو جاتے ہیں۔ جیسے میں کسی حصار میں محصور ہو گیا ہوں اور حصار ٹوٹتا نہیں ہے۔“

سائیکاٹرسٹ توصیف کی بیوی کو دیکھ رہا تھا جو متناسب خدوخال، ترشے تیکھے نقوش پرکشش آنکھوں کی مالک، ایک خوبصورت عورت تھی۔ یہ کیسا انسان ہے جو ایسی بیوی کے ہوتے ہوئے، ایک خیالی وجود کی محبت کا اسیر ہے۔ یہ ایک المیہ ہی تو ہے۔ اس نے سوچا۔

”مسز توصیف......“ سائیکاٹرسٹ نے توصیف کی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ آپ کے شوہر کا مسئلہ ایک خاص صورت حال سے منسلک ہے۔ جب کوئی انسان اپنی زندگی میں کسی بھی منظر یا شخصیت کو دیر تک اپنی تمام تر دلچسپی یا لگن کے ساتھ دیکھتا ہے تو اس کے اندر کی تمام حساسیت متحرک ہو جاتی ہے اور وہ منظر یا شخص ایک احساس بن کر وجود کے اندر اُترتا چلا جاتا ہے اور حاوی ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس منظر یا شخصیت کو بار بار اپنی آنکھوں کے سامنے لاتا ہے تو وہ خیال ایک حقیقی وجود کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ وہ اسے محسوس کرتا ہے پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے وہ شخص اس صورتحال سے گریزاں ہوتا ہے وہ آزاد ہونا چاہتا ہے مگر بے بس ہوتا ہے اور وہ اس کیفیت سے عمر بھر نکل نہیں پاتا۔ آپ کے شوہر کا مسئلہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔“

ڈاکٹر نے توقف کے بعد پھر کہا، ”آپ پڑھی لکھی سمجھدار معلوم ہوتی ہیں۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کا شوہر نارمل حالت میں واپس آ جائے تو اس کا بھی ایک حل ہے کہ ان کی نورین شاہد سے ملاقات کا بندوبست کروا دیا جائے۔“

”میں ہی نورین شاہد ہوں۔“ توصیف کی بیوی آہستہ سے بولی۔ ڈاکٹر حیرانگی میں اپنی آنکھ تک جھپکنا بھول گیا۔ اس خاموش وقفے میں توصیف اُٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف چلا گیا۔

”مسز توصیف......“ ڈاکٹر نے نورین شاہد کو توصیف کے پیچھے جاتے دیکھ کر پکارا۔ وہ چلتے ہوئے رُک گئی اور سوالیہ انداز سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ ڈاکٹر حیرانگی کی کیفیت سے نکل چکا تھا۔ ”آپ نے اس حصار کو ابھی تک توڑا کیوں نہیں؟“

”ڈاکٹر صاحب کیا یہ المیہ نہیں ہے؟ اگر مرد کو محبت ہو جائے تو سمجھتا ہے کہ یہ اس کا حق ہے۔ اس حصول کیلئے وہ انتہا تک چلا جاتا ہے مگر دستبردار نہیں ہوتا۔ چاہے وہ محبت کسی اور کی ہو۔ اس کے لہجے میں گہری اُداسی تھی۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

”یہ عورت شاید اپنا حصار کبھی نہیں توڑے گی۔“ ڈاکٹر سوچتا چلا گیا۔

قصے لاہور کے

عبدالمجید شیخ

لاہور پاکستان کا دل ہے۔ اس شہر میں بسنے والوں کا دل کسی اور شہر بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ ان کا دل دنیا کے کسی بھی شہر میں نہیں لگتا۔ لاہور کے موسم کا بھی اس میں کافی دخل ہے۔ لاہور کی شامیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ ہر طرف پھیلی ہریالی آنکھوں کو بہت بھاتی ہے۔ یہاں رہنے والوں کے مزاج میں بڑا کھلا پن ہے۔ وہ دوستی اور دشمنی میں انتہا پسند ہیں۔ خاص طور پر لاہور کے پکوان تو کسی بھی مسافر کو رُکنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

کچھ دن پہلے ایک کتاب ''قصے لاہور کے'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ کتاب اس قدر دلچسپ تھی کہ ساری کتاب ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ خود لاہور میں مقیم ہونے کے باوجود اس کتاب میں درج پرانی یادیں، بچپن سے پہلے کے قصے اور لاہور کے چیدہ چیدہ افراد کے کارنامے پڑھ کر میرے اندر ایک عجیب سی مسکان پھیلتی گئی۔ جب میں کوئی اچھی کتاب پڑھتا ہوں تو دل کرتا ہے کہ قارئین سیارہ ڈائجسٹ کے ساتھ اسے شیئر کروں۔ دل میں خیال آتا ہے کہ دیکھوں جتنا مجھ پر اس کتاب نے اثر کیا کتنے قارئین ویسا ہی محسوس کرتے ہیں۔ ہم نے آپ کی دلچسپی کے لیے اس کتاب کے چند اقتباس یہاں رقم کیے ہیں۔ یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز نے شائع کی ہے۔

(امجد رؤف خان)

ایڈولف ہٹلر کا تحفہ

پہلی بار میں نے ''خاکساروں'' کے متعلق اپنے ہمسائے حاجی عبدالرحمان سے سنا جو میں نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی مثال آپ تھی۔ نوعمری میں بادشاہی مسجد لاہور میں عید کی نماز کے بعد پہلی بار میں نے انہیں دیکھا تھا۔ میرے والد نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''یہ ہٹلر کے دوست تھے۔'' مجھ پر مشرقی کا رُعب چھا گیا تھا۔

پچھلے ہفتے میرے دوست سیّد سکندر شاہ نے اس حقیقت پر افسوس کرتے ہوئے کہ پاکستان غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جہاں اپنے ہیرو کو بھلا دیا جاتا ہے۔ مشرقی کا ذکر کیا اور اچھرہ کے سچے رہائشی ہونے کے ناطے اس نے نہایت عیاری سے یہ بیان دیا کہ مشرقی کے پاس ایک خوبصورت کار تھی جو اسے ایڈولف ہٹلر نے تحفے میں دی تھی۔ یہ بات میری ترغیب کے لیے کافی تھی کہ میں ایڈولف ہٹلر کے تحفے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوں ایک جمعرات کی شام میں تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا ذیلدار روڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔

بڑے چوک سے ذرا پہلے بہت سے خوانچہ فروشوں کے درمیان ایک سیمنٹ کا بنا ہوا مکان ہے جہاں سرخ

لاہور

رنگ کا جھنڈا نصب ہے۔ ایک لوہے کا بدوضع دروازہ آپ کا منتظر ہے۔ میں نے جب دروازے کو دھکا دے کر کھولا تو میرے سامنے جیسا کہ شوکیس میں ہوتا ہے ایک زنگ آلود کار کھڑی تھی۔ اس تاریخی کار کے بارے میں کسی قسم کے شک کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ یہ نہایت اعلیٰ ترین معیار کی ہے۔ میں اس کار تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا جسے فیوہرر (ہٹلر کا خطاب) نے پیش کیا تھا۔ "یہ ایک ایسے وارث کے لیے جو نہایت اعلیٰ پائے کا ہے ایک ایسے شخص کو جس کی سرہمیت ہندوستان کو ایک عظیم افتخار تک پہنچا رہی ہے۔"

اس قدیم انحطاط پذیر شاہکار کے قریب ہی علامہ عنایت اللہ خان مشرقی اور ان کی اہلیہ کی قبریں ہیں جو سادگی کا نمونہ ہیں۔ ان کا پوتا اس قبر پر ایک تحقیقی لائبریری تعمیر کر رہا ہے۔ یہ کام کافی عرصے سے رکا ہوا ہے کیونکہ عظیم علامہ کے ان غیر معمولی دیانت دار پیروکاروں کے ہاں پیسے کی کمی ہے اور انہیں چندہ مانگنے کی عادت نہیں ہے جسے وہ بھیک مانگنا کہتے ہیں۔ یہ ایک ویران جگہ ہے جو ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ ہم اپنے عظیم ترین دماغوں کی کس قدر عزت کرتے ہیں۔

کار 1942ء ماڈل کی رینالٹ بینز ہے۔ جن لوگوں کو تاریخی کاروں میں دلچسپی نہیں ہے ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جب نازی افواج نے فرانس پر قبضہ کیا تو اس وقت وہ "پل مین" کی طرز کی اعلیٰ معیار کی مرسیڈیز کاریں محدود تعداد میں بناتے تھے۔ چونکہ یہ رینالٹ فیکٹری میں بنی تھی اس لئے کار کا نام "رینالٹ بینز" تھا۔ کار

کے بوسیدہ اگلے حصے پر نام رینالٹ بینز جلی حروف میں لکھا ہے۔ ٹائر جواب گل چکے ہیں' پرانے اڑے کے سلاخوں والے پہیوں پر چڑھے ہیں فرنٹ گرل کے عین نیچے کار سٹارٹ کرنے والا ہینڈل بھی اپنی جگہ موجود ہے۔

میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا تو چمڑے کی خوبصورت سیٹیں گل چکی تھیں۔ سیٹ کے نیچے چیسز بالکل محفوظ ہے۔ چیسز کا نمبر 3811967 ہے۔ میں نے یہ نمبر رینالٹ کمپنی کو ای میل کیا تو فوری جواب آیا کہ ان کے محافظ خانہ ریکارڈ کے مطابق یہ کار ایڈولف ہٹلر نے لاہور' انڈیا کے مسٹر عنایت اللہ خان مشرقی کو بطور تحفہ دی تھی۔ یہ دنیا بھر میں صرف ایک ہزار کی تعداد میں بنی تھیں۔ یہ پل مین طرز کی چھ نشستوں والی رینالٹ نرواسپورٹ کار تھی۔ یہ 4278 سی سی پاور سپر لگژری کار تھی۔

اس کار کا اصل رنگ کریم تھا جو کار کے انجن اور اطراف کا تھا جبکہ پچھلی جانب پہیوں کے مڈگارڈوں' فرنٹ اور پچھلی بتیوں کا رنگ سیاہ تھا۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ زنگ سارے پینٹ کو کھا چکا ہے۔ ایڈولف ہٹلر کے ذاتی استعمال میں ایسی چھ گاڑیاں تھیں۔ اس نے پچاس سے زائد گاڑیاں دنیا بھر میں معزز مہمانوں کو تحفتہً پیش کی تھیں اس نے ایک کار فیلڈ مارشل رومیل کو بھی جنگ عظیم دوم میں افریقی مہم سے بطور فاتح واپسی پر تحفتہً پیش کی تھی۔

کمپنی نے مشرقی خاندان کو کار کے عوض ایک لاکھ ڈالر کی پیشکش کی تھی لیکن انہوں نے ملکیت میں جھگڑے کی بنا پر انکار کردیا تھا۔ یہ 1970ء کی بات ہے تب سے ایک اور نسل پروان چڑھ چکی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ انہیں لاکھوں ڈالر کی اس تاریخی کار میں رتی برابر دلچسپی نہیں ہے۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ تھوڑا عرصہ پہلے تک یہ ایک گیراج میں کھڑی تھی جہاں اس میں کبوتروں کا بسیرا تھا یہ ہمارے موجودہ دور کا پرتو بن چکی تھی۔

علامہ مشرقی کون تھا؟ میں نے پانچ مختلف ادھیڑ عمر کے تعلیم یافتہ اشخاص کو فون پر پوچھا۔ ان میں سے صرف ایک اس عظیم شخصیت کے بارے میں مبہم سا سراغ دے سکا۔ جس شخص کو ''برطانوی ہند کا عظیم مجرب دماغ ٹھہرایا گیا اس کا تعلق لاہور سے تھا۔ اس کے باوجود لاہور نے تو اس کے متعلق جانتا ہے اور نہ ہی اس کو اپناتا ہے۔ اگر آپ اسے ہٹلر کے ساتھ نتھی کرتے ہیں تو آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ 1930ء میں کیمبرج یونیورسٹی اور برطانوی اخبارات اسے ''ناقابل بیان امکانات والا نابغہ روزگار'' کہتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک آزاد خیال سائنسدان تھا' جس نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ ہندوستان کی تاریخ اور ثقافتی طرز عمل ایسا ہے کہ عوام اپنے قائدین کے سلوک پر بلاواسطہ متناسب ردعمل کا اظہار کرتے ہیں یہ تصور کرنا کہ عوام کو تو اپنے قائدین کے عزائم کا علم ہی نہیں سراسر خام خیالی ہے۔ انہیں ہر تفصیل کا علم ہوتا ہے۔

علامہ مشرقی امرتسر میں 25 اگست 1888ء کو سناروں کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے اور 27 اگست 1963ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ وہ نہایت ذہین طالب علم تھے۔ انہوں نے نت نئے تعلیمی ریکارڈ قائم کئے۔ جس نے برطانیہ اور برصغیر کے ہر شخص کو حیران کردیا۔ انہوں نے 19 سال کی عمر میں ایک سال میں علم ریاضی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرلی۔ انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور چار برس سے بھی کم عرصے میں ٹرائی پوس (بی اے آنرز کی ڈگری) مکمل کرلی۔

اگرچہ انہوں نے تمام مضامین میں نمایاں کامیابی حاصل کی لیکن ان کی اصل شہرت علم ریاضی میں غیر معمولی قابلیت تھی۔ اپنے تعلیمی کارناموں پر انہیں ''فاؤنڈیشن سکالر'' اور کیمبرج یونیورسٹی سے ''رینگلر'' (ریاضی کے ٹرائی پوس میں درجہ اول حاصل کرنے والا) کا اعزاز حاصل ہوا۔ روزنامہ ''ٹائمز آف لندن'' اور ''ڈیلی ٹیلی

گراف'' نے لاہور کے اس ذہین ماہر ریاضی علوم پر اداریئے تحریر کئے۔

24 برس کی عمر میں وہ فارغ التحصیل ہو کر ہندوستان لوٹ آئے اور برطانوی حکومت میں مختلف حیثیتوں سے کام کیا۔ ان کی شخصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے برطانوی حکام کو ذرہ برابر حیرت نہ ہوئی جب انہوں نے پشاور کے ڈپٹی کمشنر کو ہتک عزت اور غلیظ زبان استعمال کرنے پر تھپڑ مار دیا تھا۔ وہ 23 اپریل 1930ء کو پشاور کے قصہ خوانی بازار میں پٹھانوں کے قتل عام پر سرکاری اہلکار ہوتے ہوئے بھی اپنا منہ بند نہ رکھ سکے تھے۔ انہوں نے صورت حال کی بدنظمی کے بارے میں برطانوی اخباروں میں اصل واقعات لکھ بھیجے۔ ان کے کالم پڑھ کر برطانوی عوام ششدر رہ گئے۔ جب پنجابی قائدین نے ان کے نقطہ نظر پر تنقید کی تو انہوں نے کہا ''برطانوی حکومت مجھے میرے علم کی تنخواہ دیتی ہے نہ کہ میرے دل اور ضمیر کی'' اسی سیاق میں انہوں نے سر کا خطاب لینے سے انکار کر دیا تھا۔

1931ء میں علامہ مشرقی نے خاکسار تحریک (عاجزوں کی تحریک) کی بنیاد رکھی اور آسائش کی زندگی تیاگ دی جس کے وہ عادی تھے۔ ان کی پارٹی کا بنیادی تصور یکساں مساوات کے اصول پر مبنی تھا جو نہ تو علی الحال تھا اور نہ ہی مراعات یافتہ اور غیر مراعات یافتہ طبقات کے مابین کوئی دیوار حائل تھی۔ علامہ مشرقی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اس مسلمہ حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ جاگیرداری نظام کی بالادستی اور درجہ بندی پر مبنی افسر شاہی کی وجہ سے پاکستان کو ازحد نسلی اور صوبائی تعصبات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس مساوات جبریہ کا حتمی نتیجہ مکمل اور کلی انتشار ہوگا۔ اگر ان خرابیوں کو دُور کر دیا جائے تو حتمی نتیجہ ان گنت خوشحالی کے امکانات کی صورت میں نکلے گا۔

چناؤ سے مفر نہیں۔ ماہر علم ریاضی نے 1953ء میں لکھا۔ ''میرے حساب کتاب سے مشرقی پاکستان 1970ء میں اپنی آزادی کا اعلان کر دے گا۔'' یہ دن دیکھنے کے لئے وہ زندہ نہیں رہے۔ انہوں نے مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ میں لے جانے پر اعتراض کیا۔ ''کیونکہ ہم اسے ہندوستان سے کبھی آزاد نہیں کرا پائیں گے۔ اس حقیقت کو آج تسلیم کر لیں تو اچھے رہیں گے اسے لازمی پاکستان کے صوبے کی حیثیت سے رہنا چاہئے اور ہمیں صوبے کے گمشدہ حصوں کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے ورنہ ایک روز ہم کشمیر کی تقسیم اسی طرح قبول کر لیں گے جس طرح ہم نے پنجاب کی تقسیم قبول کر لی تھی۔''

کیا اس غیر معمولی لاہوری کے بارے میں کچھ مزید کہنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ جس نے اچھرے کی ایک غیر معمولی گلی میں زندگی گزار دی۔ کئی برس بعد اس کے بھانجے عظیم اختر حمید خاں نے اورنگی پراجیکٹ قائم کیا تو گویا اس عظیم شخصیت کے خیالات کو عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا۔ نتائج حیران کن تھے۔ یہ حقیقت کہ ایڈولف ہٹلر نے انہیں بہترین کار بطور تحفہ پیش کی تھی اہل برطانیہ کے لئے حیرت کا باعث نہیں تھی۔ اس نایاب کار کی آج حالت کیا ہے سب دیکھ سکتے ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ ریاست اسے اپنی تحویل میں لے کر اسے اصلی حالت میں واپس لا کر کسی سائنسی عجائب گھر میں رکھے اور اس کی نمائش کرے۔ مجھے ابھی سے بلند خاموشی سنائی دے رہی ہے۔

بلّو اور اس کی رانیوں کی مقبول عام روایت

کچھ عرصہ قبل پنجاب گلوکاروں میں سب سے زیادہ تخلیقی فنکار ابرار الحق نے بلّو کے نام سے ایک گانا گایا جو تمام پوپ گانوں میں سرفہرست رہا۔ اس کے مقبول عام ہونے کی معقول وجہ یہ بھی تھی کہ بلّو کا نام ایک عجیب سا

سحر طاری کر دیتا ہے۔ کشش کی وجہ پنجابی تاریخ میں اس کی گہری جڑیں ہیں جو اہل لاہور کے لئے ایک خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

تاریخ کے تمام عظیم الشان شہنشاہوں کی طرح رنجیت سنگھ کا بھی آباد حرم تھا اگرچہ یہ حجم میں اتنا بڑا نہیں تھا جتنے بڑے اس سے پہلے مغلوں اور ان جیسے دیگر حکمرانوں کے تھے۔ رنجیت سنگھ قلعہ لاہور کے بڑے سے شیش محل کے اوپر والی منزل کے چھوٹے سے کمرے سے اپنی سلطنت کے سنگھاسن پر سریر آرا ہوا کرتا تھا۔ اس کا حرم چار طبقات میں منقسم تھا۔ پہلے دو طبقوں میں نو نو عورتیں تھیں' تیسرے میں سات عدد اور چوتھے میں اکیس عورتیں تھیں۔ ہر طبقے کی عورتوں کا انتخاب سکھ اور مسلمان علماء کیا کرتے تھے۔ جنہیں علم الاعداد اور علم رمل اور نجوم میں ملکہ حاصل تھا۔

پہلے طبقے میں شاہی بیگمات شامل تھیں جو تمام کی تمام سیاسی نظریہ ضرورت اور معاہدوں اور پسند و ناپسند کے مطابق ہوتی تھیں۔ دوسرے درجے میں بیوہ عورتیں شامل تھیں جن سے بیگمات ہی کی طرح برتاؤ کیا جاتا تھا۔ تیسرے درجے میں منتخب داشتائیں تھیں جو تمام تعلیم یافتہ اور ذہین عورتیں ہوتی تھیں۔ آخری درجے میں کنیزوں کی صف بندی تھی۔ ان تمام عورتوں کا انتخاب ان کی خوبصورتی کی بنا پر ہوتا تھا اور وہ سلطنت کے دور ونزدیک سے لائی جاتی تھیں۔ ان کے لئے یہ معمول کی بات تھی کہ انہیں پچیس برس کی عمر کو پہنچ کر ریٹائر ہو جانا ہے تاکہ نئی اور نوجوان عورتیں ان کی جگہ لے سکیں۔ شاہی گھرانوں میں یہی زندگی کا چلن تھا۔

لاہور میں بشیراں نام کی ایک عورت تھی جو غیر معمولی طور پر حسین و جمیل تھی وہ نہایت اعلیٰ درجے کی گلوکارہ تھی اور مہاراجہ پر نشہ طاری کر دیتی تھی۔ رنجیت سنگھ اس کی بلی کی مانند ہلکی بھوری آنکھوں کی وجہ سے اسے بلو کہا کرتا تھا۔ اس کا لازوال حسن ایسا تھا کہ سارے لاہور کو پتہ تھا کہ بلو مہاراجہ کے سوا سب کے لئے ممنوعہ ہے وہ ہر لحاظ سے شہنشاہ کی منظور نظر تھی۔ جس نے اس کے لئے آٹھ ہزار روپے سالانہ کی جاگیر دینے کا حکم جاری کیا۔ حالانکہ کسی بھی دوسری عورت کو اس سے نصف دیا کرتا تھا۔ اس کا مؤثر اثاثہ دیوان حافظ کی غزلیں گانے کی صلاحیت تھا جن میں سے اکثر اسے زبانی یاد تھیں۔ اس کی آواز میں جو نغمگی تھی اس کا موازنہ شاذونادر ہی کیا جاسکتا تھا۔ لاہور کی گلیوں میں اگر کسی نوجوان حسینہ کی انا اس کے سراپے سے بڑھ کر ہوتی تو اسے طنزاً بلو کہا جاتا تھا۔ یہ تھا لاہور کی بشیراں کی غضبناکی کا عالم۔ ایک تحریر کے مطابق پانی والا تالاب کے قریب ایک وسیع حویلی میں اس کی رہائش تھی۔

ایک اور تحریر میں ایک دلچسپ واقعہ درج ہے کہ ایک روز رنجیت سنگھ نے تفریحی موڈ میں بشیراں کو پیشکش کی کہ وہ اسے پندرہ ہزار مالیت کے زیورات چار ہزار روپے کی مزید جاگیر عطا کرے گا اگر وہ نیک دل مسلمان وزیر فقیر نورالدین کو اپنی محبت میں اسیر کرلے تو! ''نہیں مہاراجہ شکریہ!'' بلو نے کہا ''مجھے خدشہ ہے کہ اس جیسے مقدس شخص پر گناہ کی نظر ڈالنے سے کہیں میں اندھی نہ ہو جاؤں۔'' بہرحال فقیر نورالدین کا بھائی فقیر عزیز الدین جو خود بھی دربار میں وزیر تھا' اس کی اداؤں پر مرمٹا۔ ایک روز جب وہ مہاراجہ سے ملنے گیا تو اس کے مشاہدہ میں آیا کہ راجہ حافظ کی غزل سننے میں مگن تھا۔ وہ شاعری سننے کے لئے ٹھہر گیا اور ایک مقام پر وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے ''اللہ اکبر'' کا نعرہ بلند کیا اور پھر اپنے آپ کو ٹھنڈا کرنے کیلئے قریبی پانی کے تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ شاہی خدام بھی اس کی جان بچانے کے لئے اس کے ساتھ ہی تالاب میں کود گئے۔ کیونکہ وہ بیہوش ہو چکا تھا۔ اس روز کے بعد سے جب بھی فقیر عزیز الدین کی مہاراجہ کے دربار میں آمد کی اطلاع ملتی تو ہر قسم کی موسیقی بند کر دی جاتی تھی۔ مہاراجہ کہا کرتا ''بھاراؤ بھاگ جاؤ'' بھاراؤ پنجابی میں فاختہ کو کہتے ہیں لیکن اس

کی مراد سازندے ہوتے تھے یہ محاورہ آج بھی لاہور کے قدیم شہر میں رائج ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ بلو کی موجودگی میں کیسی نشستوں کا اہتمام کیا کرتا تھا اس کی ایک جھلک پیش خدمت ہے۔ ان نشستوں میں جو شراب پلائی جاتی تھی وہ نہایت منتخب کشمش سے کشید کی جاتی تھی جس میں نہایت باریک پسے ہوئے موتیوں کی آمیزش کی جاتی تھی۔ وکٹر یکموں نے بہت بعد میں تحریر کیا کہ شراب نہایت اعلیٰ درجے کی تھی اور بلو کے ساتھ نشستوں میں بے ہودگی کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا بلکہ نہایت سنجیدہ ہوتی تھیں اور اپنی مثال آپ ہوا کرتی تھیں۔ یہ عام تاثر کہ ان میں رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں اس کا سچائی سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ایسی نشستیں فنون کے نکتہ رس صاحب الرائے حضرات کے لئے تھیں یا ان کے لئے جو شاعری اور فنون لطیفہ کے گرویدہ تھے۔

اپنی جوانی میں بلو کا طائفہ چالیس جواں سال ناچنے والیوں پر مشتمل تھا۔ اپنے گانے کے دوران وہ پس منظر میں خاموش ناچ پیش کرنے کی صلاحیت کو بروئے کار لاتی تھی تاکہ جو غزلیں وہ گایا کرتی تھی ان کا ایک مکمل تاثر اُبھر سکے۔ ہر ناچنے والی لڑکی ''بلو رانی'' کہلاتی تھی۔ یہ اصطلاح آج بھی اندرون شہر مستعمل ہے۔ بلو جو لباس ان ناچنے والی ''رانیوں'' کو پہنایا کرتی تھی، آج بھی لاہور کے علاقے ٹبی میں اس پیشے کو اپنانے والیاں وہی لباس زیب تن کرتی ہیں۔ بلاشبہ لاہور کی بشیراں عرف بلو اپنے زمانے کی عظیم مغنیہ تھی۔ یہ مقبول عام روایت اب تک قائم و دائم ہے۔

فقط لاہور ہی نہیں بلکہ پورے پنجاب کے لوگوں کے ذہنوں میں بلو کے نئے تصور کو پیدا کرنے کا اعزاز ابرار الحق کو جاتا ہے۔ یہ مُرا خیال نہیں ہے کہ اس تخلیقی عبقری کو چاہئے کہ ان جیسی حیرت انگیز عورتوں کے بارے میں مزید مطالعہ کرے اور عوام الناس کے ذہنوں میں بلو جیسی عورتوں کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت اور جوہر قابل کی حامل عورتوں کو دوبارہ بحال کر سکے۔

شہزادہ جو فقیر ہو گیا

ایک زمانے میں لاہور پر احمد شاہ ابدالی کے پوتے شاہ زماں کی حکومت تھی۔ افغانستان کے پہاڑوں سے آنے والوں کا واحد مقصد ہمارے ملک کے عوام کی لوٹ کھسوٹ تھا۔ ان کے مرنے اور معدوم ہونے کے برسوں بعد اسلامی مطمع نظر کے بہانے تراشے گئے۔ کسی بھی طرح سے ''دولت کے انبار لگانے'' کو اپنی صوابدیدی سیاسی معنی پہنانے کا آسان عمل۔ ایک زمانے میں اہل لاہور خصوصی طور پر اور اہل پنجاب عمومی طور پر دولت کے انبار لگانے کی سعی لاحاصل کو بیان کرنے کے لئے ایک جملہ کہا کرتے تھے۔ ''جو تم کھا پی سکتے ہو وہ تمہارا ہے باقی ماندہ احمد شاہ ابدالی کی ملکیت ہے۔'' یہ تھا وہ خوف کا عالم جو ان افغانی لٹیروں کی مسلسل آمد میں باقاعدگی کی وجہ سے پیدا ہو چکا تھا۔ سکھ اقتدار کے عروج کے باعث تمام بڑی افغان مہمات کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ خاص طور پر جب سفاک کرنیل ہری سنگھ نلوا پنجاب کی حکومت قائم کرنے کے لئے کابل تک جا پہنچا تھا۔ تاریخی دعاوی کا دائرہ مکمل ہو چکا تھا۔ نلوا کی غضبناکی اس قدر شدید تھی کہ آج بھی افغانی مائیں اپنے بچوں کو ڈرانے کے لئے کہتی ہیں کہ ''رونا دھونا بند کرو ورنہ نلوا آ جائے گا۔''

لاہور کے حکمرانوں کی داستانوں میں قسمت کے پھیر کی دلچسپ ترین کہانی شاہ زماں کی ہے۔ اپنے باپ تیمور اور دادا ابدالی کی طرح کابل کا حکمران ہر سال پنجاب پر چڑھ دوڑتا اور لاہور کا رُخ کرتا۔ دریائے سندھ تک کوئی ان کی راہ میں زیادہ حائل نہ ہوتا۔ لیکن ایک بار جب وہ شہزور دریا عبور کر لیتا تو ابتدائی طور پر مقامی حکمران انہیں روکنے کی کوشش کرتے لیکن جب وہ دیکھتے کہ وہ ان سے بہت زیادہ طاقتور ہیں تو چپکے سے پرے

ہو جاتے اور انتظار کرتے۔ تسلیم شدہ پنجابی گوریلا حکمت عملی وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی گئی۔ یہ ان حملہ آوروں سے دھوکہ کرتے اور انہیں دہلی کی طرف جانے پر اکساتے اور واپسی پر راستے میں حملہ آوروں پر درپردہ وار کردیتے حتیٰ کہ سارا مال غنیمت چھین لیتے۔ سکھ مثل فوجی اس کام میں ماہر تھے۔ اسی حکمت عملی نے آخرکار افغانوں کو ہمیشہ کے لئے کچل کر رکھ دیا اور پورے پنجاب میں پنجابی حکومت قائم ہوگئی۔

افغان حکمرانوں کا بڑا مسئلہ پنجابیوں سے جنگ کرنا نہیں بلکہ اپنے ملک میں سازشوں سے نبٹنا تھا۔ یہ ایک بھائی کی دوسرے بھائی سے مخالفت تھی۔ جب بھی ایک بھائی ہندوستان پر حملے کے لئے روانہ ہوتا تو دوسرا بھائی اس کے تخت پر قابض ہونے کی کوشش کرتا۔ شاہ زماں کے دو طالع آزما بھائی تھے جو اس کے لئے بے شمار مشکلیں کھڑی کردیتے تھے۔ 1796ء میں جب وہ تیسری بار ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اس کے بھائی محمود نے شب خون مار دیا۔ ہر سال اسی طرح ہوتا رہا۔ شاہ زمان نے لاہور پر آہنی پنجے والی سخت گیر حکومت کی لیکن آخر کار اس کے بھائیوں نے اسے شرافت چھوڑنے پر مجبور کردیا تو اس نے اس کی آنکھیں نکلوادیں۔

جب تک رنجیت سنگھ پنجاب کے مہاراجہ کے طور پر اپنی حیثیت مستحکم کرتا شاہ زمان ایک بار پھر اپنے بھائیوں کے ہاتھوں راہ فرار اختیار کرچکا تھا۔ شاہ شجاع اٹک پہنچا جہاں اس کے مشفق میزبان نے اسے سازش کے شبے میں قید کرکے کشمیر بھیج دیا۔ لیکن رنجیت سنگھ نے فیصلہ کیا کہ شاہ زمان اور شجاع کے اہل خانہ کو راولپنڈی میں پناہ دے دی جائے لیکن انہوں نے وہاں بھی سازش شروع کردی انہوں نے جلاوطن حکومت قائم کرلی اس پر شاطر رنجیت سنگھ مجبور ہوگیا کہ انہیں لاہور لے آئے اور ان پر کڑی نظر رکھے۔

11 نومبر 1811ء کو لاہور کا سابق حکمران شاہ زمان اندرون شہر لاہور میں داخل ہوا۔ وہ ایک بادشاہ کی حیثیت سے یہاں سے گیا تھا لیکن اب ایک حقیقی فقیر کی طرح واپس آیا تھا۔ اسے بازار حکیماں کی ایک شاندار حویلی میں رہائش دی گئی اور اس کی کڑی نگہداشت کی گئی۔ لیکن پھر اس خاندان کی سازش کی اشتہا ان پر غالب آگئی۔ اس وقت رنجیت سنگھ اپنے بیٹے اور وارث کھڑک سنگھ کی شادی کے شاندار استقبالئے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس سے قبل شہر میں اتنی شاندار اور وسیع پیمانے پر کوئی شادی نہیں ہوئی تھی۔ دولہا کو دو لاکھ چھتیس ہزار روپے نقد سلامی میں ملے جو موجودہ دور کے سونے کی مالیت کے حساب سے بیس کروڑ سے زائد کی رقم بنتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پانچ ہزار روپے نقد کا گراں قدر تحفہ پیش کیا۔

لیکن رنجیت سنگھ کا شاہ زمان اور اس کے خاندان کو مہمان ٹھہرانے کا مقصد افغان سازش سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اس کی آنکھ، ایک ہی آنکھ تھی، گولکنڈہ کی کان سے برآمد شدہ ''کوہ نور'' ہیرے پر تھی اور وہ ہیرا اس کے مہمانوں کے تصرف میں تھا۔ یا اشتباہ تھا کہ ان کے پاس ہے۔ ابتدائی طور پر جب یہ ہیرا کان سے برآمد ہوا اور اس کو چمکایا گیا تو یہ مغلوں کی ملکیت تھا۔ پھر ایرانی حملہ آور نادر شاہ نے 1739ء میں کوہ نور ہیرا اور تخت طاؤس شہنشاہ محمد شاہ سے چھین لئے۔ جب 1747ء میں نادر شاہ کو قتل کردیا گیا تو یہ احمد شاہ ابدالی کے قبضے میں آگیا۔ پھر تیمور کے ہاتھ لگا اور پھر شاہ زمان کی ملکیت میں آگیا۔ اس کے بعد شاہ شجاع اور اس کی بیوی وفا بیگم کی ملکیت رہا۔ جب وہ کابل سے فرار ہوا تو ہیرے کو لاہور لے آیا چنانچہ اسی کنبے سے رنجیت سنگھ نے ہیرا نکلوالیا۔ وفا بیگم نے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس کے خاوند کی آزادی کی کوشش کی گئی اور اس کے بھائی سے تخت واپس حاصل کرنے میں مدد فراہم کی گئی تو وہ ہیرا حوالے کردے گی۔ چنانچہ شاہ شجاع کو کشمیر کی قید سے رہا کروایا گیا اور [illegible] بڑی دھوم دھام سے [illegible] اس کا سواگت [illegible]

رنجیت سنگھ کا وفادار محکم چند اسے لے کر آیا تھا۔ ان کی آمد کے دوسرے دن ہی رنجیت سنگھ نے کہلا بھیجا کہ اب افغانیوں کو اپنے وعدے کا پاس کرتے ہوئے مشہور ہیرا اس کے حوالے کر دینا چاہئے۔ افغانیوں نے قرآن پر حلف دیا کہ ہیرا ان کے پاس نہیں رنجیت سنگھ نے ان سے وعدہ نبھانے کے لئے تین دن تک کوشش کی لیکن افغانی نہیں مانے پھر شجاع شاہ نے ہیرے کی قیمت پچاس ہزار روپے نقد لینے اور پنجاب کے جنوب میں واقع علاقے کی بازیافت میں مدد کے وعدے پر کہا کہ وہ اس بارے میں سوچے گا۔ اس موقع پر پنجابی ازلی دوستی کی خاطر اپنی پگڑیاں بدل لیتے تھے یکم جون 1813ء کو شاہ شجاع نے ہیرا مہاراجہ کے حوالے کر دیا۔ اس تمام عرصے میں یہ انہی کے پاس تھا۔

اس بارے میں بہت سے بیانات ہیں کہ ہیرا کیسے نکلوایا گیا۔ یہ بیان محکم چند کی' جو اس موقع پر موجود تھا جب قیمت کی ادائیگی ہوئی اور ہیرا وصول کیا گیا' ڈائری سے ہے۔ لاہور ہی میں انگریزوں نے یہ ہیرا قبضے میں لیا جواب ملکہ برطانیہ کے تصرف میں ہے۔ چنانچہ جب لاہور کا حکمران فی الواقعی ایک فقیر کی حیثیت سے گیا اور ہیرے کو قیمتاً فروخت کر دیا۔ اسی بنیاد پر لاہور کے دارالحکومت والی پنجاب گورنمنٹ اس ہیرے کی حقیقی اور جائز مالک ٹھہرتی ہے۔ کیا ہم کبھی اس ہیرے کو بازیافت کرا پائیں گے؟ سخت تردد والی بات ہے۔ روایت در آتی ہے کہ ایک دلکش لاہوری مثل ہے کہ ہیرا ایک دن لاہور واپس آ جائے گا۔

بدمعاش جو بزرگ سے زیادہ نامور ہوا

جب ہم گڑھی شاہو کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمیں ریلوے سٹیشن کا خیال آتا ہے' عیسائی فرقے کا خیال آتا ہے۔ برٹ انسٹی ٹیوٹ جیسے شاندار ناچ کلب کا خیال آتا ہے جواب بیکار پڑا ہے اور ہمیں کونوینٹ آف جیزز اینڈ میری کا خیال آتا ہے۔ لیکن یقیناً اس جگہ کے بارے میں اور بھی بہت کچھ ہے جسے ہم نے کبھی کھنگالنے کی کوشش نہیں کی۔

گڑھی شاہو علاقے کی شہرت کا عروج برطانوی دور میں تھا جب ریل کی پٹڑی بچھائی گئی۔ ان دنوں انجن ڈرائیور ہونا بڑی بات سمجھی جاتی تھی ابتدائی طور پر تمام انجن ڈرائیور انگریز تھے اور برطانوی راج نے ان کے لئے ریلوے کی پٹڑی کے نزدیک نہایت خوبصورت رہائش گاہیں تعمیر کیں تھیں جواب بھی پرشکوہ میوگارڈنز سے لے کر برٹ کلب تک اور دوسری کالونیاں جو پرانے میوروڈ' جسے اب علامہ اقبال روڈ کا نام دے دیا گیا ہے' کے دونوں اطراف میں پھیلی ہوئی تھیں۔ پتہ نہیں ہم اپنی تاریخ کو کیوں بھول جاتے ہیں؟ پھر انگریزوں نے ریلوے کے محکمے میں ہندوستانی عیسائیوں کو بھرتی کرنا شروع کر دیا جو زیادہ تر پرتگالی تھے جن کا تعلق گوا سے تھا اور لاہور ڈی سوزا' ڈی سلویا اور فیریز خاندانوں سے بھرا پڑا تھا اور سفید فام اصل انگریزوں کا تو ذکر ہی نہ کریں جن کے خاندان برٹن' برائن اور نبلٹ تھے۔

ان کو ریلوے پولیس میں بھی بھرتی کیا گیا اور بعد ازاں پنجاب پولیس میں بھی اور ان تمام لوگوں نے بڑی ممتاز خدمات سرانجام دیں۔ آج تقریباً یہ سب لوگ ہمارے تعصبات کا شکار ہونے کی بنا پر ٹھنڈے ملکوں کی طرف پرواز کر گئے ہیں۔ گڑھی شاہو کا معاشرتی اور ثقافتی ماحول بقیہ لاہور کے علاقوں سے غیر معمولی طور پر مختلف تھا۔ ہر کوئی وہاں جانا چاہتا تھا۔

لیکن پھر اس علاقے کی اصل کہانی شہنشاہ شاہ جہان کے دور سے شروع کرنا پڑے گی کیونکہ اسی کے دور

حکومت میں ایک عرب بزرگ جن کا نام ابوالخیر تھا لاہور تشریف لائے تھے۔ وہ اسلامی فقہ کے معروف عالم دین تھے اور بغداد سے سفر کر کے ہندوستان پہنچے تھے۔ پنجاب پہنچنے پر اس کا موسم طبیعت کے موافق پایا تو لاہور میں تھوڑی دیر قیام کا فیصلہ کیا۔ ان دنوں جو علاقہ اب گڑھی شاہو کہلاتا ہے محلہ سیداں کہلاتا تھا۔ کیونکہ اس علاقے میں عالم حضرات قیام پذیر تھے جیسے سید جان محمد حضوریؒ جن کے نام پر حضوری باغ ہے۔ یہ دانشمندانہ ماحول انہیں بہت پسند آیا اور انہوں نے یہیں آباد ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

شہنشاہ اورنگزیب کے دور حکومت میں ابوالخیر کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی تھی۔ شہنشاہ کی خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان بزرگ شخصیات سے فائدہ اٹھائیں۔ اس نے حکم دیا کہ بزرگ عالم دین ابوالخیر کے لئے ایک مدرسہ اور موزوں رہائش تعمیر کی جائے ایک شاہی فرمان کے ذریعے اس مدرسے اور گھر کی دیکھ بھال کے لئے ایک رقم بھی مختص کر دی گئی۔ چنانچہ ابوالخیر کا ادارہ قائم ہو گیا۔ آج بھی گڑھی شاہو کے بڑے چوراہے کے قریب جہاں سڑک تھوڑا سا خم کھاتی ہے ایک چھوٹی سی گلی ہے۔ جس کے خاتمے پر قبرستان کے ایک کنارے پر قائم دائم ہے لیکن غیر آباد اور لاوارث۔

ابوالخیر صاحب نے 105 برس کی عمر تک اپنے مدرسے میں پڑھایا اور پھر اپنی وفات پر اس دور کے دیگر معروف لوگوں کی طرح وہیں دفن ہوئے۔ جب مغلیہ سلطنت روبہ زوال تھی اور طوائف الملوکی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی تو علم و فضیلت کی قدر و منزلت نہ رہی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ سے قبل لاہور پر تین سکھوں کی حکمرانی تھی۔ بالآخر رنجیت سنگھ نے سختی سے نظم و ضبط پر عمل پیرا ہو کر چالیس برس تک حکومت کی۔ بہرحال جس زمانے میں طوائف الملوکی چار سو پھیلی ہوئی تھی تو مدرسے پر ایک ''خلیفہ'' نے قبضہ کر لیا جس کا نام محمد نعیم تھا۔ جو وہاں پڑھایا کرتا تھا اس کے انتقال کے بعد یہ خلاء پُر کرنے والا کوئی نہ تھا۔

لیکن طوائف الملوکی کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ اسے پتہ ہوتا ہے کہ خلاء کو کس طرح سے پر کیا جائے جیسا موجودہ دور میں ''قبضہ گروپ'' قانون کا تمسخر اُڑاتے رہتے ہیں۔ ایک لحاظ سے تو کچھ بھی نہیں بدلا۔ موجودہ دور کے گڑھی شاہو چوراہے کے قریب مکان اور مدرسے پر کئی بدمعاشوں کی آنکھ تھی۔ لوگوں نے مدرسے کی عمارت سے اینٹیں چرانا شروع کر دیں ڈاکوؤں کے جتھے مدرسے کے طالب علموں پر حملہ آور ہوتے اور ان کی معمولی نوعیت کی اشیاء لوٹ لے جاتے تھے۔

پھر شاہو نام کا ایک حقیقی مافیا کا گرو اپنے رسہ گیر' مویشی چور ٹولے کے ہمراہ آیا اور عالم دین ابوالخیر اور اس کے دیگر علماء کرام کے لئے بنائی گئی دونوں عمارتوں پر قابض ہو گیا۔ وہ علاقے سے مویشی اور دوسری اشیاء چرا کر لاتے اور اس محفوظ جگہ پر ذخیرہ کرتے تھے۔ اگر مالکان آجاتے تو قلیل معاوضہ لے کر ان کی اشیاء واپس کر دیتے بصورت دیگر ان کو فروخت کر دیتے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب تین سکھ حکمران اپنی الگ الگ چھوٹی عملداریوں تک محدود تھے۔ چنانچہ شاہو کے ٹولے کا سب سے زیادہ اقتدار تھا۔ اسی کی وجہ سے اس علاقے کا نام شاہو دی گڑھی پڑ گیا۔ سکھوں نے بھی اسے گڑھی شاہو کہا اور انگریزوں نے بھی اور ہم بھی یہی کہتے ہیں اور ہمیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم اس کا نام تبدیل کر دیں کیونکہ شاہو ایک بدنام زمانہ کردار تھا اور اس نے بالکل ویسی زندگی بسر کی جیسے آج کل کے ''معزز'' شہری بسر کرتے ہیں اور یہ مذاق کی بات نہیں۔

لیکن انگریزوں نے گڑھی شاہو کا حلیہ یکسر بدل کر رکھ دیا۔ کیونکہ یہ ان کی افواج اور رعایا کو آمد و رفت کے

ذرائع مہیا کرنے کی تمام تر کارروائیوں کا مرکز تھا۔ جو ان کی زندگیوں میں نمایاں طور پر انقلاب لے آئے ذرا سوچئے تو زندگی میں ذرائع آمدورفت کی وجہ سے انقلاب آ جانا بعینہ ایسے ہی ہے جیسے اندرونی محرق انجن یا اپنے زمانے میں موبائل ٹیلی فون کا چلن ہونا لیکن کون سوچ سکتا تھا کہ ایک ایسا علاقہ جو اپنے رہائش پذیر اور وقت کے عالم دین شخص کے نام کو برقرار نہ رکھ سکا اور ایک پورے بدمعاش شخص کے نام کو جو صحیح معنوں میں "قبضہ گروپ" کا لیڈر تھا قائم رکھا۔ قسمت کے عجیب پھیر لاہور میں دیکھنے کو ملتے ہیں کیونکہ ہر اینٹ کی اپنی کہانی ہے۔

نامور خواجہ سرا

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ سراؤں میں ایک عجیب قسم کی کشش پائی جاتی ہے۔ اگرچہ ہمارے والدین نے ہماری پرورش میں ناپسندیدہ افراد قرار دے کر انہیں سختی سے نظرانداز کرنے کو کہہ رکھا ہے، لیکن جوان ہونے پر حیرت کا اظہار ہوتا ہے کہ کیا ان کے پاس اصلی سودا ہے بھی یا نہیں؟ تاریخ میں انہوں نے ایک زبردست کردار ادا کیا ہے۔ دو طرح سے۔ ایک تو حسب سابق حالت کی پاسداری کرنے کا اور دوسرے ظالم حکمرانوں کے ضمیروں کو مسلسل کچوکے لگاتے رہنے والے طبقے کی حیثیت سے۔

اگر آپ داتا گنج بخشؒ کے مزار پر زیارت کے لئے جائیں اور نئی تعمیر شدہ مسجد کی طرف منہ کر کے بائیں گلی میں چلتے چلے جائیں تو آپ بلال گنج روڈ والے چوراہے پر جا نکلیں گے۔ اگر آپ ریتی گن روڈ کی طرف واپس چلیں تو بائیں ہاتھ دو گلیوں میں ایسا علاقہ ہے جہاں دو برادریاں رہتی ہیں یعنی لاہور کے خواجہ سرا اور مزار کے پٹھان فقیر۔ ان بھول بھلیوں والی گلی میں باہر کے افراد کو اتنی کڑی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ دونوں برادریاں نہ تو کسی کو ایک انچ زمین دیتے ہیں نہ ہی پیشکش کرتے ہیں۔ یہ ان کا اپنا علاقہ ہے ان کی اپنی جنت۔ اس کھلے اور وسیع علاقے میں ان برادریوں کے عجیب راز چھپے ہوئے ہیں۔

اگر آپ روشنائی دروازے سے قلعہ میں داخل ہوں جو اب عوام کے لئے قلعے میں داخل ہونے کے لئے ایک ہی کھلا دروازہ ہے تو آپ کے سامنے اس تاریخی عمارت میں آگے جانے کے دو راستے ہیں۔ وہ سڑک جو اوپر کی طرف بل کھا کر دائیں جانب چڑھتی ہے یہ راستہ ہے جہاں ہاتھی اپنی سواریوں سمیت گزر کر دیوان عام کی طرف اور اس سے بھی آگے دیوان خاص تک جایا کرتے تھے۔ اگر آپ بڑی بڑی سیڑھیوں اور فٹ پاتھوں والا راستہ اپناتے ہیں جو سیڑھیوں سے پٹڑی والے راستے کے بائیں جانب پڑتا ہے تو اوپر جا کر شیش محل کے بالکل سامنے پہنچ جائیں گے۔ اگر آپ ان سیڑھیوں والے راستے پر چلیں تو آپ کو دیواروں میں جا بجا گولیوں کے نشان ملیں گے۔ کچھ پر تو سائن بورڈ لگے ہوئے ہیں جو ان کی جانب اشارہ کرتے ہیں باقی آپ خود چلتے ہوئے دیواروں میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ نشانات ان لڑائیوں کے ہیں جو دو سو برس قبل لڑی گئی تھیں اور چند ایک اس سے بھی پہلے لیکن گولیاں اور خواجہ سرا کہاں سے آن ٹپکے؟ یہاں ہمیں شاہی خاندانوں میں خواجہ سراؤں کے تاریخی کردار کو دھیان میں رکھنا ہوگا کیونکہ خواجہ سراؤں کے بغیر کسی شاہی خاندان کا وجود نہ تھا۔

مغلیہ خاندان۔ کے آخری عظیم شہنشاہ اورنگزیب کی وفات اور شہنشاہ شاہ عالم کی وفات کے بعد جب لاہور پر قبضہ کرنے کے لئے لڑائی شروع ہوئی تو عظیم بادشاہ کے پڑپوتے سے تعلق رکھنے والی فوجیں حملہ آور ہوئیں تو اسی راستے سے قلعہ میں داخل ہوئی تھیں۔ جب انہوں نے حرم کے علاقے کی طرف یلغار کی جہاں باقاعدہ طور پر "خواجہ سراؤں کی ایک فوج" حفاظت پر مامور تھے جو رہداریوں اور باورچی خانوں میں استعمال ہوتے تھے۔ جونہی سپاہیوں نے پیش قدمی کی تو خواجہ سراؤں نے سپاہیوں پر اوپر

سے چھلانگیں لگا دیں۔ چند ایک نے حرم کی شہزادیوں اور خواتین کی حفاظت کے لئے چاقوؤں کا آزادانہ استعمال کیا۔ یہ بہت ہی خونیں اور ہولناک واقعہ تھا اور خواجہ سرا اس راہداری کے ایک ایک انچ کے لئے لڑتے اور قربان ہوتے رہے۔ "بالآخر حملہ آوروں کو حرم سرا پہنچنا ہی تھا جہاں تعینات سپاہیوں نے حقیقتاً بے چوں و چرا بغیر لڑائی لڑے ہتھیار ڈال دیئے۔" بہت بعد کی بات ہے جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد قلعہ پر بادشاہی مسجد کے اگلے دونوں میناروں سے جہاں توپیں نصب تھیں گولہ باری کی گئی تھی۔ سپاہیوں کو حرم کے علاقے میں داخل ہونے کی جرأت نہیں ہوئی تھی کیونکہ یہ افواہ عام تھی کہ وہاں سکھ سپاہیوں سے زیادہ خوفناک خواجہ سرا موجود تھے۔ یہ توضیح اس لئے بھی قابل یقین ہے کہ جب 22 ستمبر 1857ء کو کیپٹن ہڈسن نے آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کیا تو دہلی کے خواجہ سراؤں کی بہادری کے قصے لاہور میں گردش کرتے رہے تھے۔ ہڈسن نے اپنی ذاتی ڈائری میں لکھا۔ "میں بادشاہ اور اس کی چہیتی بیوی کو گرفتار کرتے وقت خوش نصیب رہا اور آج مزید خوش نصیب ٹھہرا ہوں کیونکہ میں نے بادشاہ کے دونوں بیٹوں اور مشہور یا بدنام پوتے ابو بخت نامی کو گرفتار کرکے تباہ و برباد کر ڈالا ہے۔ اس کی حفاظت پر مامور ایک خوفناک خواجہ سراؤں کے دستے نے سخت مزاحمت دکھائی لیکن ان سب کو ہلاک کر دیا گیا۔ یہ بات لائق تحسین ہے کہ ہر خواجہ سرا بڑی بے خوفی اور تندخوئی سے اپنے مؤقف پر ڈٹا رہا۔"

لاہور کے خواجہ سراؤں کی اپنی روایت ہے۔ جس کے تحت وہ اپنے "بادشاہ" کا انتخاب کرتے ہیں جو صرف مرنے پر ہی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ یہ انتخاب داتا صاحب کے علاقے میں کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے بادشاہ کی بڑی بے جگری سے حفاظت کرتے ہیں اور بادشاہ کی اجازت کے بغیر تو پولیس بھی اس علاقے میں داخل نہیں ہوسکتی۔ خواجہ سراؤں کے مابین شادیوں کی اجازت بھی بادشاہ ہی دیتا ہے اگر کوئی دوستی کا یہ بندھن توڑنا چاہے یا اسے آپ جو بھی نام دینا چاہیں تو پھر لاہور کے خواجہ سراؤں کا یہ طبقہ جوابی حملہ کردیتا ہے۔ یہی وجہ سے لاہور کی پولیس کی بھی یہ روایت رہی ہے کہ وہ بھی اس علاقے میں دخل اندازی نہیں کرتے۔

آپ حیرت میں ہوں گے کہ اس مزار کے پٹھان فقیروں نے لاہور کے خواجہ سراؤں سے کیا لینا ہے؟ مقبول عام روایت یہی ہے کہ دو سو برس سے زیادہ عرصے سے' جب سے مغل حکمرانوں نے لاہور کے خواجہ سراؤں کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیا تھا ان کی آمدن کا عشر خواجہ سراؤں کے "بادشاہ" کے حوالے کردیا جاتا تھا جو اسے اپنی برادری کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتا ہے۔ کسی قابل ثبوت ریکارڈ سے اس روایت کی تصدیق نہیں ہوتی لیکن اس کی زبانی توثیق آج بھی ملتی ہے۔ یہ بہت ہی مسدود برادری ہے جو امید ہے آہستہ آہستہ کھل جائے گی۔ کیونکہ پاکستان اور دیگر دنیا کے ممالک ان سے مزید رواداری کا سلوک کررہے ہیں جس کی ترجیحات عام شہری کی بہ نسبت "غیر مشابہ" ہیں یہ بھی بحث طلب نکتہ ہے۔

جگے کی بہن میداں

جب میں نے بالآخر یہ خبر پڑھی کہ خشونت سنگھ کے ناول "ٹرین ٹو پاکستان" پر بنی ہندوستان میں ایک فلم بنے گی تو مجھے نمبر کا خیال آیا اور پھر جگے کا جو عورتوں کی عصمت دری کرنے والا ڈاکو تھا اور ساتھ ہی مجھے میداں کا خیال آگیا اگر کوئی ترسانے والی عورت تھی تو وہ میداں ہی تھی۔

میرے کالج کے ایام میں ہم اپنے دوست شیرد کے' اندرون شہر بھاٹی دروازے میں واقع گھر پیدل جایا کرتے تھے اور اکثر داتا دربار کے علاقے میں پہنچنے کے لئے پرانی خندق جسے سب لوگ نالے کے نام سے پکارتے تھے پر سے ہاتھی پل پر سے ہوکر جایا کرتے تھے جو اندرون شہر کے انتہائی جنوب مشرق میں واقع ہے۔

جب ہم نالے کے ساتھ ساتھ چلتے تو ہم بہت سی بھینسوں کو وہاں بندھا ہوا دیکھتے' یہ میداں کی ملکیت تھیں غالباً اس کا نام حمیداں تھا اور خالص لاہوری زبان میں اگر یہ نام ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ بولیں تو اس میں جنسی کشش آ جاتی ہے اور اگر نام کے آخری حصے کو تھوڑا سا کھینچ کر بولیں تو اس میں مزید شہوانی کشش کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

لیکن میداں کوئی آسان ہدف نہ تھی۔ وہ چھ فٹ لمبی اور چوڑے عرض کی تھی موٹاپا نام کو نہ تھا۔ اس کا جسم سخت مشقت والے کام کرنے سے اس قدر متناسب ہو چکا تھا کہ پینسٹھ سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود وہ ٹھاٹھ دار لگتی تھی۔ غالباً جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو ہر شے ہیجان انگیز ہوتی تھی۔ لیکن میداں واقعی تھسے دار تھی۔ میرا دوست شیرو اس سے خوف کھاتا تھا اور خوف کھانے سے مراد واقعی سچ مچ خوفزدہ ہونا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے وجہ بتائی کہ "وہ جگے کی بہن ہے" میں اپنے قدموں پر ہی رُک گیا۔ اب وہ مجھے ڈراؤنی لگنے لگی اور میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی ہمت نہ کر سکا حالانکہ میرا قد چھ فٹ دو انچ ہے اور قبول صورت بھی ہوں۔ لیکن میں میداں کا جوڑ نہیں تھا۔ وہ غالباً مجھے ناشتے میں کھا جاتی۔ اس قسم کا خوف وہ ہر اس شخص کے دل میں پیدا کر دیتی تھی جو اسے ایک نظر دیکھ لیتا تھا۔

اندرون شہر کی خشک خندق کے جنوب مشرقی کونے پر واقع عمارت میداں کی ملکیت تھی وہ آج بھی اٹھانوے برس کی عمر میں وہیں رہتی ہے اور اب بھی اسی روایتی چارپائی پر بیٹھتی ہے جو پٹ سن کے دھاگے سے بنی جاتی ہے۔ اب بھی اس کے پاس بہت سی بھینسیں ہیں اور اس کی آواز دوسرے لوگوں سے اونچی ترین سنائی دیتی ہے۔ اٹھانوے برس کی عمر میں وہ اب بھی تھسے سے رہتی ہے۔ وہ اب بھی "برادری" کی کوٹ کچہری لگاتی ہے کیونکہ وہ جگے کی بہن میداں ہے اور کسی کو بھی اپنے قدموں پر روکنے کے لئے کافی ہے۔ بالکل جیسے بتیس برس قبل میرے ساتھ ہوا تھا۔

یہ بات ہمیشہ پراسرار رہی کہ میداں کیسے اپنی بھینسوں کے دودھ کو فروخت کرتی تھی کیونکہ اس طرز زندگی سے اس کا جواز نہ بنتا تھا۔ ایک قصہ مجھے بھاٹی دروازے کے تھانے کے ایس ایچ او نے سنایا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اردگرد کے دیہات سے چوری کی گئی تمام بھینسیں اسے ادنیٰ معاوضے کے عوض فروخت کر دی جاتی تھیں اور وہ ان کو اچھے خاصے منافع پر بیچ دیتی تھی لیکن کسی کی نہ ہی ایس ایچ او کی جرأت تھی کہ اس سے باز پرس کرتا کہ اس نے اپنی بھینسیں کہاں سے خریدیں ہیں۔ ایک بار ایک نڈر پولیس آفیسر نے جرأت کر کے چوری کی املاک قبضے میں رکھنے پر گرفتار کر لیا تو اس نے ضلع کچہری لاہور کے احاطے میں اس کی پٹائی کر ڈالی اور جب اسے جیل ہو گئی تو چار تگڑے جوانوں نے اس کو قابو کیا ہوا تھا۔

پھر ایک گھنٹے کے اندر اندر تین سو سے زائد گجروں نے اپنے ریہڑوں پر تھانے پر دھاوا بول دیا اور دو روز تک پورے شہر میں دودھ کی ترسیل بند کر دی۔ لاہور میں ایک بحران آ گیا کیونکہ لوگ کہتے تھے کہ میداں کو ہاتھ لگایا گیا ہے۔ اس کے مقدمے کی پیروی کے لئے لاہور اور اس کے گردونواح کے ہر گجر نے ایک ایک تولہ سونا مشترکہ فنڈ میں دیا۔ پہلی پیشی پر جج نے اسے رہا کر دیا اور ایس ایچ او کو ایک عورت پر دست درازی کی جرأت کرنے کی کوشش پر سرزنش کی۔

باعزت رہائی پر میداں ایک بہت بڑے جلوس کے ساتھ گھر لوٹی۔ تھانے کے باہر اس نے جنگی للکار بلند کی جسے مقامی زبان میں "بھڑک" مارنا کہتے ہیں۔ تھانے میں سے کسی نے کھڑکی سے بھی باہر جھانکنے کی جرأت نہیں کی۔ مجھے یاد ہے اس روز بھاٹی دروازے کے پورے علاقے میں دودھ مفت تقسیم کیا گیا۔ آج بھی کسی کو جگے کی بہن سے دخل اندازی کرنے کی جرأت نہیں ہے۔ حال ہی میں میرے دوست شیرو نے مجھے بتایا کہ وہ اب بھی زندہ ہے تو میں دوبارہ اسی راستے پر گامزن ہو گیا۔ وہ بیٹھی ہوئی تھی ہمیشہ کی طرح بڑے تھسے کے ساتھ۔ اٹھانوے برس کی لمبے قد والی طاقتور عورت' اس کے گرد ایسا ہالہ تھا جو ہر شخص کو اس سے دُور ایک فاصلے پر رکھتا تھا۔ کیونکہ اس کی بے حد عزت کی جاتی تھی۔ وہ بڑی عقل والی عورت ہے۔ وہ

اپنے لمبے چوڑے خاندان کو ہدایات دیتی ہے کہ ان کا طرز عمل کیسا ہونا چاہئے۔ سرکاری پابندی کے باوجود اب بھی اندرون شہر میں اس کے پاس بھینسیں بندھی ہیں لیکن پھر وہ میداں بھی تو ہے جگے کی بہن۔ وہ سو برس جیتی رہے گی اور قصے سناتی رہے گی کہ کس طرح اس کے بہادر بھائی نے اپنی محبوبہ نمو کو پاکستان جانے والی ٹرین پر بچانے کی خاطر اپنی جان کی قربانی دی تھی۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سارا قصہ ہی من گھڑت ہے اور یہ کہ سارے پنجابیوں کی طرح خشونت سنگھ ایک عظیم کہانی کار ہے۔ خشونت کا "جگا" مسلمان نہیں تھا تو میداں کس طرح جگے کی بہن ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے؟ اس بات نے مجھے پریشان کر رکھا تھا تو کیا جگا ڈاکو اور جگا گجر دو الگ کردار تھے؟ روایتی قصے کے مطابق جگا ڈاکو رسہ گیر، عورتوں کی عصمت دری کرنے والا اور اللہ کی زمین پر تند شراب پینے والا اور حد سے زیادہ نڈر شخص تھا۔ کوئی تعجب کی بات نہیں جو میداں اب بھی فخر سے سربلند کر کے چلتی ہے۔

یہ بلاقی شاہ تھا کون؟

جب آٹھ برس قبل میں نے کالم لکھنا شروع کیا تو میں نے لاہور کے بارے میں بحث و تمحیص کے لئے چند حدود متعین کر لی تھیں اور یہ حدود اندرون شہر بھاٹی دروازے کے میرے دوست شیرو نے کی تھیں، جس کے ہمراہ میں اب بھی کئی کئی گھنٹے سڑکوں اور گلیوں میں پیدل چل پھر کر ہر معاملے پر بات چیت کرتا رہتا ہوں۔

حفظ مراتب، لوگوں، جگہوں، اشیاء اور چہروں کو دی گئی آج ہم ہر اچھی کہانی کی طرح ابتداء سے شروع کرتے ہیں۔ "لوگ" "جگہوں" سے متعلق ہوتے ہیں وہ جو "چیزیں" وقت کے ساتھ ساتھ کرتے رہتے ہیں، اسے ہم تاریخ کہتے ہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں، اس کا چہرہ بشرہ ہوتا ہے اور ہم اس چہرے کا معائنہ کرتے ہیں اور ہمارے شعور میں ایک یاد کندہ ہو جاتی ہے اور وہ لاشعور میں جگہ بنا لیتی ہے۔ اکٹھے رہنے سے ہم اپنی زندگیوں کے طور طریقے وضع کرتے ہیں لاہور اور اس کے لوگ بے نظیر ہیں کیونکہ دوسرے شہروں اور لوگوں کی طرح تاریخ نے ان کی بھی کندہ کاری کی ہے۔

ایک شخص جس کے بارے میں بڑی چاہت سے لکھنا چاہوں گا اور جس کے بارے میں مجھے زیادہ علم بھی نہیں ہے، اسے بلاقی شاہ کہا جاتا تھا اور جو پانی والے تالاب کا ایک ہندو ساہوکار تھا۔ تمام لاہوریوں میں سے ہمارے بزرگوں کے، جو اب بھی اندرون شہر رہتے ہیں ذہنوں میں اس شخص کی یاد سب سے زیادہ تازہ ہے۔ بلاقی شاہ تھا کون؟ مجھے یاد ہے میرے والد نے مجھے بلاقی شاہ کے پوتے جسے وہ "لاٹو شاہ" یا رام پرکاش کہتے تھے کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ان کا ہم جماعت تھا اور وہ دونوں کالج کی کرکٹ ٹیم میں کھیلا کرتے تھے۔ اب لاٹو اور مرحوم ممتاز صحافی مظہر علی خان صرف دو ایسے طالب علم تھے جو اپنی کاروں میں کالج آتے تھے۔ لاٹو صرف ریشمی لباس اور مظہر علی خان کھدر کا لباس پہنا کرتے تھے۔ ان کا یہ مارکہ ان کی وفات تک رہا۔ چنانچہ بلاقی شاہ یقیناً بہت امیر شخص تھا اور پنجاب کی تقسیم کے وقت اسے لاہور کا امیر ترین شخص کہا جاتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پنجاب کے تقریباً ہر امیر زمیندار نے اس سے ادھار لے رکھا تھا۔ ایک روئیداد کے مطابق وزیراعظم پنجاب سر سکندر حیات ٹوانہ نے بھی بلاقی شاہ سے اچھی خاصی رقم بطور قرض لے رکھی تھی۔ چنانچہ تقسیم امیروں کے لئے پریشانیوں سے نجات کی علامت تھی کیونکہ ان کو قرضے ادا نہیں کرنے پڑے اور بعد ازاں کھیموں کی لوٹ مار میں عزید امیر ہو گئے۔

بلاقی شاہ ایک علامتی لاہوری کردار تھا۔ ایک خاصے معتبر عمر رسیدہ شخص نے مجھے بتایا کہ جب بلاقی شاہ کو علم ہوا کہ اس کا پوتا ہیرا منڈی کی ناچنے والیوں کے ہاں کثرت سے جانے لگا ہے تو وہ ایک رات خود ایک "مجرے" میں بیٹھ کے سامنے جا بیٹھا۔ اگر اس کا بیٹا پانچ روپے کا نوٹ (جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی) لہراتا تو بلاقی شاہ دس روپے کا نوٹ نچھاور

کر دیتا۔ اس رات ناچنے والیاں خوشی سے پاگل ہو گئیں کیونکہ دولت کی بارش ہو رہی تھی' اس لئے کہ باپ اور بیٹا مقابلے پر تھے اور دونوں ایک دوسرے کے نہلے پہ دہلے پھینک رہے تھے۔ دونوں خالی ہاتھ گھر لوٹے لیکن بیٹے کو سبق مل گیا کہ وہ دولت ضائع کرتا رہا تھا کیونکہ ناچنے والیوں کو اس سے نہیں' اس کی دولت سے پیار تھا۔ ایک مہینے بعد ناچنے والیوں کا ایک وفد بلاقی شاہ کے پاس آیا اور اسے اس کی لٹائی ہوئی رقم واپس کی اور درخواست کی کہ وہ اپنے بیٹے کو ان کے ہاں آنے کی اجازت دے دے بلاقی شاہ نے رقم لے لی اور ان سے کہا کہ وہ وہاں سے چنت ہو جائیں۔

بلاقی شاہ کے اور بھی قصے ہیں جو ایک دوسرے سے بڑھ کر دلچسپ ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ہمارے قارئین بلاقی شاہ کے بارے میں بہت سے قصے سنانے کے قابل ہوں گے کیونکہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے پھر دیگر قدآور شخصیات ہیں جیسے سر گنگا رام جس کی ہمارے شہر کے لئے بے مثل خدمات ہیں۔ ہم نے جو اس کو بھرپور عزت نہیں دی یا سرے سے دی ہی نہیں تو یہ ہماری ذہنی غربت کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہی ہے۔ ہم سلطان ٹھیکیدار کے بارے میں لکھ چکے ہیں اور کنہیا لال کے بارے میں جو اعلیٰ ترین درجے کا انجینئر اور وقائع نگار تھا اگرچہ اس کے بارے میں مزید جانکاری کی ضرورت ہے۔ پھر دیال سنگھ' رتن چند' میلہ رام اور سر شاہ دین جیسے لوگ بھی ہیں جو سب عظیم لاہوری ہیں اور ان سب کے بارے میں غفلت برتی گئی ہے۔ ہمیں ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی ضرورت ہے اور ہمیں انہیں شہر کے سپوت ہونے پر اعزاز سے نوازنا چاہئے۔ ہمیں لالہ لاجپت رائے اور بھگت سنگھ جیسے شہیدوں کو بھی نہیں بھولنا چاہئے جنہوں نے صرف ہندوستان کے لئے نہیں بلکہ پورے برصغیر کی آزادی کی خاطر اپنی جانیں دے دی تھیں ہمیں انہیں صرف اس لئے نہیں بھلا دینا چاہئے کہ وہ غیر مسلم ہیں۔

لیکن پھر امیروں اور طاقتوروں کی بہ نسبت کم درجے کے ''انسان'' بھی تھے جو آج بھی لوگوں کی اجتماعی یادداشت میں زندہ جاوید ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں بچپن میں الماریاں بنانے والے اور بعدازاں لٹو بنانے والے سراج دین سے ''گھومنے والا لٹو'' خریدا کرتا تھا۔ وہ اپنے بڑے بڑے ہاتھوں پر بڑی بڑی انگلیوں سے چٹکی بجا کر تیزی سے لٹو گھما لیتا تھا۔ اس کا تقریباً پچیس برس قبل انتقال ہو گیا تھا لیکن وہ لارنس روڈ پر 1929ء سے لٹو بنا رہا تھا۔ کھانے پینے کے محاذ پر کئی نام نمایاں ہیں جن میں چونا منڈی کا ''خلیفہ کبابیہ'' بھی تھا۔ اس کا پوتا اب بھی وہاں دکان کرتا ہے لیکن سواد جاتا رہا ہے اگر نام کو زندہ رکھنا ہے تو معیار کو مستقل بڑھاتے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

پھر گوالمنڈی کا سردار مچھلی فروش تھا۔ اس کے بیٹے کاروبار چلا رہے ہیں اور فارمی مچھلی کو راوی کا رہو کہہ کر بیچ رہے ہیں۔ راوی تو اب رستا ہے اور اس قدر کثافت آلود ہو گیا ہے کہ رہو جیسی حساس مچھلی تو ایک طرف رہی اگر انسان جیسی ڈھیٹ ذی حیات بھی ہو تو اس کثافت میں مر جائے گی۔ اندرون شہر میں صرف ایک شخص رہ گیا ہے جو اب بھی دال کلچے بناتا ہے۔ وہ اب بھی گلیوں میں گھومتا پھرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی مشعل لے کر آگے چلنے والا کوئی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ لاہور میں مشہور دال کلچہ جلد ختم ہو جائے ہم لاہور کے دو فضل حضرات کو نہیں بھول سکتے۔ لال کھوہ کی برفی بنانے والا اور ٹبی چوک کا سری پائے والا فضل دونوں نام لاہور اور لاہور سے باہر پھیل چکے ہیں اور اللہ کرے دونوں خوشحال رہیں ان کے متعلق مزید جاننے کی ضرورت ہے۔

مشہور اکھاڑے اور گاماں کی روایت

مشہور تاریخی دنگلوں میں سے جو اب تک لاہور میں منعقد ہوئے ہیں ایک شاہی دنگل تھا جس کی صدارت مہاراجہ رنجیت سنگھ کر رہا تھا' گوجرانوالہ کا اٹھارہ سالہ پہلوان اُترا جس نے کشتیوں میں یکے بعد دیگرے پنجاب

کے بڑے بڑے نامی گرامی پہلوانوں کو پچھاڑ دیا۔ اسے نلوا کا خطاب دیا گیا اور بعدازاں وہ لاہور دربار کی پنجابی فوج کا بہترین جرنیل ہوا۔

کئی برس بعد ایک اور شاہی دنگل نے پورے برصغیر کے لوگوں کے تخیل کو اسیر کرلیا تھا۔ یہ لاہور کے رستم ہند گاماں پہلوان اور ورلڈ چیمپئن پولینڈ کے زبسکی پہلوان کے مابین دنگل تھا۔ یہ مقبول عام روایت آج بھی قدیم اندرون شہر لاہور کی پیچیدہ گلیوں میں زیر بحث رہتی ہے جب احمد بخش گاماں ریٹائر ہوا تو وہ دنیا بھر کے تقریباً ہر قسم کے چیمپئن کو شکست دے چکا تھا اور اس کے کارہائے نمایاں سے برصغیر کی دیسی کشتی کا شمار بین الاقوامی کھیلوں میں کیا جانے لگا تھا اور اس کے اپنے قول کے مطابق ”معزز طاقتور اور پھرتیلے لوگوں“ کے صاف ستھرے کسرتی کھیل کی حیثیت سے غیر معمولی معتبر بن گیا۔ 1910ء میں ”رستم ہند“ کے خطاب کے لئے ایک دنگل کا انعقاد کیا گیا۔ گاماں پہلوان نے سب پہلوانوں کو پچھاڑ کر وہ خطاب جیت لیا تھا۔ گاماں کی آخری کشتی یورپی چیمپئن جے سی پیٹرسن کے ساتھ ہوئی جسے اس نے صرف پینتالیس سیکنڈ میں چت کردیا تھا۔ اس کا 22 مئی 1960ء کو لاہور میں انتقال ہوا تھا۔

کئی ہزار سال سے پہلوانی ایک شاہی کسرتی کھیل رہا ہے اور صدیوں تک بہترین پہلوان بہترین جرنیل بنتے آئے ہیں خواہ قدیم یونان ہو سلطنت روما ہو، کلوپیٹرا کا مصر ہو یا ایران یا ہندوستان پاکستان کا برصغیر، پہلوانی ہمیشہ قومی زندگی کا جزو رہی ہے۔ آج بھی سالانہ کل پنجاب دنگل جو قلعہ لاہور کے نزدیک کشتیوں کے سٹیڈیم میں منعقد ہوتا ہے جس میں پنجاب کے دور دور کے دیہاتوں سے جوان کھنچے چلے آتے ہیں انسانی طاقت کی کشش ایسی ہی ہوتی ہے ہم سب جانتے ہیں کہ پرانے وقتوں میں اکثر جنگوں کا فیصلہ دشمنوں کے مابین صرف ایک کشتی کے مقابلے سے ہی ہوجاتا تھا۔ لاہور شہر میں پہلوانی کی ایک خاص روایت رہی ہے اور چونکہ اب یہ روایت کمزور پڑتی جارہی ہے تو اب وقت ہے کہ ہم سمجھیں کہ یہ کیا تھی تاکہ اس کا اعادہ کیا جاسکے۔

تمام پہلوان ایک مخصوص ”اکھاڑے“ سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس ڈھیلی مٹی کے ہموار قطعہ زمین کے لئے انگریزی زبان میں پٹ (گڑھا) ہی قریب ترین لفظ ہے۔ مقامی لوک گیتوں میں ان جگہوں کو اساطیری حیثیت حاصل ہے۔ لاہور میں بنیادی طور پر پہلوانوں کے تین گروہ ہیں جو ”کلو والا“ نور والا اور کوٹ والا ہیں۔ ہر اکھاڑہ اپنے اپنے پہلوانوں کی تربیت کرتا ہے اور پھر مختلف اکھاڑوں کے مابین مقابلے ہوتے ہیں اس صدی سے پہلے لاہور میں ایسے سینکڑوں اکھاڑے تھے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بتدریج کم ہوتے چلے گئے۔

ادبی رسالے نقوش لاہور نمبر جو 1962ء میں شائع ہوا تھا اور جس کا اب نوادرات میں شمار ہوتا ہے اور اسے دوبارہ تحریر کرانے کی سخت ضرورت ہے مطابق لاہور کے بڑے بڑے اکھاڑوں میں موہنی روڈ پر ”اکھاڑہ خلیفہ بوٹا“ اکھاڑہ گاماں اور امام بخش اندرون شہر لاہور میں ”اکھاڑہ تکیہ تاج شاہ“ اکھاڑہ چانن قصائی، اکھاڑہ ننھے شاہ تھے۔ اکھاڑہ نزد پل مصری شاہ اور ایک مشہور ”اکھاڑہ ویام شالہ“ تھا جسے بھولو پہلوان، اسلم گوگا اور اعظم پہلوان استعمال کرتے تھے۔ اکھاڑہ چوک برف خانہ بھی بڑے غضب کی شہرت کا حامل تھا۔ دیگر مشہور اکھاڑوں میں اکھاڑہ خلیفہ بخشی، اکھاڑہ حانی پہلوان اور اکھاڑہ گاڈو شاہ تھا جو رستم زمان کی ملکیت تھا۔ اندرون شہر سے ذرا باہر سرکلر باغ میں دو مشہور اکھاڑے تھے دونوں کا نام اکھاڑہ بالمکیاں تھا ان میں سے ایک بھاٹی دروازے کے باہر اور ٹکسالی دروازے کے باہر واقع تھے۔

پچھلے چھیاسٹھ برس میں جنہیں میرے والد ”کلیم کی ذہنیت والے سال“ کہتے تھے جو قبضہ عہد میں متشکل

ہو گئے تھے اور موجودہ دور جو ''فوجی پلاٹوں'' کا دور کہلاتا ہے نے ان تمام اکھاڑوں پر قبضہ کر کے انہیں پلاٹ برائے فروخت میں تبدیل کر دیا تھا لیکن دیسی کشتی کو برقرار رکھنے کے لئے جگہ کی ضرورت تو ہے اور ہم قدیم خاندانی اکھاڑوں کے تجارتی ناموں پر ''کشتی کلب'' معرض وجود میں آتے دیکھ رہے ہیں۔

ان نئے کشتی کلبوں کی چند مثالیں یہ ہیں شادباغ نمبر 2 کا اکھاڑہ حاجی صدیق پہلوان اب ''میراں کشتی کلب'' کہلاتا ہے اور کوٹ خواجہ سعید کا اکھاڑہ کالا جٹ پہلوان اب ''کالا جٹ کشتی کلب'' کہلاتا ہے۔ اکھاڑہ صادق پہلوان میوہ منڈی والا اب ''صدیق کشتی کلب'' صادق آباد لاہور کہلاتا ہے۔ ایک اور بہت ہی قدیم اور مشہور اکھاڑہ بجن پہلوان جو شاہ میراں میں ہے اب ''بجن کشتی کلب'' کہلاتا ہے۔ اب ایک اور دلچسپ نام کا اکھاڑہ بلا چنگڑ پہلوان اب ''بلا کشتی کلب'' شاہدرہ کہلاتا ہے۔ لگتا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ''نئی عزت داری'' کے لئے دوڑ لگی ہوئی ہے جو پہلوانوں کی بیش قیمت اساس سے تہی ہے۔ یہ نام ہوسکتا ہے آج دل آزار لگتے ہوں لیکن یہ اپنے ہمراہ ایک چھوٹے سے نام میں ایک پہلوان کی اصل اور کارناموں کی تاریخ سموئے ہوئے ہوتے ہیں مثال کے طور پر اکھاڑہ پو پہلوان چڑھتا سورج کا نام اب صرف پو کشتی کلب ہے۔ ایک وقت تھا جب پو نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ گاماں اور بھولو برادران سے مقابلہ کر سکتا ہے اور ایک کشتی میں پو نے اسلم کو چت شکست دے بھی دی تھی لیکن دوسری میں وہ ہار گیا تھا۔ دونوں موقعوں پر قدیم شہر میں بڑے پیمانے پر خوشیاں منائی گئی تھیں اور مٹھائیاں تقسیم کی گئی تھیں چند ایک بے ربط لڑائیاں دونوں پہلوانوں کے حمایتوں میں ہوئیں اور پھر بعد میں جو بہیمانہ واقعات پیش آئے ان کا ذکر نہ ہی کریں تو بہتر ہے لیکن فخریہ بات تھی لاہور میں پہلوان ہونا!

سکول میں پڑھنے والے لڑکے کی حیثیت سے مجھے اچھا پہلوان سے جو ہمارا ہمسایہ تھا ملاقات یاد ہے۔ ایک بار میں سکول سے دیر سے لوٹا تو میری والدہ کے ان سے پوچھنے پر کہ آیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ ''نہیں، لیکن میں دیکھتا ہوں'' ان کا جواب تھا۔ افوہ! ایک ہلکا سا ہاتھ جو میرے سر پر پڑا آج بھی ان کی یاد دلاتا ہے لیکن یہ خیال رہے کہ پہلے زمانے کے پہلوان غنڈے نہیں ہوتے تھے۔ وہ محلے کے محافظ ہوتے تھے اور ان کے علاقے میں کوئی جرم سرزد کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ وہ بے پایاں پیار کرنے والے شخص تھے جو اپنی دودھ کی دکان کے باہر بیٹھے رہتے اور درجنوں کے حساب سے دودھ کے گلاس پی جاتے۔ لوگ انہیں محو حیرت سے دیکھتے افواہیں وہ خود ہی پھیلاتے تھے کہ ایک چیمپئن پہلوان ایک وقت کے کھانے میں کم از کم ایک سالم بکرے کا گوشت کھا جاتا ہے۔ مجھے کرکٹ کے سابقہ کھلاڑیوں نے بتایا کہ جوانی میں ٹیسٹ کرکٹر عمران خان آدھا بکرا گوشت کھا سکتا تھا۔ میں نے ایک بار اندرون شہر میں کالا پہلوان کے اکھاڑے میں اس سے یہ ذکر کیا تو اس نے فوراً جواب دیا ''عین ممکن ہے دیکھتے نہیں گوریاں کیوں اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔'' اس پر اس نے اپنے کان پکڑ لئے جیسے گستاخانہ بات کہنے پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ رہا ہو۔

لاہور کا روایتی پہلوان ایک عظیم کھلاڑی تھا۔ قدرتی طور پر دوسروں کو معاف کر دینے والا اور کمزوروں کا محافظ اور وہ اس کام میں بڑا فخر محسوس کرتا۔ اس کے لئے اس کی صحت ہی سب کچھ تھا اور وہ نظر بد سے بچنے کے لئے صدقہ دیتے تھے اور اب چونکہ شہر اپنے مرکز سے میلوں دور تک پھیل چکا ہے اس لئے دیسی پہلوان کی قدیم روایت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا فن زوال پذیر ہے۔ اگرچہ انگلستان میں پنجابیوں نے اس فن کی بحالی کا خاصی حد تک بندوبست کر رکھا ہے لیکن ہوسکتا ہے دائرے کا چکر پورا ہو چکا ہو اور ہم ایک بار پھر اپنے شہر میں ایک اور یورپی زبسکی اور لاہور سے ایک اور گاماں پہلوان کے مابین ایک اور کشتی کا مقابلہ دیکھ پائیں یہ یقیناً گزشتہ مقابلوں سے زیادہ مجمع گیر ہوگا۔

سکوں (Coins) کے بارے میں دلچسپ معلومات

● محمد وارث

☆ دنیا میں سب سے پہلے درہم اور دینار حضرت آدم علیہ السلام نے بنائے۔

☆ حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ دوئم نے سب سے پہلے سکہ سازی کا کام کروایا۔ دینار اور درہم جاری کئے جن میں بعض سکوں پر الحمداللہ اور بعض پر محمد رسول اللہ کے کلمات کندہ کروائے۔

☆ زیادہ تر مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کا پہلا سکہ 600 قبل مسیح میں جاری ہوا۔ اور یہ اور لڈیا میں جاری کئے گئے۔ جواب ترقی کا حصہ ہے اور ان سکوں پر شیر کا نشان کندہ ہے اور کہا جاتا ہے کہ انہیں شہنشاہ ایلس نے جاری کیا تھا۔

☆ مشرق میں چین (CHINA) نے سکے بنائے۔

☆ جہاں سکے ڈھالے جاتے ہیں اس کو (MINT) منٹ، ٹکسال روداار القرب کہا جاتا ہے۔ ماضی میں نمک

(SALT) چاندی (SILVER)، کوڑیاں اور مویشی بھی زر کے طور پر بھی استعمال ہوتے رہے۔

☆ پاکستان نے 1948ء میں سات عدد سکے جاری کیے۔

☆ پاکستان نے 1961ء میں اعشاری نظام کے سکے جاری کیے۔

☆ پاکستان کے موجودہ دور کے سکے ایک روپیہ' دو روپیہ' پانچ روپیہ جو کہ نکل اور سلور کے ہیں۔ پاکستان میں جارج پنجم کے سکے 1947ء میں بھی رائج تھے۔ جن کی مالیت ایک روپیہ' آٹھ آنہ' چار آنہ' دو آنہ' ایک آنہ' آدھا آنہ' ایک پیسہ تھا۔ اس کے علاوہ دس روپے' پچاس روپے' ایک سو روپے' پانچ سو روپے کے (سونے کا سکہ) سکے بھی تھے۔

☆ ایک ہزار روپیہ کے سکے بھی خاص طور پر یادگار کے طور پر شائع کئے گئے۔

☆ کراچی' لاہور اور راولپنڈی میں سکوں کی مخصوص مقرر کردہ تاریخوں میں نمائش بھی ہوتی ہے۔ لاہور میں ہر ماہ کے پہلے اتوار اور راولپنڈی میں ہر ماہ کے دوسرے اتوار نمائش ہوتی ہے۔ شائقین ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

ممالک اور ان کے سکے (کرنسی)

ملک	سکہ	ملک	سکہ	ملک	سکہ
افغانستان	افغانی	ترکی	لیرا	فرانس	فرانک
ایران	ریال	تنزانیہ	تنزانی شلنگ	کینیا	کے شیلنگ
آسٹریا	شلنگ	تھائی لینڈ	بھات	لبنان	پونڈ
اٹلی	لیرا	جاپان	ین	مصر	پونڈ
الجزائر	دینار	جرمنی	مارک	متحدہ عرب امارات	درہم
ارجنٹائن	پیسو	چین	یوآن	فلپائن	پیسو
انڈونیشیا	روپیہ	چیکوسلواکیہ	کرونا	ملائیشیا	رنگٹ
آسٹریلیا	ڈالر	ڈنمارک	کرون	ناروے	کراؤن
آذربائیجان	منات	روس	روبل	نائیجیریا	نیرا
بھارت	روپیہ	رومانیہ	لیو	ہالینڈ	فلورن
بنگلہ دیش	ٹکا	اسپین	لپیا	ہانگ کانگ	ڈالر
برما	کیات	سعودی عرب	سعودی ریال	یوگوسلاویہ	دینار
برازیل	کروزیرو	سوڈان	پونڈ	یوگنڈا	شیلنگ
بلجیم	فرانک	سویڈن	کرونا	یونان	ڈرچما
بلغاریہ	لیو	سوئٹزرلینڈ	سوئس فرانک	یو ایس اے	ڈالر
برطانیہ	پاؤنڈ	سری لنکا	روپیہ	پرتگالی	انسیکڈو
سنگاپور	ڈالر	پولینڈ	زلوٹی	عراق	دینار
پاکستان	روپیہ	-	-	-	-

ماں جی

بھیا ہر خط میں لکھتے کہ میں ان کے پاس امریکہ آجاؤں وہاں بہت مواقع ہیں۔ مجھے اچھی تنخواہ ملے گی مگر میں انہیں ٹال دیتا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ میں ماں جی کو چھوڑ کر جاؤں۔ جب بھی بھیا کا خط آتا تو میں دیکھتا کہ ماں جی کا چہرہ زرد پڑ جاتا انہیں ڈر تھا کہ کہیں میں بھی اپنے اچھے مستقبل کے لئے انہیں نہ چھوڑ جاؤں۔

ضرغام محمود

ماں بیٹے کی کہانی، جو ایک دوسرے کے لیے جینے کا سہارا تھے

ماں...... یہ تین حرفی لفظ محبت سے گوندھا گیا ہے۔ محبت، ایثار، خدمت، قربانی یہ صفات ماں کے وجود میں یکجا کردی گئی ہیں۔ اولاد سے بے غرض محبت، اولاد کی بے لوث خدمت، اولاد کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے والی عظیم ہستی صرف اور صرف ماں کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ماں کے قدموں تلے جنت رکھ کر ماں کے رشتے کو عظمت بخشی۔ اور اس رشتے کو تمام رشتوں کا سردار بنا دیا۔ دنیا میں تمام ہی رشتے محترم ہوتے ہیں مگر ماں کے رشتے کی بات ہی نرالی ہے۔ روئے زمین پر ماں ایک ایسا رشتہ ہے جو اولاد سے بے غرض محبت کرتی ہے۔ ماں ان پڑھ بھی ہو تو بھی وہ بچے کا چہرہ دیکھ کر اس کے دل میں چھپی خوشی یا غم کو بھانپ لیتی ہے۔ ماں دکھوں کی تیز دھوپ میں ایک گھنا سایہ ہے۔ ماں عظمت کا مینار ہے۔ ماں کا رشتہ ایک ایسا

روشن چراغ ہے جس سے ہر انسانی رشتہ روشنی حاصل کرتا ہے۔

میں ٹیکسی میں بیٹھا تھا ٹیکسی ڈرائیور نے شاید ایف ایم کا کوئی چینل لگا رکھا تھا جہاں ماں کی عظمت کے متعلق تقریری مقابلہ ہو رہا تھا۔ ہر مقرر ماں کی عظمت و بڑائی بیان کر رہا تھا لیکن ماں کی عظمت اور بڑائی بیان کرنے کے لئے ہر مقرر کے پاس الفاظ کم پڑ رہے تھے۔ مقررین کی تقریریں سن کر مجھے ماں جی کی یاد آ گئی میری ماں جو میرے لئے روشنی کا ایسا مینارہ ہے جس کی کرنیں مجھے ہر وقت روشن رکھتی ہیں۔ میں خیالوں میں ماں جی کا پیکر دیکھنے لگا۔

ماں جی کی پیدائش کب ہوئی، یہ ماں جی کو معلوم نہیں تھا انہیں اتنا یاد تھا کہ جب ہندوستان تقسیم ہوا تو ان کا پہلا دانت ٹوٹا تھا۔ ماں جی اس وقت اپنے والدین اور بھائیوں کے ساتھ دہلی میں رہائش پذیر تھیں۔ ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی انسان وحشی بن گیا۔ ماں جی بتاتی ہیں کہ ان کے محلے دار جن کے ساتھ ان کا روز کا اُٹھنا بیٹھنا تھا پیار و محبت تھی وہ ہندوستان کی تقسیم کے اعلان کے ساتھ ہی ان سب کی جان کے دشمن بن گئے۔ نانا جان سارا مال و اسباب اسی طرح چھوڑ کر اپنے کنبے کو لیکر دہلی سے بھاگے۔ کئی دن دہلی کے ریلوے سٹیشن پر بے سروسامانی میں قیام کیا۔ پھر ایک ٹرین کے ذریعے وہ سب لاہور آ گئے۔ ماں جی بتاتی ہیں کہ کس طرح ٹرین پر حملے ہوتے رہے جب ٹرین لاہور پہنچی تو اس کے آدھے مسافر خون میں نہائے ہوئے تھے۔ ماں جی بتاتی ہیں کہ دہلی سٹیشن پر پہنچنے والی شرنارتھیوں کی ٹرین بھی خون میں نہائی ہوئی تھی۔ لاہور پہنچ کر نانا جان نے جیسے تیسے ایک جھونپڑی کا بندوبست کیا اور رزق حلال کمانے کے لئے نکل پڑے۔

سولہ سال کی عمر میں ہی ماں جی کی شادی ابا جان سے ہو گئی۔ ماں جی ایک اچھے پڑھے لکھے وضع دار خاندان سے تعلق رکھتی تھیں مگر بدنصیبی کہ جہاں بیاہ کر گئیں وہاں جہل کا اندھیرا تھا۔ روایتی رشتوں کی چپقلش تھی اور دولت کی ہوس تھی۔ سسرال سے نباہ ماں جی کا کڑا امتحان تھا۔

ساس اور نندیں اپنی تلوار جیسی زبان لئے ہر وقت لڑنے کے لئے تیار رہتیں۔ ایسے گھر میں ماں جی کا دم گھٹنے لگا مگر انہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا شادی کے پہلے ہی سال ماں جی کے مُردہ بیٹا پیدا ہوا۔ ماں جی نے رو رو کر بُرا حال کر لیا مگر وہ رب کی رضا میں راضی رہیں۔

دوسرے سال بھی یہی ہوا ایک مُردہ بچہ پیدا ہوا تو ساس نندوں کی باتوں نے ماں جی کا کلیجہ چھلنی کر دیا ایسے وقت میں بھی ماں جی نے اللہ کی مرضی کہہ کر اپنے دل کو تسلی دی لیکن ان کا دل اندر سے زخمی تھا لہٰذا ماں جی اللہ کے حضور مصلے پر ایسی بیٹھیں کہ اولاد کا مژدہ لیکر اُٹھیں۔ تیسرے سال بجو پیدا ہوئی۔ ہنستی مسکراتی بجو کو دیکھ کر ماں جی کے ہاتھ اللہ کی حمد و ثناء کے لئے اُٹھ گئے مگر سسرالی رشتوں کو کہاں چین آتا ہے۔ ”ہمارے گھر تو ہمیشہ پہلوٹھی کا بیٹا پیدا ہوتا ہے۔“

ایسے جملے کہے جاتے جیسے بیٹی یا بیٹا پیدا کرنا انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ پھر دو سال بعد جب بھیا نے جنم لیا تو ماں جی کے قدم سسرال میں جمنے لگے اور بھیا کے تین سال بعد میں پیدا ہوا تو ماں کے قدم پوری طرح سسرال میں جم گئے۔ نندیں بھی ایک ایک کر کے بیاہی جا چکی تھیں لہٰذا ماں جی کو سکون ملا مگر ابھی اللہ کو ماں جی کا امتحان مقصود تھا۔

ایک دن جب کوئی خاندانی مسئلہ درپیش تھا اور پنچایت لگی ہوئی تھی کہ اچانک بات بگڑ گئی اور لاٹھی ڈنڈے چلنے لگے نہ جانے کس کی لاٹھی ابا جان کے سر پر لگی اور ابا جان تیورا کھا کر گر پڑے۔ اس سے پہلے کے ابا جان کو طبی امداد دی جاتی ابا جان نے سب لوگوں کے سامنے دم توڑ دیا۔ ماں جی پر سکتہ طاری ہو گیا، ساس نندیں بین کرنے لگی۔ جانے والا تو چلا گیا مگر اب ساس نندوں کو خدشہ ہوا کہ ابا جان کے حصے کی جائیداد ماں جی

نہ مانگ بیٹھیں۔ لہٰذا انہوں نے ماں جی کو اتنا تنگ کیا کہ وہ عدت بھی مرحوم شوہر کے گھر نہ گزار سکیں۔ نانا جان ماں جی کو اپنے گھر لے گئے۔ مگر اب نانا جان کے گھر میں ماموں ممانیوں کا راج تھا۔ نانا جان ایک عضو معطل کی طرح تھے۔ ممانیوں کے طعنوں نے ماں جی کا کلیجہ چھلنی کردیا تو نانا جان نے دو کمروں کا چھوٹا سا مکان ماں جی کے نام کر کے ان کو وہاں منتقل کردیا اس طرح ماں جی کو چھت میسر آئی۔ چھت تو مل گئی مگر زندگی کی ضرورتیں کون پوری کرے گا۔ تین چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ تھا لہٰذا ماں جی نے کمر کس لی۔ محلے کے بچوں کو قرآن پڑھانا محلے کی عورتوں کے کپڑے سینا، اس طرح ماں جی نے ہماری ضروریات پوری کیں۔ اتنے سارے دکھوں کے باوجود کبھی ماں جی نے اللہ سے شکوہ نہیں کیا جتنی مشکلات ماں جی پر پڑتیں اتنے ان کے سجدے لمبے ہوتے جاتے۔

ماں جی کو ہم تینوں سے بہت محبت تھی مگر تعلیم کے معاملے میں ماں جی کوئی رعایت کرنے کو تیار نہ تھیں۔ ماں جی نے ہم تینوں کی تعلیم پر اتنی توجہ دی کہ ہم تینوں ہر کلاس میں اول آنے لگے۔ انٹر کے بعد ماں جی نے بجو کی شادی کردی۔ بجو نے بہت واویلا مچایا کہ انہیں آگے پڑھنا ہے مگر ماں جی نے ان کی کوئی بات نہ سنی اور عزت کے ساتھ انہیں رخصت کردیا۔ بھیا نے میٹرک کے امتحان میں ضلع بھر میں اول پوزیشن حاصل کی اور وظیفے کے حقدار ٹھہرے۔ مجھے یاد ہے جب بھیا کا رزلٹ آیا اور اخبار میں ان کی تصویر شائع ہوئی تو سارا خاندان مبارک سلامت کا شور مچاتا چلا آیا۔ وہ لوگ جو ہمیں دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے اب ہمیں گلے لگا لگا کر مبارکباد دے رہے تھے۔ بھیا جب انجینئرنگ کے آخری سال میں تھے تو میں نے بھی میٹرک میں ضلع بھر میں اول پوزیشن حاصل کی۔ بھیا نے انجینئرنگ مکمل کی تو انہیں سرکاری وظیفہ ملا کہ وہ اپنی مزید تعلیم امریکہ میں حاصل کریں۔ سارا خاندان ماں جی کو خوش نصیب سمجھ رہا تھا کہ ان کے بیٹے نے اتنا بڑا سرکاری وظیفہ حاصل کیا وہ لوگ جو ہم سے بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے آج ہماری خوش نصیبی پر ناز کررہے تھے۔ مٹھائیوں کے ڈبے پر ڈبے چلے آرہے تھے مگر ماں جی کی حالت عجیب تھی وہ بھیا کو اپنی بانہوں میں لئے روتی جارہی تھیں۔

''یہ دونوں میرے بڑھاپے کی لاٹھی ہیں میں انہیں نہیں جانے دونگی۔''

سب حیران تھے کہ گھر آئی خوش نصیبی کو ماں جی کس طرح لات مار رہی ہیں۔ سب کو ان کی عقل و دانش پر شک ہورہا تھا۔ بجو ماں جی کو سمجھا رہی تھی کہ بھیا کے روشن مستقبل کے لئے ان کا امریکہ جانا بہت ضروری ہے مگر ماں جی راضی نہیں ہورہی تھیں۔ بھیا مظلوم بنے ماں جی کو بانہوں میں لئے بیٹھے تھے۔ ماں جی نے روتے روتے بھیا کی آنکھوں میں جھانکا اور انہیں ایک زور کا جھٹکا لگا اور انہوں نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور کہنے لگیں۔

'میں تو بس ایسے ہی رو رہی تھی یہ تو خوشی کے آنسو ہیں میرا بیٹا جائے گا اور ضرور جائے گا......''

بھیا چلے گئے ماں جی انہیں چھوڑنے ایئرپورٹ نہیں گئیں کہنے لگیں ''مجھ سے نہیں دیکھا جائے گا۔''

مگر ماں جی نے مجھے زبردستی ایئرپورٹ بھیجا کہ بھائی کو رخصت کرکے آؤ۔ بھیا کے جانے کے بعد ماں جی اُداس رہنے لگیں۔ میں ہر ممکن ان کی دل جوئی کرتا مگر وہ بھیا کی یاد میں آنسو بہاتی رہتیں۔

''ماں جی اگر مجھے حکومت نے وظیفہ دیا تو بھی میں باہر ملک نہیں جاؤں گا......'' میں ماں جی کو دلاسے دیتا اور وہ اپنے بوڑھے ہاتھوں میں میرا چہرہ لیکر چوم لیتیں۔

وقت گزرتا گیا بھیا نے تعلیم مکمل کرکے وہیں پر ملازمت کرلی جب دو سال بعد بھیا واپس آئے تو ان کی جیب میں ڈالر تھے۔ وہ خاندان کے تمام افراد

کے لئے تحفے لیکر آئے تھے۔ بجو بہت خوش تھی کیونکہ ان کے لئے سب سے زیادہ تحائف آئے تھے۔ میرے لیے بھی بھیا بہت کچھ لائے تھے مگر تحفوں سے زیادہ مجھے ان کے آنے کی خوشی تھی کیونکہ ان کے آنے سے ماں جی بہت خوش تھیں اور ماں جی خوش مطلب میں خوش۔ ماں جی بھیا کو بار بار لپٹا لپٹا کر پیار کرتیں، انہیں چومتیں اور ان کا سر اپنے زانوں پر رکھ کر ان کے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتیں۔ وہ بہت خوش تھیں مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی جب بھیا نے بتایا کہ وہ واپس امریکہ چلے جائیں گے کیونکہ وہاں انہیں بہترین تنخواہ ملتی ہے جو اس ملک میں ممکن نہیں۔ بجو نے بھی بھیا کی بھرپور حمایت کی۔ بھیا کی بات سُن کر ماں جی پر سکتہ طاری ہوگیا جب بھیا نے ماں جی کے زانوں پر اپنا سر رکھ کر ان سے اجازت چاہی تو بڑی مشکل سے ماں جی کا ہاتھ اُٹھا اور انہوں نے ویران آنکھوں اور لرزتے لبوں کے ساتھ بھیا کو جانے کی اجازت دیدی۔

”ماں جی.....بس چند سالوں کی بات ہے میں وہاں سے آپ کو اتنا کما کر بھیجوں گا کہ آپ کے سارے دُکھ دُور ہوجائیں گے..... اور آپ اس دو کمروں والے چھوٹے سے مکان سے بڑے مکان میں شفٹ ہوجائیے گا.....“ بھیا لاڈ سے بولتے مگر ماں جی کی آنکھیں ویران تھیں۔ بھیا ان کی آنکھوں کی بات نہیں سمجھتے تھے۔ مگر میں ان کی آنکھوں کی زبان سمجھتا تھا۔ روپیہ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے انسان کی اصل کمائی تو اس کی اولاد ہے اور اگر اولاد ہی نظر سے دُور ہو تو انسان روپے پیسے کا کیا کرے گا۔ چند دن بعد بھیا واپس امریکہ چلے گئے سب نے ان سے خوب فرمائشیں کیں مگر کسی نے نہیں دیکھا کہ ماں جی صحن میں لگے چھتنار کے درخت کے ساتھ ٹیک لگائے کتنی اُداس و ویران بیٹھی ہیں۔ بھیا کا دل رکھنے کے لئے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی مگر اس مسکراہٹ میں کتنا دُکھ پوشیدہ تھا یہ کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا بس میں تھا جو ماں جی کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لئے بیٹھا تھا۔ میں ان کا دُکھ سمجھ رہا تھا۔ جب بھیا ایئرپورٹ جانے کے لئے گھر سے نکلے تو ماں جی کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ اور وہ زار و زار رونے لگیں۔ میں اکیلا بیٹھا ان کے آنسو پونچھتا رہا ان کو تسلی دیتا رہا۔ بھیا کے امریکہ جانے کے ایک مہینے بعد ہی بھیا کا خط اور ڈرافٹ آنے لگے۔ چند ماہ بعد ہی ہم نے وہ مکان چھوڑ دیا اور ایک بڑے سے مکان میں شفٹ ہوگئے۔ اس بڑے سے مکان کا سب سے اچھا کمرہ ماں جی نے بھیا کے لئے آراستہ کروالیا مجھے بھی الگ کمرہ دیا گیا مگر میں نے صاف انکار کردیا مجھے ماں جی کے بغیر نیند نہیں آتی تھی لہٰذا میں نے اپنا پلنگ ماں جی کے کمرے میں ان کے پلنگ کے ساتھ بچھالیا اور رات کو ماں جی سے باتیں کرتے کرتے سو جاتا۔ اب ماں جی کو بھیا کی شادی کا ارمان تھا وہ بھیا کے لئے دلہن ڈھونڈنے لگیں۔ ماں جی دھیرے دھیرے بھیا کی دلہن کے لئے بری بھی جمع کرنے لگی تھیں۔ ایک سوٹ کیس میں اپنی خریدی ہوئی تمام چیزیں رکھ کر اس سوٹ کیس کو اپنے پلنگ کے پاس رکھتیں اور کبھی کبھی اس سوٹ کیس کو کھول کر ان میں جمع کئے کپڑوں پر اس طرح ہاتھ پھیرتیں گویا بھیا کا لمس محسوس کررہی ہوں۔

جب میرے فائنل امتحان ہونے والے تھے تو بھیا کا خط آیا۔ خط تھا کہ ایک بم جو ماں جی کے سر پر پھٹا۔ ماں جی بے ہوش ہوگئیں۔ کئی جتن سے انہیں ہوش میں لایا گیا۔ ہوش میں آتے ہی وہ بھیا کا نام لیکر پکارنے لگیں اور رونے لگیں۔ خط ان کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ میں دہل گیا، جانے خط میں کیا لکھا ہے۔ میں نے ماں جی کے ہاتھ سے خط لیکر پڑھا تو بھیا نے اس خط میں اپنی ایک کولیگ جولیا سے شادی کی اطلاع دی تھی اور انہوں نے وہیں کی شہریت اختیار کرلی تھی۔ بھیا نے خط میں لکھا تھا کہ شادی کے دن انہیں ماں جی بہت یاد آئیں لیکن وہ مجبور تھے۔ خط میں اس اطلاع کے بعد زیادہ تر تحریر ان کی مجبوری کی داستان سے بھری ہوئی

تھی۔ ماں جی کو بھیا کے اس طرح شادی کرنے سے بہت صدمہ ہوا اور انہوں نے بستر پکڑ لیا۔ میں ہر ممکن ان کی دلجوئی کرتا مگر بھیا کا غم انہیں اندر ہی اندر کھاتا جا رہا تھا۔ چند دنوں بعد میرے بھی فائنل امتحان ہو گئے۔ ایک دن جب میں بیٹھا ماں جی کے پیر دبا رہا تھا تو ماں جی نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ”تانی......“ ماں جی مجھے تانی کہتی تھیں ”تانی تو بھی مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا......“

”نہیں ماں جی...... میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا......“ میں نے ماں جی کے پیروں پر اپنا سر رکھتے ہوئے کہا، تو ماں جی رونے لگیں۔ چند دن بعد میرا رزلٹ بھی آ گیا میں نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔ مجھے بھی حکومتی وظیفہ ملا مگر میں نے وہ وظیفہ لینے سے انکار کر دیا۔ جب ماں جی کو میرے اول آنے کی خبر ہوئی تو وہ دہل گئیں۔ اس دن میں گھر پہنچا تو ماں جی مجھے دیکھتے ہی بولیں...... ”تجھے بھی وظیفہ ملا ہے تو بھی مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا......؟“

”نہیں ماں جی مجھے کوئی وظیفہ نہیں ملا......“ میں نے ماں جی سے جھوٹ کہا۔ میرے الفاظ سن کر ماں جی کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میرے سارے دوست حیران تھے کہ میں نے امریکہ میں پڑھنے کی اتنی اچھی آفر کیوں ٹھکرا دی۔ میرے دوست میرا مسئلہ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ میرا پلنگ ماں جی کے پلنگ کے ساتھ جڑا ہوا تھا اکثر رات کو میری آنکھ کھلتی تو میں دیکھتا کہ ماں جی بیٹھی ہیں اور ان کا ہاتھ میرے سر پر رکھا ہے جیسے انہیں ڈر ہو کہ کہیں میں بھی انہیں چھوڑ کر چلا تو نہیں گیا۔

امتحان پاس کر لینے کے بعد نوکری کے لئے مجھے بہت جدوجہد کرنی پڑی ہمارے ملک میں نوکریوں کے لئے رشوت وسفارش چلتی ہے جو میرے پاس نہیں تھی۔ بھیا ہر خط میں لکھتے کہ میں ان کے پاس امریکہ آ جاؤں وہاں بہت مواقع ہیں۔ مجھے اچھی تنخواہ ملے گی مگر میں انہیں ٹال دیتا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ میں ماں جی کو چھوڑ کر جاؤں۔ جب بھی بھیا کا خط آتا تو میں دیکھتا کہ ماں جی کا چہرہ زرد پڑ جاتا انہیں ڈر تھا کہ کہیں میں بھی اپنے اچھے مستقبل کے لئے انہیں نہ چھوڑ جاؤں۔ اکثر بجو ماں جی سے کہتی ......”ماں جی ...... مائیں بچوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتیں...... تانی کا مستقبل سنور جائے گا اگر وہ بھی امریکہ چلا جائے گا۔“

”میں ماں جی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا......“ میں اٹل لہجے میں کہتا تو بجو بپھر جاتی۔

”ہاں ...... ہاں...... جیسے تمہارے امریکہ جانے سے ہمیں فائدہ ہے جو ہم تمہیں کہہ رہے ہیں ...... امریکہ چلے جاؤ گے تو تمہارا ہی مستقبل سنور جائے گا ورنہ یہاں تو تمہیں دال روٹی کی تنخواہ والی معمولی نوکری بھی نہیں ملے گی۔“

”میں بھوکا رہ لونگا...... فاقہ کر لونگا...... مگر ماں جی کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا......“ میں نے آنسو بہاتی ماں جی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”ہاں...... ہاں دیکھیں گے جب تمہاری شادی ہوگی تو بھی تم بجائے اپنی دلہن کے کمرے کے ماں جی کے کمرے میں پلنگ سے پلنگ ملا کر سونا......“ بجو اتنا کہہ کر ناراض ہو جاتی اور ماں جی آنسو بہاتی رہتیں۔

آخر بڑی تگ و دو کے بعد مجھے ایک نوکری مل گئی تنخواہ زیادہ نہ تھی مگر بہر حال مجھے ایک نوکری کی ضرورت تھی لہٰذا میں نے نوکری کر لی۔ اور ......اس روز...... مجھے پہلی تنخواہ ملی تھی۔ میں خوش خوش گھر جا رہا تھا ”میں آج اپنی پہلی کمائی ماں جی کے ہاتھ میں رکھوں گا......“ یہ سوچ کر میں خوش ہو رہا تھا۔

”کسی اچھی مٹھائی کی دکان پر رُکنا......“ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا تو اس نے اچھا کہہ کر مجھے جواب دیا۔ تھوڑی دُور ایک بڑی سی مٹھائی کی دکان پر اس نے ٹیکسی روکی تو میں نے ٹیکسی سے اُتر کر مٹھائی کی دکان سے ایک کلو گلاب جامن خریدے۔ ماں جی کو گلاب جامن بہت پسند تھے۔ کچھ دیر بعد میں ماں جی کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے ماں جی کے ہاتھ میں اپنی پہلی تنخواہ رکھی تو وہ خوش ہو گئیں اور انہوں نے مجھے

پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''تانی بیٹا تو خوش ہے نا......''

''ہاں ماں جی ...... میں بہت خوش ہوں......''

میں نے مٹھائی کا ڈبہ کھولا اور ایک گلاب جامن ماں جی کے منہ میں ڈالا۔ ماں جی آہستہ آہستہ گلاب جامن چبانے لگیں۔

رات کا نہ جانے کونسا پہر تھا میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے گھبراہٹ سی ہورہی تھی میں چند لمحے لیٹا رہا پھر مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو میں ہڑبڑا کر اُٹھ گیا۔ کمرہ دودھیا روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ میں نے ماں جی کے پلنگ کی جانب دیکھا ماں جی پرسکون انداز میں سو رہی تھیں۔ پھر میں نے پلنگ کے سرہانے نظر دوڑائی تو وہاں مجھے ایک سفید پوش کھڑا نظر آیا اس کا لباس مکمل سفید تھا اس کا چہرہ اتنا پُرنور اور پاکیزہ تھا کہ دل چاہتا تھا کہ میں اس کا چہرہ دیکھتا ہی رہوں۔ چند منٹ تک میں بے خود اس سفید پوش کو گھورتا رہا۔

''کک...... کون ہو تم......'' میں نے اس سفید پوش سے پوچھا تو اس سفید پوش نے اپنی نظریں اٹھائیں اور میری جانب دیکھا اور دھیرے سے مسکرا کر کہنے لگا۔

''میں موت کا فرشتہ ہوں...... تمہاری ماں کی روح قبض کرنے آیا ہوں......''

''نہیں...... نہیں...... خدارا ایسا مت کرو...... ابھی تو ماں جی کو خوشیاں ملی ہیں انہیں کچھ دن تو اس دنیا میں خوش ہو لینے دو۔'' میں سفید پوش کی بات سن کر گڑبڑا گیا لہٰذا میرے منہ سے بے ربط جملے نکلنے لگے۔

''میں جس جگہ آتا ہوں اپنا کام کر کے ہی جاتا ہوں۔'' سفید پوش نے مجھے جواب دیا۔

''خدا کے لئے ...... ماں جی کو مت لیکر جاؤ...... میں ان کے بغیر مر جاؤں گا...... میں ماں جی کے بغیر نہیں رہ سکتا......'' میں اس سفید پوش کے سامنے گڑگڑایا میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔

''میں یہاں تک آیا ہوں تو کسی کی روح کو لیکر ہی جاؤں گا خالی ہاتھ میں نہیں جاسکتا......'' وہ سفید پوش بولا۔

''ٹھیک ہے تم مجھے لے چلو...... میری روح قبض کرلو مگر...... مگر ماں جی کو چھوڑ دو......'' میں نے روتے ہوئے اس سفید پوش کو ایک تجویز دی۔

میری بات سن کر وہ سفید پوش مسکرایا اور دھیرے سے بولا...... ''میں تمہیں ہی لینے آیا تھا دنیا میں تمہاری سانسیں ختم ہوچکی تھیں مگر تمہاری ماں نے تم سے پہلے مجھ سے سودا کرلیا اور اپنی سانسیں تمہیں بخش دیں اور میں نے ان سے وعدہ کرلیا کہ تمہارے بجائے میں ان کی روح قبض کرلوں گا اور میں وعدہ خلافی نہیں کرتا لہٰذا میں نے تمہاری ماں کی روح قبض کرلی۔''

''نہیں......'' میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں بے ہوش ہوگیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں بستر پر لیٹا تھا۔ چند لمحے میں خالی الذہن لیٹا رہا پھر مجھے خواب یاد آیا تو میں ہڑبڑا کر اُٹھ گیا۔ میں نے دیکھا ماں جی اپنے بستر پر آرام سے سو رہی ہیں ان کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ ہے میں نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر مجھے کمرے میں کوئی اور نظر نہیں آیا۔

''اوہ خدایا...... تو وہ خواب تھا......'' میں بڑبڑایا۔

''کتنا بھیانک خواب تھا......'' میں یہ سوچتا ہوا اپنے پلنگ سے نیچے اُترا اور ماں جی کے پلنگ کے پاس آیا۔ ماں جی چادر اوڑھے سو رہی تھیں ان کے دونوں پیر چادر سے باہر تھے میں نے دھیرے سے ان کے پیروں کا بوسہ لیا اور پھر ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا مگر...... مگر ان کا ماتھا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

''ماں جی......'' میں نے انہیں کندھے سے پکڑ کر ہلایا تو ماں جی کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔

میرا رات کا خواب سچا تھا، ماں جی نے اپنی جان دے کر میری زندگی خرید لی تھی۔ میری آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکل کر ماں جی کے چہرے پر گرنے لگے۔

حساب......!

• ایس امتیاز احمد

میں کوئین ہیڈ کی طرف روانہ ہوا۔ دراصل میں اس عظیم کامیابی کا جشن منانا چاہتا تھا میرا ارادہ تھا کہ میں ایک یا دو پیگ شراب ضرور پیوں گا۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچ کر محظوظ ہو رہا تھا کہ ایڈی پامر اگر جیل میں رہتا تو میرے لئے زیادہ کارآمد نہیں تھا۔ البتہ اس نے فرار ہو کر مجھے بہت بڑی خوشی سے ہمکنار کر دیا تھا۔

ایک شاطر کی کہانی جو دو افراد کو بیک وقت بے وقوف بنا گیا تھا

مجھے یقین ہے کہ برطانیہ میں ایک سال پہلے جیل سے مجرموں کا فرار امریکہ کے لوگوں کے لئے بہت دلچسپی کا باعث رہا ہوگا۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے امریکی کثرت سے پڑھتے اور انہیں پسند بھی کرتے ہیں لیکن میں ذاتی طور پر حیران ہوں کہ اس معاملے میں جو مزاح کا پہلو تھا اس پر ہنسوں یا نہیں؟ یقیناً اس معاملے کا آغاز اس وقت ہوا تھا

جب ہمارے ہاں کا ایک انتہائی اہم آدمی جیل سے فرار ہو گیا۔ یہ شخص غداری کے الزام میں گرفتار ہوا تھا۔ جب تحقیقات ہوئیں تو معلوم ہوا کہ اس شخص نے فرار ہونے میں کسی خاص ذہانت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس نے محافظوں کو کسی نہ کسی طرح کاٹا اور نکل بھاگا تھا۔ بہرحال اس کے بعد اخبارات نے شور مچایا تو اعلیٰ حکام نے یہ اقرار کر لیا کہ ہمارے

ملک کی جیلوں سے فرار ہونا کوئی مشکل بات نہیں ہے بلکہ یہ اس سلسلے میں دنیا کی آسان ترین جیلیں ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہمارے قیدیوں کی اکثریت اس بات سے آگاہ نہیں تھی۔ انہوں نے جب اخبار میں یہ اعلان پڑھا تو اس بات کو آزمانے کا ارادہ کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو ہفتے بعد روزانہ پانچ قیدیوں کے فرار کی خبریں سنائی دینے لگیں۔ اس صورتحال سے تنگ آکر پولیس کو ان جیلوں میں محافظوں کی تعداد بڑھانی پڑی تھی۔

میں ایک شرط لگانے والی ایجنسی کا مالک ہوں۔ لندن میں ایسی بہت سی دکانیں ہیں جہاں لوگ باآسانی کوئی نہ کوئی شرط لگا سکتے ہیں۔ یہ غیر قانونی کام نہیں کیونکہ ہمارے پاس باقاعدہ اجازت نامے موجود رہتے ہیں۔ ایسی دکانوں کا سلسلہ ہائیڈ پارک تک پھیلا ہوا ہے اور اس کاروبار کی ابتداء اس روز ہوئی تھی جب انگریزوں کے دور آزادی کا آغاز ہوا تھا۔ اگر رقم زیادہ ہو تو ہم مخصوص شرطوں سے ہٹ کر نئے انداز کی شرطیں بھی لگانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

ایک رات کوئین ہیڈ کلب میں میرے ہم پیشہ ساتھیوں میں سے ایک نے مذاق مذاق میں پانچ کے مقابلے پر دو کی شرط لگاتے ہوئے کہا کہ آئندہ چوبیس گھنٹوں میں جیل سے کوئی نہ کوئی قیدی ضرور بھاگ نکلے گا۔ یہ ایک ایسی شرط تھی جس پر عام لوگوں میں سے بھی چند ایک چھوٹی موٹی رقم داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اگلے روز اس نے یہ چیلنج اخبار میں شائع کرادیا اس نے اشتہار دیا کہ برطانوی جیل سے کوئی نہ کوئی قیدی ضرور بھاگے گا۔ شرط کی تفصیل اس طرح تھی۔

اگر دو مجرم بھاگے تو رقم ایک کے مقابلے میں پانچ ڈالر ہوگی۔

تین مجرم فرار ہوئے تو رقم ایک کے مقابلے میں دس ڈالر ہوگی۔

چار مجرموں کے لئے چوبیس ڈالر اور اگر پانچ قیدی فرار ہوئے تو ایک کے مقابلے میں تینتیس ڈالر ادا کئے جائیں گے۔ اس نے یہ اعلان بھی کیا کہ اگر کسی جیل کا نام مخصوص کرکے شرط لگائی گئی تو ایجنسی دوگنی ادائیگی کرے گی۔

جی میرے گاہکوں کی نظر سے یہ خبر گزری تو سب کے سب میری ایجنسی کی طرف دوڑے۔ ان میں ہر ایک یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا میں اس سلسلے میں شرط لگانے پر آمادہ ہوں؟ میں دوسروں کے خیالات سے فائدہ اٹھانا پسند نہیں کرتا لیکن جب رقم کمانے کا معاملہ ہو تو میرا خیال ہے موقع گنوانا بہت بڑی حماقت ہے۔ میں انہیں اپنے شرط لگانے والے دوست کی ایجنسی ٹم ٹب بھی بھیج سکتا تھا لیکن خراب موسم میں گاہکوں کو اتنی دور بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ بہرحال میں نے بھی اپنے گاہکوں سے اسی اعلان کے مطابق شرط لگانے پر آمادگی ظاہر کی جو اخبار میں ٹم ٹب کی طرف سے شائع ہوا تھا۔

پہلے ہی ہفتے میں شرطیں لگانے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ میں یہ سوچ کر لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اس طرح مجھے اچھی خاصی آمدنی ہو جائے گی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ دھڑکا بھی لگا تھا کہ کہیں یہ سب کے سب جیت ہی نہ جائیں۔ جب پولیس نے اس صورتحال کے پیش نظر اپنے محافظوں کی تعداد دوگنی کردی تو مجھے یہ معاملہ اپنے حق میں نظر آنے لگا۔

یہ دوسرے ہفتے کی بات ہے مجھے اپنی قسمت کا ستارہ کچھ زیادہ روشن محسوس ہو رہا تھا۔ میری ایجنسی میں غالباً اس سے پہلے اتنی زیادہ شرطیں کبھی نہیں لگی تھیں۔ یہ غالباً سہ پہر کی بات ہے۔ ایک اُداس سا لمحہ تھا۔ صبح سے شرطیں لگانے والوں کے ہاتھوں میں بُری طرح تھک گیا تھا اور کچھ دیر آرام کرنے کے موڈ میں تھا۔ میں کیش بند کر رہا تھا کہ میرا معاون ایک نوجوان کو لے کر میرے دفتر میں داخل ہوا

شوخ سطریں......!

اس نے کہا تم میں پہلے سی بات نہیں
میں نے کہا انسان ہوں سائنس کی ایجاد نہیں
اس نے کہا اب بھی کسی کی آنکھوں میں ڈوب جاتے ہو
میں نے کہا باؤلے ہو کیا؟ آنکھیں ہیں کوئی تالاب نہیں
اس نے کہا کیوں ٹوٹ کے چاہا تھا مجھے اتنا
میں نے کہا دماغ سے پیدل تھا جس کا کوئی جواب نہیں
اس نے کہا کیا میں بے وفا ہوں
میں نے کہا تو اتنا دھوکے باز ہے جس کا کوئی حساب نہیں
اس نے کہا بھول جا مجھ کو
میں نے کہا تو ہے کون مجھے تو یہ بھی یاد نہیں

(ایس امتیاز احمد)

اگرچہ اس نوجوان کے گال اندر دھنسے ہوئے تھے لیکن اپنے نیلے سوٹ میں وہ ایک نمایاں شخصیت کا حامل نظر آ رہا تھا۔ اس نے خوبصورت ٹائی باندھ رکھی تھی اور اس کے بٹن سونے کے تھے۔ میں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ یہ صورت سے ایک شریف آدمی نظر آتا تھا۔ میرا خیال ہے اس نے جنگ کے دوران مشینوں وغیرہ سے خوب کمائی کی تھی۔ لیکن جب اس نے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی تو مجھے احساس ہوا کہ میں اس کے بارے میں غلط خیال آرائی کر رہا ہوں اس کے لب و لہجے میں کوئی خاص بات ضرور تھی۔

میں چونک پڑا۔ وہ بے ساد انداز میں بات کر رہا تھا۔ میرا مطلب تو غالباً آپ سمجھ ہی رہے ہوں گے۔ دراصل ہم شرطیں لگانے والے انسانی نفسیات کے ماہر ہوتے ہیں اور ہم ہر قسم کے آدمی کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔ ہماری اس خصوصیت کے بارے میں قارئین کو اعتراف کر لینا چاہیے۔

''کیا تم ہی مسٹر گوڈ فرے ہو؟'' اس نے دریافت کیا۔

''ہاں میں ہی ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میری اس بات پر نوجوان نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بعض لوگ فوراً کوئی نہ کوئی بات کہتے ہیں جس سے ہمیں گاہک کے ساتھ بات کرنے میں آسانی رہتی ہے اور اس طرح اس کی شخصیت بھی ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ لیکن اس نوجوان نے فوراً ہی مطلب کی بات شروع کر دی۔ ''کیا میں یقین کر لوں کہ تم آئندہ چوبیس گھنٹے کے دوران جیل سے فرار ہونے والے قیدیوں کے سلسلے میں شرط لگا سکتے ہو اور رقم بھی ادا کر سکتے ہو؟''

''یہی بات باہر بورڈ پر بھی لکھی ہے نوجوان۔ میں نے کہا۔ بہرحال ہماری ایجنسی یہ شرط لگانے پر آمادہ ہے اور بازار میں ہماری ساکھ بھی ہے۔ ہم جیتنے والے کو نقد ادائیگی کرتے ہیں۔''

''میں کچھ رقم شرط پر لگانا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم باہر جا کر میرے معاون سے معاملہ طے کر لو۔ مجھے ابھی بہت سی رسیدیں جمع کرنا ہیں تم دیکھ رہے ہو کہ میری میز پر کاغذ ہی کاغذ بکھرے ہوئے ہیں۔''

''میں ایک بہت بڑی شرط لگانا چاہتا ہوں۔''

میں نے اپنے کھاتے میں ایک مقام پر اپنی انگلی رکھ دی تاکہ حساب ذہن میں رہے اور مجھے دوبارہ محنت نہ کرنی پڑے۔ میں نے بغور اس کی طرف دیکھا میری آنکھیں اس کی آنکھوں پر جمی ہوئی تھیں میں نے دریافت کیا۔

''کتنی بڑی شرط ہے نوجوان؟''

''ایک ہزار پاؤنڈ کی شرط۔''

''میں نے رکی ہوئی سانس چھوڑ دی اور تھوک نگل کر کہا۔'' کیا تم سنجیدہ ہو؟

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں بار

بار تھوک نگلنے لگا۔ ایک ہزار پاؤنڈ یعنی دو ہزار آٹھ سو ڈالر؟ یہ ایک بہت بڑی شرط تھی میں نے اب تک اتنی بڑی شرط کسی سے نہیں لگائی تھی۔ اتنی بڑی شرط تھی کہ میری انگلی کھاتے سے ہٹ گئی۔ دراصل میں اس شرط کے علاوہ سب کچھ بھول گیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کچھ ایسے لہجے میں کہا جیسے اتنی بڑی شرط نے مجھے بالکل متاثر نہیں کیا۔ ''میرا خیال ہے مجھے تم سے بات چیت کر لینی چاہئے مسٹر۔''؟

''اسمتھ۔'' اس نے کہا۔ یقیناً یہ اس کا نام نہیں تھا۔

''ہاں تو مسٹر اسمتھ تمہاری یہ شرط درحقیقت کس نوعیت کی ہے۔''

''میں ایک ہزار پاؤنڈ اس بات پر لگانا چاہتا ہوں کہ سموتھر ویٹ جیل سے پانچ آدمی آئندہ چوبیس گھنٹے کے دوران فرار ہو جائیں گے۔''

یہ بات سن کر میرا پورا جسم مفلوج سا ہو گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا ذہنی توازن ہی بگڑ گیا تھا۔ میرا خیال ہے ایک آدھ منٹ تو میں سانس لینا ہی بھول گیا تھا اور جب مجھے احساس ہوا تو میں بری طرح ہانپ رہا تھا۔ بلآخر میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی اور جب میں بولا تو میری آواز کسی مینڈک کے ٹرانے سے مختلف نہیں تھی۔ ''میرا خیال ہے مجھے اس شرط کی تفصیلات تمہیں بتا دینی چاہئیں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر کسی جیل سے پانچ افراد مقررہ وقت میں فرار ہوئے تو ایک کے مقابلے میں تینتیس (33) ڈالر کی شرط ہے لیکن اگر کسی جیل کو مخصوص کر دیا جائے تو یہ رقم دُگنی ہو جائے گی۔ بالفاظ دیگر اگر تمہاری بتائی ہوئی جیل سے آئندہ چوبیس گھنٹوں کے دوران پانچ قیدی فرار ہو گئے تو میں تمہارے ایک پونڈ کے عوض چھیاسٹھ پونڈ دوں گا۔ یعنی مجموعی طور پر چھیاسٹھ ہزار پونڈ جیت جاؤ گے۔''

''تمہیں یہ سب کچھ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں نے آج صبح ہی یہ سب حساب کر لیا تھا۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم یہ شرط لگانے پر آمادہ ہو یا نہیں؟''

''کیا تم مجھے ایک گھنٹے کی مہلت دینا پسند کرو گے؟'' میں نے کچھ نمبر اپنے پیڈ پر جلدی جلدی لکھتے ہوئے کہا۔ ''دراصل میں اس شرط کے دیگر پہلوؤں پر بھی غور کرنا چاہتا ہوں۔''

''نہیں یہ ایک ارجنٹ معاملہ ہے۔'' اس نے اصرار کیا۔

میں نے پیڈ پر خفیہ زبان میں کچھ حساب کیا اور ذہن میں ممکنات کو دہراتا رہا یہ اتنی بڑی شرط تھی کہ میں اسے نظرانداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں یہ شرط ہار کر تباہ بھی ہو سکتا تھا اس لئے میں کسی پہلو سے کمزور رہ کر یہ شرط نہیں لگانا چاہتا تھا۔ شرط لگانے کے لئے تھوڑی بہت امید تو ہونی ہی چاہئے۔ میں اسی اُمید کی ہلکی سی کرن کو دیکھنا چاہتا تھا۔ یہاں اس بات کا تذکرہ ہی بیکار ہے کہ میں تنہا اتنی بڑی شرط لگانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا میں چاہتا تھا کہ ہم پیشہ افراد میں سے چند ایک کو بھی اس کاروباری معاملے میں شریک کر لوں۔

ابھی میں انہی باتوں میں الجھا ہوا تھا کہ میرے ذہن میں ایک اور خیال پیدا ہوا اس کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرے تمام خدشات بیکار ہیں۔ اس شرط کو جیتنے کے لئے کچھ آسان ذرائع بھی تھے۔ جب مجھے اس صورت حال کا احساس ہوا تو میں نے خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ اب میرے لہجے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔

''ٹھیک ہے میں اس شرط کے لئے تیار ہوں لیکن اس سلسلے میں رقم کی ادائیگی نقد اور فوری ہونی چاہئے۔''

میری آمادگی دیکھتے ہی مسٹر اسمتھ نے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور میری طرف بڑھایا۔ میں نے لفافہ لے کر دبایا اور اسے کھول کر جھانکا۔ اس میں دس پاؤنڈ کے نوٹوں کی گڈی تھی۔ میں سوچ

رہا تھا کہ اس کے جاتے ہی احتیاط سے ان نوٹوں کو گن لوں گا۔ لیکن فوری طور پر گڈی کا حجم مجھے مطمئن کرنے کے لئے کافی تھا۔

''اگر میں یہ شرط جیت گیا۔'' مسٹر اسمتھ نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''تو میں تمہیں وہ جگہ اور طریقہ بتا دوں گا جس کے ذریعے میں رقم وصول کرنا پسند کروں گا۔ غالباً یہ بات تو تم بھی پسند نہیں کرو گے کہ میں یہاں سے اتنی بڑی رقم لے کر نکلوں اور کوئی مجھے راستے ہی میں لوٹ لے۔''

''بالکل، بالکل۔'' میں نے جلدی سے کہا اور رقم کی رسید اس کی طرف بڑھا دی۔ میں اسے باہر تک چھوڑنے کے لئے دروازے کے قریب پہنچا لیکن میں دل ہی دل میں خوش تھا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی دیکھوں اس لئے میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملا دی تھی کہ وہ جیسے اور جہاں چاہے رقم وصول کر سکتا ہے۔

جیسے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ گلی سے باہر نکل گیا ہو گا میرا ہاتھ تیزی سے فون کی طرف بڑھا اور میری انگلی میکانکی انداز میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کا فون ڈائل کرنے لگی۔ یقیناً یہ ایک ایسی صورت تھی جس سے میں ایک بہت بڑی رقم ہارنے سے بچ سکتا تھا اور ایک ہزار پونڈ کا مالک بھی بن سکتا تھا۔

مسٹر اسمتھ نے کہا تھا کہ یہ بہت ارجنٹ معاملہ ہے یہ بات صرف مخصوص حالات میں ہی کہی جا سکتی ہے۔ اس کا اطمینان ایک لحاظ سے میرے لئے تشویش کا باعث بھی تھا۔ اس کا درحقیقت جو بھی نام تھا بہرحال مسٹر اسمتھ جانتا تھا کہ سموتھر جیل سے پانچ قیدی فرار ہونے والے ہیں۔ جب اسے یقین ہو گیا تو اس نے سوچا کہ کیوں نہ شرط لگا کر اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے لیکن شاید اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم لوگ بھی اپنی رقم بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کر گزرتے ہیں۔

سموتھر ویٹ ایک انتہائی اہم جیل ہے اس جیل میں عموماً خطرناک ترین مجرموں کو رکھا جاتا ہے پولیس کے انتہائی خونخوار گارڈ وہاں رکھے گئے تھے۔ دراصل شرط کا معاملہ تو ایک طرف رہا۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ چند خطرناک قیدیوں کی کوشش کو ناکام بنانا ایک شہری کی حیثیت سے میرا فرض نہیں ہے؟ دراصل میں بہت نرم دل آدمی ہوں میں اس بات کو برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ خطرناک مجرم آزاد ہو کر معاشرے میں دندناتے پھریں۔ اس طرح جو وحشت بچوں اور عورتوں پر ہوتی ہے اسے میں دیکھنا تو درکنار اس کے بارے میں سوچ کر ہی کانپ جاتا ہوں لہٰذا اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں پولیس کا مخبر ہوں تو آپ کو اجازت ہے کہ میرے بارے میں جو رائے چاہے قائم کریں مجھے اس کی ذرا بھی پروا نہیں ہے۔

بہرحال میں نے اسکاٹ لینڈ یارڈ کو فون کیا ظاہر ہے میری یہ کال ایک گمنام آدمی کی حیثیت سے تھی۔ میں نے بتایا کہ ایک شخص مارکیٹ میں بڑی بڑی شرطیں لگا رہا ہے۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج رات سموتھر جیل سے پانچ خطرناک قیدی ضرور فرار ہوں گے۔ میں نے انسپکٹر کو مشورہ دیا کہ سپاہیوں کا مزید ایک دستہ فوراً جیل کی طرف روانہ کر دے۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور قانون کی حمایت میں میری تعریف کرتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس اطلاع کے بعد فوری طور پر شہر بھر کی پولیس جیل کی طرف روانہ ہو گئی ہو گی اور سپاہیوں نے اس جیل کے چپے چپے کی نگرانی شروع کر دی ہو گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پولیس کا ایک ایک کانسٹیبل ہر کوٹھڑی کے دروازے پر بھی متعین کر دیا گیا ہو اس کے علاوہ ایک گشتی کار مسلح سپاہیوں کو لے کر مسلسل جیل کے گرد چکر لگا رہی ہو گی۔ اس صورت میں کوئی پرندہ بھی پولیس کی نگاہ میں آئے بغیر جیل کے اندر یا باہر نہیں جا سکتا تھا۔ چوبیس گھنٹے گزر گئے تو میں یہ خبر سن کر مطمئن ہو گیا کہ برٹش جیل سے صرف ایک قیدی فرار

"دُعا تقدیر بدل دیتی ہے" (حدیثِ رسولؐ)

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور ایمان افروز پیشکش

دُعا نمبر

شائع ہو گیا ہے

- قرآنی دعائیں۔
- عظیم پیغمبرانِ خدا کی وہ دُعائیں جو نسلِ انسانی کے لیے نجات اور ہدایت کا باعث بنیں۔
- خالقِ کائنات کے آخری نبی محمد رسول اللہؐ کی تمام مسنونہ دُعائیں جو رحمت اللعالمینؐ کی ذاتِ برکات کا مقدس پرتو ہیں۔
- صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی دُعائیں۔
- آئمہ اکرام اور اسلام کے عظیم اور باکمال صوفیائے عظیم کی بابرکات دُعائیں۔

جدید دُنیا کے گھمبیر اور اعصاب شکن مسائل میں گھرے
پریشان حال انسان کے تمام مسائل کا تشفی آمیز
رُوحانی اور ایمانی علاج

سیّارہ ڈائجسٹ ۲۴۴ مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔
فون نمبر ۷۲۲۴۵۴۱۲

ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔ اور وہ شخص بھی ایک روز پہلے بھاگا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قیدی سموتھر جیل سے فرار نہیں ہوا تھا۔ میں نے مسٹر اسمتھ کی احمقانہ شرط پر دل کھول کر قہقہہ مارا اور جب اس کی رقم اپنے سیف میں رکھ رہا تھا تو یہ خیال میرے ذہن میں آئے بغیر نہیں رہا کہ وہ ایک انتہائی احمق آدمی ہے اور آئندہ بھی شرط نہیں لگائے گا بلکہ میرے خیال میں اسے شرط لگانے سے توبہ ہی کر لینی چاہئے۔

اگلے روز شام کو مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا۔ دراصل اس وقت میں جیل سے فرار ہونے والے اس واحد قیدی کے بارے میں تفصیلات پڑھ رہا تھا یہ وہی شخص تھا جو مجھ سے شرط لگانے آیا تھا۔ اس کا حلیہ اخبار میں تفصیل سے شائع ہوا تھا۔ یہ شخص برطانیہ کا سب سے بڑا جعلساز تھا۔ ایڈی پامر۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کیا ایڈی پامر پاگل ہوگیا تھا کہ اس نے مجھ سے ایک ہزار پاؤنڈ کی شرط لگائی اور رقم ہار گیا۔ وہ پلم اسٹریٹ کی جیل سے فرار ہوا تھا یہ جیل میری ایجنسی سے چند بلاک کے فاصلے پر تھی۔

بہر حال ایک شہری کی حیثیت سے ممکن ہے میں ناکام رہا ہوں لیکن شرطیں لگانے کے سلسلے میں بہت کامیاب ثابت ہوا تھا۔ غالباً یہ بات پڑھ کر آپ سب لوگ خوب ہنسے ہوں گے کہ میں نے برطانیہ کے سب سے مکار آدمی کو شکست دے دی تھی۔

میں کوئین ہیڈ کی طرف روانہ ہوا۔ دراصل میں اس عظیم کامیابی کا جشن منانا چاہتا تھا میرا ارادہ تھا کہ میں ایک یا دو پیگ شراب ضرور پیئوں گا۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچ کر محظوظ ہو رہا تھا کہ ایڈی پامر اگر جیل میں رہتا تو میرے لئے زیادہ کارآمد نہیں تھا۔ البتہ اس نے فرار ہو کر مجھے بہت بڑی خوشی سے ہمکنار کر دیا تھا۔ مجھے بار بار اس کی یہ احمقانہ حرکت یاد آ رہی تھی اور میں زیر لب مسکرا رہا تھا۔

ایک میز پر مجھے ٹم ٹب بھی مل گیا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے جیل سے فرار ہونے والے قیدیوں پر شرطیں لگانے کا خیال پیش کیا تھا اور اس معاملے کی تشہیر کی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس ذہین شخص نے اس دوران کتنی رقم کمائی ہوگی۔ غالباً مجھ سے زیادہ تو نہیں کمائی ہوگی؟

''میں آج بہت خوش ہوں ٹم۔ اس لئے آج کی دعوت کا بوجھ میری جیب پر ہوگا۔''

''تمہیں ایسا کرنا ہی پڑے گا۔'' اس نے بڑے غم زدہ لہجے میں کہا۔ ''آج میں دیوالیہ ہوگیا ہوں۔''

''کیوں۔ کیا ہوا؟'' میں نے حیرت سے اس گنجے دوست کی طرف دیکھا جس کا چہرہ شدت غم سے بگڑ کر بھیانک ہوگیا تھا۔

''میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن یہ سب کچھ اپنی ذات تک محدود رکھنا میں نہیں چاہتا کہ اس معاملے میں اتنا بڑا نقصان اٹھانے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے قہقہوں اور طعنوں کا نشانہ بنوں۔ کل میری دکان میں ایک نوجوان آیا تھا اس نے مجھ سے شرط لگائی تھی کہ آئندہ چوبیس گھنٹوں میں تین قیدی سموتھر ویٹ جیل سے فرار نہیں ہوں گے۔''

میرے ہاتھ سے گلاس گرتے گرتے بچا۔ ''اور اس شرط کی رقم کتنی تھی؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''دس ہزار پاؤنڈ۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''میرے پانچ ہزار کے مقابلے میں اس نے دس ہزار کی رقم اس شرط کے ساتھ لگائی تھی کہ سموتھر ویٹ جیل سے کوئی قیدی فرار نہیں ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ گزشتہ ہفتے تین مرتبہ قیدیوں نے جیل توڑ دی تھی اور ایک واردات پیر کے دن بھی ہوئی تھی لہٰذا میں نے سوچا کہ یہ ایک اچھی شرط ہے لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ اس نے قیدیوں کو روکنے کے لئے وہاں پورے ملک کی پولیس جمع کر دی تھی۔؟ میں تو بالکل ہی تباہ ہوگیا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے تو تین قیدیوں کو پیغام بھجوا دیا تھا لیکن افسوس۔''

سیارہ خواتین کارنر

ڈیجیٹل حقوق کی جنگ میں سرگرم پاکستانی، ''نگہت داد''

نگہت داد کا تعلق پاکستان کے شہر جھنگ سے ہے۔ اُن کے والدین پڑھے لکھے نہیں تھے۔ مگر انھوں نے اپنی بیٹی کو اس قابل بنا دیا کہ وہ بین الاقوامی سطح پر ''نیکسٹ جنریشن لیڈرز'' قرار دی گئی ہیں۔ نگہت کو ملالہ یوسفزئی کو بھی ڈیجیٹل حقوق کی ٹریننگ دینے کا اعزاز حاصل ہے۔ حال ہی میں، امریکی جریدے، 'ٹائم میگزین' نے 'نیکسٹ جنریشن لیڈرز' کی ایک فہرست جاری کی ہے، جس میں پاکستانی خاتون نگہت داد کا نام بھی شامل ہے۔ نگہت داد پاکستان میں 'ڈیجیٹل رائٹس' کیلئے نمایاں کام کر رہی ہیں۔ ان کی انھی کاوشوں پر، ٹائم میگزین کی جانب سے نگہت کو 'اگلی نسل کے لیڈرز' کا اعزاز دیا گیا ہے۔ نگہت داد نے پاکستانی نوبل انعام یافتہ ملالہ یوسفزئی کو محفوظ انٹرنیٹ کے طریقے بھی سکھائے ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے بتایا کہ ملالہ نے 2011ء میں پشاور میں ایک سائبر کرائم ورکشاپ میں حصہ لیا تھا، جہاں وہ عام لڑکیوں کی طرح انٹرنیٹ کے محفوظ طریقہ کار سیکھنا چاہتی تھیں۔

دنیا کی 100 طاقتور ترین خواتین: آنگلا اول، ہیلری دوئم

حال ہی میں امریکی جریدے فوربز کی جانب سے دنیا کی 100 طاقتور ترین خواتین کی فہرست جاری کی گئی ہے۔ فوربز کی فہرست میں دنیا بھر سے تعلق رکھنے والی طاقتور خواتین کے نام شامل ہیں۔ فہرست کے مطابق، جرمن چانسلر آنگلا مرخل اس بار بھی دنیا کی تمام خواتین کو پیچھے چھوڑ کر پہلے نمبر پر جگہ بنا چکی ہیں۔ یہ پانچویں بار ہوا ہے کہ آنگلا مرخل فوربز کی طاقتور ترین خواتین میں سرفہرست رہی ہیں۔ جرمن چانسلر آنگلا مرخل کے بعد فہرست میں دوسرا نمبر سابق امریکی وزیر خارجہ وصدارتی امیدوار ہیلری کلنٹن کا ہے؛ جبکہ تیسرے نمبر پر بل گیٹس کی اہلیہ میلنڈا گیٹس ہیں۔ فوربز کے مطابق، دنیا کی چوتھی امیر ترین خاتون جینٹ ییلن چیئرمین امریکی فیڈرل ریزرو، پانچویں نمبر پر آٹو کمپنی کی چیف ایگزیکٹو میری بارا، جب کہ، آئی ایم ایف کی ایم ڈی کرسٹین لیگارڈ کا نمبر چھٹا ہے۔ امریکی جریدے کی فہرست 2015ء کے مطابق، امریکی ریاست کی خاتون اول مشیل اوباما اس فہرست میں ٹاپ ٹین میں شامل ہیں۔ دنیا کی شوبز انڈسٹری سے تعلق رکھنے والی میزبان اوپرا ونفرے فہرست میں
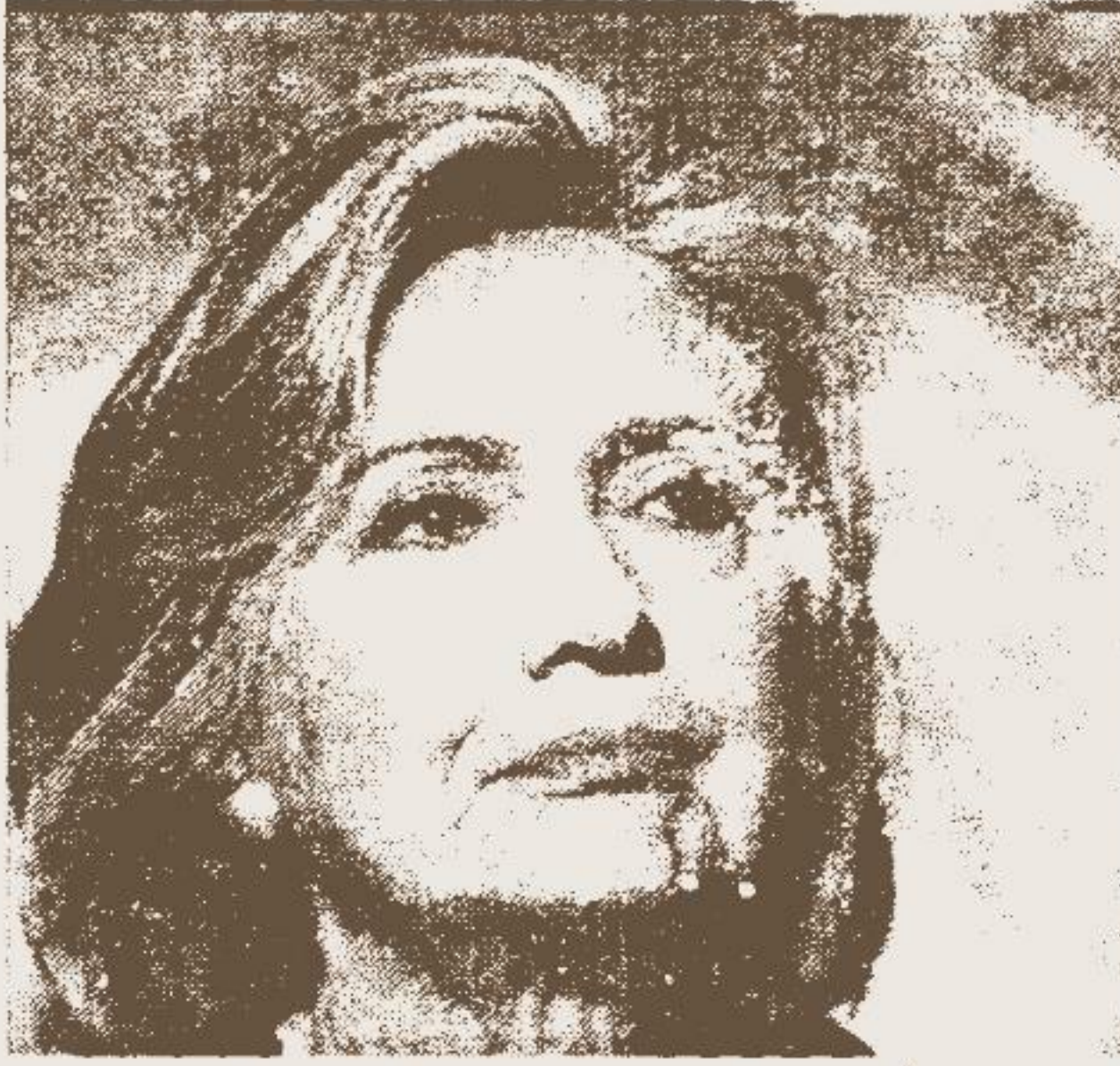
بارھویں نمبر پر ہیں، جبکہ مشہور گلوکارہ بیونسے کا اکیسواں، مشہور پوپ گلوکارہ ٹیلر سوئفٹ کا چونسٹھواں نمبر ہے، جو اس فہرست میں شامل ہیں۔ فوربز کی جانب سے ہر سال 100 طاقتور خواتین کی فہرست جاری کی جاتی ہے۔

پاکستان میں ہر سال 5 ہزار خواتین فسٹیولا کا شکار ہوجاتی ہیں

ماہرین صحت کا کہنا ہے پاکستان میں ہر سال 5 ہیں۔ ماہرین نے تشویش کا اظہار کیا ہے کہ یہ وہ بیماری ہے جسکے باعث خواتین کی عام زندگی سخت متاثر ہوتی ہے، بلکہ اس بیماری میں مبتلا خواتین معاشرے سے کٹ کر رہ جاتی ہیں۔ پاکستان سمیت دنیا بھر میں 23 مئی کو 'فسٹیولا' کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔

عالمی سطح پر اس دن کو منانے کا مقصد خواتین کی اس بیماری کے بارے میں عام سطح پر آگاہی فروغ دیکر خواتین کو اس بیماری کا شکار ہونے سے بچانا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا بھر کے ترقی پذیر ممالک میں تقریباً 20 لاکھ خواتین اس موذی مرض کا شکار ہوکر معاشرے سے کٹ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوجاتی ہیں۔ جناح ہسپتال کی گائناکولوجسٹ، ڈاکٹر حلیمہ یاسمین کا کہنا ہے کہ 'دوران زچگی بچے کی پیدائش بروقت نہ ہونے کے باعث یہ بیماری جنم لیتی ہے۔ انھوں نے افسوس کا اظہار کیا کہ پاکستان میں خواتین کی صحت کے اعتبار سے آگہی کی کمی کے باعث، بہت سی خواتین یہ بیماری لگنے سے معاشی بے چارگی کا شکار ہوجاتی ہیں۔ فسٹیولا کی بیماری کا علاج موجود ہے، جس کے کئی مراکز موجود ہیں، جہاں ایسی خواتین کو مفت علاج فراہم کیا جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود آگاہی نہ ہونے کی وجہ سے، اہلخانہ کی جانب سے بیماری میں مبتلا خواتین کو ایک کمرے تک محدود کردیا جاتا ہے۔

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کرسکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بوریت سے بھی نجات حاصل کرسکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کرسکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email:sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest

چیز بالز
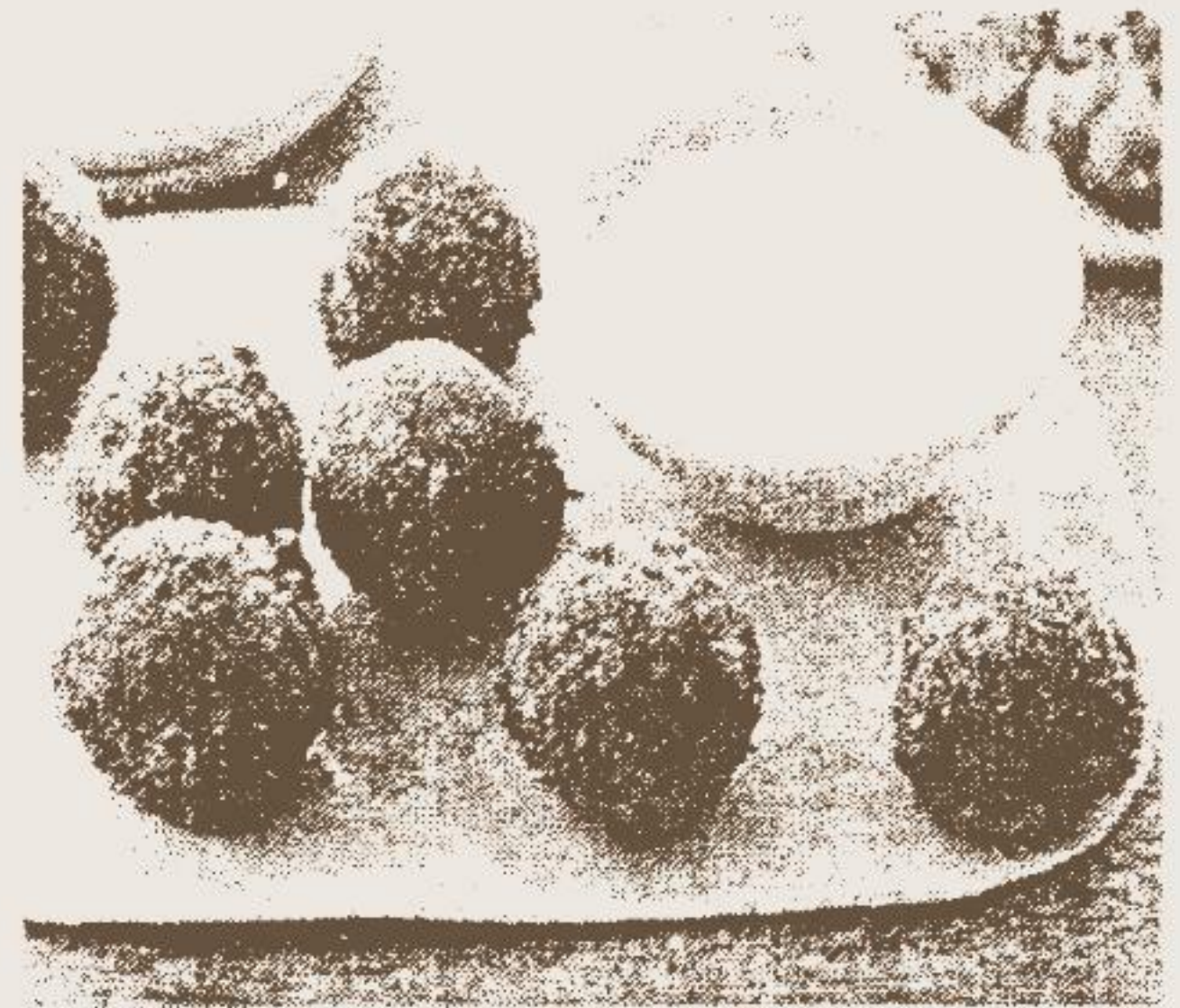
اجزا:

میدہ 75 گرام' پنیر 56 گرام' انڈے دو عدد' کالی مرچ ایک چوتھائی چمچ' ونیلا ایسنس چند قطرے' پسا ہوا زیرہ چوتھائی چمچ' نمک ایک چمچ' گھی دو بڑے چمچ' پانی حسب ضرورت۔

ترکیب: ایک دیگچی میں پانی' گھی اور نمک کو ہلکی آنچ پر پکائیں' جب گھی پگھل جائے تو دیگچی چولہے سے اُتار کر اس میں میدہ ملاتی جائیں اور چمچہ ہلاتی رہیں۔ دیگچی کو دوبارہ چولہے پر رکھ کر ہلکی آنچ پر پکائیں جب میدہ دیگچی کی دیواریں چھوڑنے لگے اور ذرا سخت ہوجائے تو دیگچی کو اُتارلیں اور انڈے توڑ کر ایک پیالی میں پھینٹ لیں اور انہیں پتیلی کے آمیزے میں ملا دیں پھر تمام آمیزے کو اچھی طرح پھینٹ کر اس میں پنیر' نمک' پسی کالی مرچ' زیرہ اور ونیلا ایسنس ملا کر اچھی طرح پانچ منٹ تک پھینٹیں پنیر کی گیندیں تلنے کیلئے اب آمیزہ تیار ہے۔ گھی یا تیل کو درمیانی آنچ پر گرم کریں اور پنیر کے آمیزے کی بالز بنائیں اور انہیں تلیں۔ جب بالز براؤن

ہو جائیں تو ایک پھیلی ہوئی ڈش میں انہیں ترتیب سے سجا کر کدوکش کی ہوئی سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

چکن نگٹس

اجزاء: چکن بغیر ہڈی کی بوٹیاں ایک کلو، لہسن پسا ہوا ایک کھانے کا چمچ، کالی مرچ پسی ہوئی آدھا چائے کا چمچ، سویا سوس دو کھانے کے چمچ، نمک حسب ذائقہ، سفید مرچ پسی ہوئی ایک چائے کا چمچ، سرکہ دو سے تین کھانے کے چمچ، آمیزہ بنانے کے اجزاء میدہ ایک پیالی، نمک حسب ذائقہ، انڈوں کی سفیدی دو عدد، کارن فلور آدھی پیالی، سفید مرچ پسی ہوئی آدھا چائے کا چمچ، آئل ایک پیالی

ترکیب: چکن میں نمک، لہسن، سفید مرچ، کالی مرچ سرکہ اور سویا سوس لگا کر آدھے سے ایک گھنٹے کیلئے فریج میں رکھ دیں۔ آمیزہ بنانے کیلئے انڈوں کی سفیدی پھینٹ کر میدہ کارن فلور، نمک اور سفید مرچ ملالیں اس آمیزہ میں اتنا پانی ڈالیں کہ گاڑھا پیسٹ آمیزہ بن جائے چکن کی بوٹیاں اس میں ڈبو کر پندرہ سے بس منٹ کیلئے فریج میں رکھ دیں۔ کڑاہی میں تیل کو درمیانی آنچ پر گرم کریں اور چکن نگٹس گولڈن فرائی کر لیں ٹماٹو کیچپ یا مایونیز کے ساتھ پیش کریں۔

چکن ریشمی کباب

اجزاء: مرغی کا قیمہ ایک کلوگرام چنے ایک کھانے کا چمچ، سفید زیرہ ایک چائے کا چمچ، چھوٹی الائچی چھ عدد، ثابت کالی مرچ چار عدد، خشخاش ایک کھانے کا چمچ، پسا ہوا گرم مصالحہ حسب ضرورت، ڈبل روٹی کے سلائس دو عدد، سیخ کباب مصالحہ دو کھانے کے چمچ، خشک دودھ ایک کھانے کا چمچ، فریش کریم ایک پیکٹ، نمک حسب ذائقہ، پسی لال مرچ ایک چائے کا چمچ، ہری مرچ دو عدد، پودینہ آدھی گٹھی تیل حسب ضرورت۔
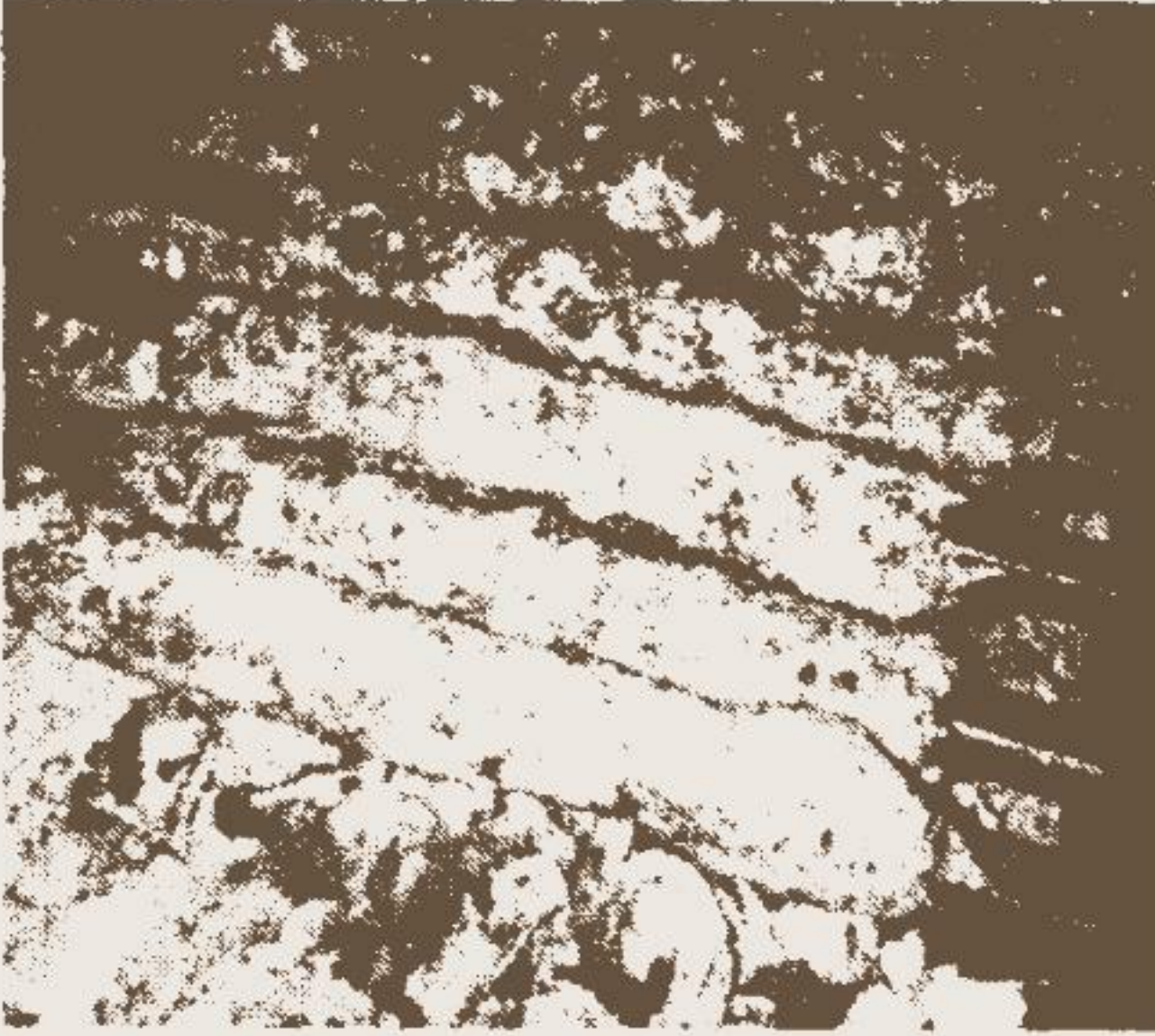
ترکیب: پہلے چنے، سفید زیرہ، چھوٹی الائچی، کالی مرچ اور خشخاش ملا کر اچھی طرح پیس لیں۔ اب مرغی کے قیمے میں پسا ہوا مصالحہ بریڈ سلائس شامل کر کے چوپر میں پیس لیں۔ اس میں چنے کا مکسچر مکس کر دیں۔ اس کے بعد سیخ کباب مصالحہ، خشک دودھ، فریش کریم، نمک، پسی لال مرچ، باریک کٹی ہری مرچ، باریک کٹا ہوا پودینہ اور پسا ہوا کچا پپیتا ملا کر اچھی طرح گوندھیں اور تھوڑی دیر کے لئے رکھ دیں۔ اب انہیں سیخ کباب جیسا بنالیں پھر گرلر کو گرم کر کے ذرا چکنائی لگا کر بنائے ہوئے کباب سینک لیں۔ اس کے بعد برش سے تھوڑا تیل لگا کر کباب نکال لیں۔ آخر میں تیار چکن ریشمی کباب، لیموں والی پیاز اور املی کی چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

بزمِ شاعری

نعت رسول ﷺ

گر مدینے کو جانا ترا ہو ہوا
ساتھ لے جانا میری صلات و ثناء
کہنا آقا سے کردو کرم کی نظر
کب سے بے چین ہے روح جان و جگر
میری پہنچا دو آقا کو یہ التجا
دُور ہوں کہنا آقا در سے ترے
مر نہ جاؤں کہیں تیرے در سے پرے
اتنی کیوں دیر ہوئی حبیبِ خدا
حملہ آور ہے شیطان ایمان پر
کٹ رہے ہیں گناہوں میں شام و سحر
زندگی وسوسوں میں ہے صبح شام
دیکھ کر حال حیرت زدہ ہیں سبھی
ملتے ہیں لوگ بن کر سبھی اجنبی
جب سے در کا ترے ہوگیا ہوں گدا
حال کہنا مرا سارا سرکارؐ کو
بھیج دیجئے دوا اب تو بیمار کو
کون ہے شوق کا آقا تیرے سوا

(شوخ خانوانی۔خانواہن)

غزل

گلوں کی نکہتیں کلیوں کا بانکپن نہ ملا
وہ رونقیں نہ ملیں اور وہ چمن نہ ملا
عدو سمجھ کے جنہیں دوستوں نے گاڑ دیا
نہ جانے کتنے جواں تھے جنہیں کفن نہ ملا
اب اور کیا کرے برباد شوق بربادی
کہ اپنے آپ میں کوئی ہمیں مگن نہ ملا
قدم قدم پہ تو انساں ملے زمانے میں
ہر اک میں حضرت انسان کا چلن نہ ملا
ہمارے دور میں ایسے بھی حادثے گزرے
کسی کا سر نہ ملا اور کسی کا تن نہ ملا
بہت تلاش کیا ہم نے روز و شب نیرؔ
ہمارے دل کی طرح اور کوئی بن نہ ملا

(نیرؔ رضاوی)

غزل

درد کا بج اٹھا دل میں اب ساز ہے
ڈھونڈتی ہوں کہاں میرا ہم راز ہے
کیوں چھپاؤں شب غم میں اپنی بھلا
چشم نم رت جگے کی جو غماز ہے
دھیمی دھیمی صدا آرہی ہے مجھے
چار سو اب میرے تیری آواز ہے
تیری ہر بات کا ہم یقیں کرتے ہیں
تیری گفتار شیریں کا یہ راز ہے
بات ہی بات میں دُکھ عیاں کردیا
یہ بھی عصمت محبت کا انداز ہے

(عصمت اقبال عصمت)

پاکستان و چین

یہ قدرت کی شیرازہ بندی کا شجر ہے
تنا ہے پاکستان' تو چین ثمر ہے
فطرت میں شامل ہے یہ رشتہ اخوت
ہر ایک کے لہو میں یہ مضمر ہے
یہ جسد واحد ہیں' دو نظر میں تو فریب نظر ہے
دو شاخوں میں تقسیم اک شجر ہے
جیسے پھول و مہک کا ہے رشتہ فطرتاً
یہ بھی ویسے ہی بندھن کی نظر ہے
اگر اک ہے خشک سالی کا شکار
تو دوسرا رحمت کا ابر ہے
ہوا جو اک تاریکی سے دوچار اگر
خاطر مدد دوسرا بصورت قمر ہے
حاسدوں کو تو عدیل جل جل کر مرنا ہے
یونہی آباد رہے گا جیسے آباد اب محبت کا شہر ہے
(عدیل الرحمٰن عدیل)

غزل

خوشی کے گیت سناؤ عید آئی ہے
ہنسی لبوں پہ سجاؤ عید آئی ہے
پرندے بولتے ہیں دل کی بات کرتے ہیں
تم اپنا حال سناؤ عید آئی ہے
فضا میں رنگ ہیں اور رنگ دلنشیں ٹھہرے
نظر سے دل میں بساؤ عید آئی ہے
کھلے ہیں پھول چمن میں مہک رہی ہے فضا
دلوں کے رنج مٹاؤ عید آئی ہے
چلو کہ دل کی اداسی کو ختم کرتے ہیں
کنول کو ڈھونڈ کے لاؤ عید آئی ہے
(یاسمین کنول۔ پسرور)

غزل!

مدت سے میرا دل ہے کہ آباد نہیں ہے
ہونٹوں پہ مگر آج بھی فریاد نہیں ہے
آتا ہے خیالوں میں میرے ایک ہی چہرہ
بس اس کے سوا کچھ بھی مجھے یاد نہیں ہے
پھرتے ہیں یہاں سب ہی سہمے ہوئے سے
اس شہر میں جیسے کوئی آواز نہیں ہے
دیکھا ہے اجڑتے ہوئے کتنے ہی گھروں کو
ہے کون جو اس عشق میں برباد نہیں ہے
دل جس کی جدائی میں دھڑکتا ہے سرِشام
وہ عام سا چہرہ ہے پری زاد نہیں ہے
اک لہر سی اٹھتی ہے امتیاز آج بھی دل میں
اس لہر کے اٹھنے کا سبب یاد نہیں ہے
(ایس امتیاز احمد)

غزل

کسی کی عنایتوں نے یہ دن دکھائے ہیں
میرے اپنے بھی یوں پھر سے پرائے ہیں
کھل کے برستا نہیں آج یوں ابر بھی
ہم زمانے کے ہاتھوں سے ستائے ہیں
فریب دنیا ان کا ہے معیار زندگی
حسن والوں نے ہم پہ ستم کئی ڈھائے ہیں
بچھڑ جائیں تو مڑ کے دیکھتا نہیں کوئی بھی
یاروں کی باتوں سے کیا کیا گل کھلائے ہیں
دامن پہ لگے داغ دیکھتا کوئی نہیں جاوید
شرارے بھی پھول بن کے پھر جگمگائے ہیں
(محمد اسلم جاوید)

غزل

ابھی ابھی یہیں تھا جو وہ بے اماں کہاں گیا
جو چپ تھا بولتے ہوئے وہ رازداں کہاں گیا
تلاش میں کسی کی تھا وہ شکل بے بسی کی تھا
وہ خوبرو بجھا بجھا وہ نوجواں کہاں گیا
دیار دل میں دربدر جو دے رہا تھا دستکیں
کوئی صدا نہ کچھ سخن وہ بے زباں کہاں گیا
سوال آئینے سے یہ کیا ہے خود کو دیکھ کر

جو مجھ سا تجھ میں تھا چھپا وہ خوش گماں کہاں گیا
یہ وہم تھا گماں تھا وہ شہر بھر کی جان تھا
چلا تھا اس کے ساتھ جو وہ کارواں کہاں گیا
عزیز تھیں جسے کبھی تیری گلی کی ٹھوکریں
تجھے بھی یہ خبر نہیں وہ قدر داں کہاں گیا
غموں کی بھینٹ چڑھ گیا جو ساجد وفا طلب
کوئی نشان بھی نہیں وہ خونچکاں کہاں گیا
(سعید ساجد)

غزل

خزاؤں سے کوئی شکوہ نہ شکوہ ہے بہاروں سے
ملا ہے آج مجھکو دکھ میرے ہی غمگساروں سے
زمانے کے بدلتے ہی نگاہیں پھیر لیں سب نے
کوئی ایسا تو ہو جو حال پوچھے بے سہاروں سے
کنارے ہی سبب بنتے ہیں اکثر ڈوب جانے کا
کوئی رکھے بھی امید وفا کیسے کناروں سے
میرے نزدیک جب ہوتا نہیں کوئی تیرا سایہ
تو پھر میں بات کر لیتا ہوں دل کی چاند تاروں سے
مجھے وحشی دکھوں کے سائے جب بھی گھیر لیتے ہیں
بلاتا ہے مجھے رانا وہ آنکھوں کے اشاروں سے
(قدیر رانا)

غزل

پھر گلہ درد کو کون جانے یہاں
سنگ خارہ کے مانند ہیں لوگ یہاں
میں تو ننھا سا مرد فرومایہ ہوں
دنیا بنی پھرتی ہے زاہدانہ یہاں
مجھ میں نہیں اتنی جوانمردی اب
کہ بیٹھ کے غم افلاس منائیں یہاں
بشر کے رخسار پر تو مسکراہٹ رقص کرتی ہے
ہمیں نہیں اب ذوق شکر مند یہاں
جس کو دیکھو زیر حجاب نظر آتا ہے
سرک جائے جو پلو مہاجن دکھتے ہیں یہاں

صہبا میں ڈوب کر آوارہ کوئے محبت سا دل
کون تلاش کو کب ہو پلکوں کے قلزم میں یہاں
(ساحل)

غزل

اس طرف رات کا اُجالا ہے
یعنی سورج نکلنے والا ہے
ابن آدم تمہارے کیا کہنے
تم نے بھائی کو مار ڈالا ہے
ڈوب کر عشق کے سمندر میں
میں نے ہر موج کو اچھالا ہے
کیا سناؤں گا آج محفل میں
ہر غزل میں تیرا حوالہ ہے
اپنی آنکھوں میں خواب ہیں نصرت
صرف خوابوں کے در پر تالا ہے
(نصرت عارفین)

غزل

مہجور ہر انجمن ہیں ہم لوگ
اپنے میں جلا وطن ہیں ہم لوگ
جو سبزہ و برگ سے ہو محروم
وہ شبنم بے کیف ہیں ہم لوگ
اے اپنی ہی خلوتوں میں محبوس
شاید تیری انجمن ہیں ہم لوگ
خود اپنے وجود میں مقید
پابستہ بے رسن ہیں ہم لوگ
ہر ذرے میں سامعہ ہے بیدار
کس شخص سے ہم سخن ہیں ہم لوگ
اے عالم رنگ رنگ تخلیق......!
آزردہ جان و تن ہیں ہم لوگ
ہر عہد کی شہریت سے محروم
ہر شہر میں بے وطن ہیں ہم لوگ
(رئیس امروہوی)

غزل

نہ آپ سے حسین ہیں، نہ آپ سے جوان ہیں
مگر وہ پیاری لڑکیاں زیادہ مہربان ہیں
کبھی لباس اور ہوا، کبھی زمیں اور گھٹا
ترے دیار کی رُتیں محبتوں کی جان ہیں
سفر کی بات کیا کہوں کہ میری دھوپ چھاؤں سے
گزرنے والی بستیاں ہواؤں کے سمان ہیں
منڈیروں سے صحن تک دیئے جلا کے سوگئیں
کبوتروں کی جوڑیاں عجیب مہمان ہیں
تری بہار کا شجر ہرا بھرا رہے مگر
وہ ڈالیا بھی کھول دے جو میرا سائبان ہیں
(رئیس فروغ)

غزل

جادہ ہستی کے جب بھی پیچ و خم یاد آئے ہیں
بندہ پرور آپ کے لطف و کرم یاد آئے ہیں
ہو رہا ہے خیر سے دار و رسن کا اہتمام
بعد اک مدت کے شاید ان کو ہم یاد آئے ہیں
تجربوں کا عکس ہے آئینہ احساس میں
شادمانی کی تمنا کی تو غم یاد آئے ہیں
بارہا مجبوریوں کی زد میں آیا عشق بھی
ایک دور ایسا بھی گزرا ہے وہ کم یاد آئے ہیں
جب کوئی چنگیز اٹھا ہے بن کے طوفان ستم
خستگان جور کو اہل قلم یاد آئے ہیں
(راغب مرادآبادی)

غزل

سنگ ہیں ناوک و دشنام رسوائی ہے
یہ تیرے شہر کا انداز پذیرائی ہے
کتنا پھیلے گا یہ اک وصل کا لمحہ آخر
کیا سمیٹو گے کہ اک عمر کی تنہائی ہے
کچھ تو یادوں سے ملا، سنگ ملامت ہی سہی
کس نے اس شہر میں یوں داد ہنر پائی ہے
ایک پتھر ادھر آیا ہے تو اس سوچ میں ہوں
میری اس شہر میں کس کس سے شناسائی ہے
شوق جس دن سے چراغاں ہے خیالوں کی گلی
جشن سا ہے تنہائی سی تنہائی ہے
(رضی اختر شوق)

غزل

میں کیسے مان لوں ہوگا وہ ناخدا میرا
جو مجھ سے پوچھنے آیا ہے خود پتا میرا
میں اپنے آپ کو پہچاننے سے قاصر ہوں
یہ کس کے جسم پہ چہرا لگا دیا میرا
وہ خود پرست تھا، اپنی انا کا تاجر تھا
بغیر بھاؤ، لہو بیچتا رہا میرا
طلوع شام کا آنچل نہیں یہ طوفاں ہے
ابھی جلا تھا کہ بجھنے لگا دیا میرا
وہ اپنی زیست کا اک پل نہ دے سکا مجھ کو
جو کہہ گیا تھا رہے گا بس اب سدا میرا
نہ میرے ہاتھ سے چھوٹا مری صدا کا ہاتھ
یہ میرا عزم جنوں تھا، کہ حوصلہ میرا
ہیں دائیں بائیں پس و پیش میرے دیواریں
اک اور سمت میں در کھول اے خدا میرا
عیاں یہ وقت کی پیلاہٹوں سے راز کھلا
تمام عمر کا تنہا سفر ہوا میرا
(رشیدہ عیاں)

غزل

حریم دل میں اترتی ہیں آیتیں اس کی
لہو بھی کرنے لگا ہے تلاوتیں اس کی
قریب تھا تو رگ جاں بھی قریب رہا
بچھڑ کے، تابہ فلک ہیں مسافتیں اس کی
ہوئی ہے شاخ دل و جاں پہ خواہشوں کی نمو
لہو کے پھول کھلائیں گے قربتیں اس کی
اسی امید پہ خوابوں کی فصل بوئی ہے

کہ کشت دل میں اگیں گی بشارتیں اس کی
خیال، رنگ، ہوا، چاندنی، شفق، خوشبو
ہزار رنگ میں دیکھوں میں صورتیں اس کی نمو
پذیر ہوں، مجھ کو نہ چھوڑا اے دھرتی
مری جڑوں کو ابھی ہیں ضرورتیں اس کی
لہوتو جم گیا آنکھوں کی پتلیوں میں شکیب
دکھائیں عکس بھلا کیا بصارتیں اس کی
(راغب شکیل)

غزل

آنکھوں سے پی رُت مستانی ہوگئی
جام سے پینا رسم پرانی ہوگئی
کچھ انکے بھی اکھڑ پن کا ہے پتہ
تھوڑی ہم سے بھی نادانی ہوگئی
وقت سحر یہ کون چمن میں آ گیا
شرم سے شبنم پانی پانی ہوگئی
دل کا آنگن خوشبو سے مہکا دیا
یاد کسی کی رات کی رانی ہوگی
واعظ نے ساقی سے کرلی دوستی
تو بڑی دلچسپ کہانی ہوگئی
آنکھوں سے پی رُت مستانی ہوگئی
جام سے پینا رسم پرانی ہوگئی
(راہی کانپوری)

غزل

وہ آگ جس کا شرارہ نفس کی حد میں ہے
اب ایک لاش ہے جو جسم کی لحد میں ہے
جنوں ہے ذہن کی شفاف روشنی کا نام
ہزار طرح کی پیچیدگی خرد میں ہے
بغیر دیکھے کھنچا جارہا ہوں ان کی طرف
عجیب چیز ہواؤں کے خال و خد میں ہے
خموشیوں کی صداؤں کا شب پہ ہے پہرہ
کہ یہ عدد بھی تو اپنے عدد کی زد میں ہے
کوئی بھی دل کے تقاضے دبا نہیں سکتا
یہ عیب وہ ہے جو ہر ایک نیک و بد میں ہے
(رضا ہمدانی)

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف بمعہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم، پسندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کوپن پُر کر کے سیارہ ڈائجسٹ: 244 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی تصویر منسلک کریں

نام:........ تعلیمی قابلیت:........
عمر:........ پسندیدہ شاعر:........
پسندیدہ غزل/نظم:........
مشاغل:........ تاریخ پیدائش/برج:........
شادی شدہ/غیر شادی شدہ:........ پتہ:........
ای میل:........

نوٹ: اپنی پسند ناپسند، شاعری کی ابتدا، مزاج، اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجئے۔

"حکایت کہانی"

دو مردوں کی کہانی......وہ دونوں مختلف طریقوں سے زندگی گزارنے پر یقین رکھتے تھے اور خود کو صحیح ثابت کرنا چاہتے تھے!

● محمد سلیم اختر

جارج نے بڑی مشکلوں اور پانچ سو پاؤنڈ خرچ کر کے کرونشا کو رضامند کرلیا اور معاملہ رفع دفع ہوگیا لیکن کچھ ہی دنوں بعد جب جارج کو یہ خبر ملی کہ جوں ہی کرونشا نے وہ چیک بھنایا اسی دن وہ ٹام کے ساتھ مونٹے کارلو چلا گیا اور وہاں دونوں نے خوب عیش کیے۔ تو جارج غصے سے پاگل ہوگیا۔

بچپن میں ہی مجھے بہت سی حکایتیں زبانی یاد کرادی گئی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ ان حکایتوں سے وابستہ نصیحتیں اور سبق بھی اچھی طرح سمجھا دیئے گئے تھے۔ ان حکایتوں میں ایک کہانی ایک چیونٹی اور ٹڈی کی بھی تھی جس سے یہ سبق ملتا تھا کہ محنت بھی رایگاں نہیں جاتی اور اس کا پھل ضرور ملتا ہے۔ جبکہ کاہلی کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے۔

میں معذرت کے ساتھ یہ حکایت ان بڑوں کے لئے بھی دہرا دینا چاہتا ہوں جنہیں یہ حکایت یاد ہوگی اور جس سے حاصل ہونے والے سبق کو بھی انہوں نے یاد رکھا ہوگا کہ ایک چیونٹی گرمیوں کے زمانے میں سارا موسم کھانے کا سامان جمع کرتی رہتی تاکہ سردیوں میں کام آسکے۔ جبکہ ان ہی دنوں ایک ٹڈی ایک ہری بھری شاخ پر بیٹھی سورج کی تمازت

سے لطف اندوز ہوتی رہتی ہے۔ سردیاں آ جاتی ہیں اور چیونٹی آرام سے اپنے گھر میں جا بیٹھتی ہے لیکن ٹڈی خالی ہاتھ اوپر اوپر پھرتی رہتی ہے آخر کار وہ چیونٹی سے بھیک مانگتی ہے لیکن چیونٹی اسے یہ جواب دیتی ہے۔

''تم گرمیوں میں کیا کر رہی تھی؟''

''میں تمام دن اور رات گاتی رہتی تھی۔''

''تم گاتی رہی...... ٹھیک ہے تو جاؤ اور اب بھی جا کر گاؤ اور ناچو!!

مشکل یہ ہے کہ میں کبھی اس کہانی سے اچھا تاثر نہیں لے سکا۔ میری ہمدردیاں ہمیشہ اس ٹڈی کے ساتھ رہیں۔ میں ہمیشہ چیونٹیوں کو اپنے پاؤں تلے روند دیا کرتا تھا اور عجیب بات ہے کہ میرے دل میں دور اندیشی کے لئے کچھ ناپسندیدگی سی پیدا ہو گئی تھی۔

ایک روز جب میں نے جارج کو ریستوران میں تنہا بیٹھے کھانا کھاتے دیکھا تو میں اس حمایت کو یاد کئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے آج تک کسی شخص کو اتنا رنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ساری دنیا کا بوجھ اس کے کندھوں پر ہو۔ مجھے اس سے ہمدردی تھی اس لئے اچانک خیال آیا کہ شاید اس کے بدقسمت بھائی نے پھر اس کے لئے کوئی مشکل پیدا کر دی ہوگی۔ میں نے اس کے پاس جا کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''کیسے ہیں آپ؟''

''حال ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیا پھر ٹام سے کوئی بات ہوئی ہے؟''

''ہاں اسی کی بات ہے'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''تم اس سے چھٹکارہ حاصل کر لو ناں تم نے اس کیلئے سب کچھ کر لیا۔ اب تو تمہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہ بالکل نکما اور بے کار آدمی ہے۔''

میرے خیال سے ہر خاندان میں اس طرح کا ایک نہ ایک نکما ضرور پیدا ہوتا ہے۔ ٹام بھی پچھلے بیس برس سے جارج کے حواس پر سوار تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا آغاز بہت اچھے انداز میں کیا تھا۔ اس کا اپنا کاروبار تھا۔ شادی کے بعد دو بچے بھی ہو چکے تھے۔ اس کے خاندان کی بہت عزت کی جاتی تھی اور اس میں کسی قسم کے شک و شبے کی گنجائش نہ تھی کہ ٹام بھی باعزت پیشہ اختیار کر کے کامیاب زندگی گزارے گا۔ لیکن ایک روز بغیر کسی اطلاع کے ٹام نے اعلان کر دیا کہ اس کا دل کام کرنے کو نہیں چاہتا اور شادی اس کے مزاج اور طبیعت کے خلاف ہے اور وہ زندگی کا بھرپور لطف اٹھانا چاہتا ہے۔

اس نے کسی کی بھی بات پر کان نہ دھرے اور اپنا کاروبار اور بیوی بچوں کو بھی چھوڑ دیا۔ اس کے پاس کچھ پیسہ تھا جس کے بل پر اس نے یورپ کے مختلف شہروں میں دو سال تک عیش کی زندگی بسر کی۔ اس کی کارستانیوں کی اطلاع اس کے رشتہ داروں تک بھی مختلف ذرائع سے پہنچتی رہی اور وہ بے چارے خاموشی سے برداشت کرتے رہے۔ یقیناً ٹام بہت اچھا وقت گزار رہا تھا لیکن اس کے عزیز سوچتے تھے کہ جب اس کی تمام دولت ختم ہو جائے گی تب وہ کیا کرے گا۔ بہت جلد انہیں معلوم ہو گیا کہ ٹام نے قرض لینا شروع کر دیا ہے۔ اس کی شخصیت میں ایسا سحر تھا کہ لوگ بھی اسے قرض دینے سے انکار نہیں کر پاتے تھے۔ دوستوں سے اسے مستقل آمدنی ہو رہی تھی اور پھر وہ دوست بنانے میں تو ماہر تھا ہی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ اپنی ضروریات پر رقم خرچ کرنا بہت اکتا دینے والا کام ہے جبکہ اصل خرچ تو وہ ہوتا ہے جو

عیاشیوں پر کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنے بھائی جارج پر انحصار کرتا تھا۔ وہ جارج کو اپنی پروقار شخصیت سے متاثر نہیں کرسکتا تھا۔ اس لئے کہ خود سنجیدہ طبیعت کا مالک تھا اور اس پر ایسی سطحی چیزیں اثر نہ کرتی تھیں لیکن جارج نے ایک آدھ بار ٹام کے وعدوں پر بھروسا کرتے ہوئے اسے بڑی بڑی رقمیں اس یقین کے ساتھ دی تھیں کہ وہ اپنی زندگی دوبارہ اور اچھے انداز میں شروع کرے گا لیکن ان رقموں سے ٹام نے ایک خوبصورت سی موٹر سائیکل اور کچھ قیمتی زیورات خرید لئے جارج کو جب حالات نے یہ یقین دلایا کہ ٹام میں مستقل مزاجی نہیں پیدا ہوسکتی تو اس نے اپنا ہاتھ روک لیا اور ٹام نے بلاتردد جارج کو بلیک میل کرنا شروع کردیا۔ ایک باعزت اور مشہور وکیل بھلا یہ کیونکر برداشت کرسکتا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی اس کے پسندیدہ ریستوران میں بیرے کے فرائض انجام دے یا پھر اس کے کلب کے باہر وہ ٹیکسی لئے کھڑا رہے۔ ٹام کا کہنا تھا کہ کسی ریستوران میں کام کرنا یا ٹیکسی چلانا اس کے نزدیک باعزت پیشے کا درجہ رکھتے ہیں لیکن اگر جارج اسے چند سو پونڈ دے کر ان کاموں سے دُور رکھنا چاہتا ہے تو وہ بخوشی اپنے خاندان کی نیک نامی کے لئے یہ کام چھوڑنے پر راضی ہے۔ چنانچہ جارج نے یہ پیسے ادا کردیئے۔

ایک بار ٹام جیل میں جاتے جاتے بچا۔ جارج کو سخت ذہنی اذیت ہوئی۔ اس نے پورے معاملے میں ذاتی طور پر دلچسپی لی۔ اس نے ٹام پر لاپروائی خودغرضی اور بے حسی کا الزام عائد کیا۔ ٹام نے اس سے پہلے کبھی بے ایمانی یا دھوکے بازی نہیں کی تھی اور جارج کو یقین تھا کہ اگر مقدمہ قائم ہوگیا تو ٹام کو سزا ضرور ملے گی۔ جس شخص سے ٹام نے دھوکہ کیا تھا اس کا نام کرونشا تھا۔ وہ ٹام سے بدلہ لینے پر بضد تھا۔ وہ سارا معاملہ عدالت میں لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا کیونکہ اس کے نزدیک ٹام ایک کمینہ شخص تھا اور اسے سزا ضرور ملنی چاہئے تھی۔ جارج نے بڑی مشکلوں اور پانچ سو پاؤنڈ خرچ کرکے کرونشا کو رضامند کرلیا اور معاملہ رفع دفع ہوگیا لیکن کچھ ہی دنوں بعد جب جارج کو یہ خبر ملی کہ جوں ہی کرونشا نے وہ چیک بھنایا اسی دن وہ ٹام کے ساتھ مونٹے کارلو چلا گیا اور وہاں دونوں نے خوب عیش کئے۔ تو جارج غصے سے پاگل ہوگیا۔

بیس سال تک ٹام ریس، جواء اور دوسری عیاشیوں میں مگن رہا۔ وہ شہر کی حسین لڑکیوں کے ساتھ اعلیٰ سے اعلیٰ ہوٹلوں میں دیکھا جاتا اور اس کے لباس سے شاہانہ انداز جھلکتا۔ اس کی عمر چالیس سال سے اوپر تھی لیکن وہ اپنی خوش لباسی اور زندہ دلی کی وجہ سے کسی کھلنڈرے نوجوان سے کم دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لوگ بخوبی واقف تھے کہ اس کا ساتھ کسی فائدے کا سبب نہ ہوگا۔ لیکن پھر بھی وہ سوسائٹی میں نہایت مقبول تھا۔ خود میں بھی اسے پسند کرتا تھا۔ بارہا اس نے مجھ سے بھی قرض مانگا تھا اور میں نے بارہا پچاس ساٹھ پونڈ دے کر اس سے اپنی جان چھڑائی تھی۔ مجھے قرض دیتے ہوئے ہمیشہ یہ قلق ہوتا کہ یہ پیسے اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے۔ ٹام ہر ایک سے واقف تھا اور ہر کوئی ٹام کو جانتا تھا۔ آپ ممکن ہے اس کی تعریف نہ کرتے لیکن اس کی شخصیت ایسی تھی کہ آپ اسے پسند کئے بغیر نہ رہتے۔

بے چارہ جارج عمر میں ٹام سے صرف ایک سال بڑا ہونے کے باوجود ساٹھ سے زیادہ کا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں بہت کم چھٹیاں کی تھیں۔ وہ ہر صبح نو بجے دفتر میں

موجود ہوتا اور چھ بجے سے پہلے نہ جاتا۔ وہ بہت ایماندار، محنتی اور پڑھا لکھا شخص تھا۔ وہ اپنی اکلوتی بیوی کا وفادار تھا۔ جارج نے کبھی اس سے بے وفائی کا تصور نہ کیا۔ اس کی چاروں بیٹیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور وہ جارج کو ایک مثالی باپ مانتی تھیں۔ جارج نے اپنی آمدنی کا ایک انتہائی حصہ بچانا شروع کر دیا تھا کیونکہ پچپن سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد وہ ریٹائر ہو جانا چاہتا تھا تاکہ کسی پرسکون جگہ پر مکان لے کر رہے اور زندگی کے بقیہ دن آرام سے گالف کھیلتے اور باغبانی میں گزارے۔ اس کی زندگی بے داغ تھی وہ خوش تھا کہ بوڑھا ہو رہا تھا کیونکہ اس کے ساتھ ٹام بھی بوڑھا ہو رہا تھا...... وہ اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہتا۔

''ٹھیک ہے جب تک ہم چھوٹے رہے ٹام کے لئے بھی سب کچھ ٹھیک تھا۔ اب میں بوڑھا ہوں چار سال بعد ٹام بھی پچاس سال کا ہو جائے گا۔ پھر اس کے لئے زندگی اتنی آسان نہ ہوگی۔ اس وقت تک میرے پاس میرے بچائے ہوئے تیس ہزار پاؤنڈ ہوں گے۔ پچھلے پچیس سال سے میں یہ کہتا رہا ہوں کہ ٹام کی زندگی کا انجام بڑا خراب ہوگا۔ اب ہم دیکھیں گے کہ وہ کیا کرتا ہے۔ اب معلوم ہو جائے گا کہ محنت کام آتی ہے یا صرف ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنا''

بے چارہ جارج!

مجھے اس سے ہمدردی تھی اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس وقت جب میں جارج کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ٹام نے اس کے لئے کون سی نئی مصیبت کھڑی کر دی ہے جس پر اس کا موڈ اتنا خراب ہے۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ اب کیا ہوگا؟''

میں بُری سے بُری خبر سننے کو تیار تھا۔ شاید ٹام پولیس کے ہتھے چڑھ ہی گیا تھا۔ جارج کو بولنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔

''تمہیں اس بات سے تو انکار نہیں ہوگا کہ میں پوری زندگی محنتی اور ایماندار رہا ہوں۔ ایک باوقار اور باعزت زندگی گزاری ہے......؟ ایک طویل جدوجہد کے بعد اب میں ریٹائرمنٹ کے بارے میں اس اطمینان سے سوچ سکتا ہوں کہ میں نے کچھ پس انداز کر رکھا ہے۔ اُف میں نے کتنی محنت کی ہے۔ میں نے تو دن رات ایک کر دیئے۔!!

''بالکل ٹھیک ہے۔''

''تم اس سے بھی انکار نہیں کرو گے کہ ٹام کاہل نکما اور وبالِ جان بنا رہا اور شاید اب تک اسے انصاف سے جیل میں ہونا چاہئے تھا؟!!''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' میں نے تائید کی۔

جارج کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ ''چند ہفتے پہلے اس نے ایک بڑھیا سے منگنی کر لی تھی۔ اس عورت سے جو اس کی ماں کے برابر تھی۔ اور اب وہ بڑھیا اپنی تمام جائیداد اور دولت ٹام کے نام چھوڑ کر مر گئی ہے۔ پچاس لاکھ پاؤنڈ نقد، ایک کشتی، لندن میں ایک کوٹھی اور ایک ساحلی ''بنگلہ!''

جارج نے یہ کہتے ہوئے اپنی بھینچی ہوئی مٹھی زور سے میز پر دے ماری۔

''یہ انصاف تو نہیں ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے یقین کرو یہ زیادتی ہے۔!!''

مجھ سے نہ رہا گیا اور میں جارج کا چہرہ دیکھ کر زور زور سے قہقہے لگانے لگا، جارج مجھ سے ناراض ہو گیا۔ البتہ ٹام اکثر مجھے عظیم الشان دعوتوں میں مدعو کرتا رہتا ہے بلکہ بعض اوقات مجھ سے چھوٹی موٹی رقم بھی ادھار مانگ بیٹھتا ہے۔

''ضرورتاً نہیں محض عادتاً۔''

محمد سجاد میرانی

دُعا کے بعد وہ کہنے لگے مرحوم کے ساتھ میری بہت اچھی دوستی تھی۔ میں جب بھی گاؤں آتا وہ میرے گھر آتے رات دیر تک میرے ساتھ رہتے اور کبھی کبھار تو رات میرے ساتھ گزارتے۔ ابھی مخدوم صاحب نے بات پوری نہیں کی تھی کہ ایک دیہاتی بدتمیزی کے ساتھ اٹھا اور کہنے لگا مخدوم صاحب بکواس بند کریں مرنے والی میری بیوی تھی۔

طنز مزاح سے بھرپور دلچسپ کرداروں پر مبنی شگفتہ تحریر

دودو گجر

آج ہم جن عظیم شخصیات کے بارے میں لکھ رہے ہیں ان میں پہلی شخصیت پنجابی فلموں کے معروف فلم ساز ہدایت کار کہانی کار موسیقار...... ایک اور کار ملا کے بے کار بھی کہہ سکتے۔ جناب عبدالودود عرف دودو گجر ہیں۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ وہ بیک وقت فلم ساز کہانی کار ہدایت کار موسیقار اور اداکار بھی تھے۔ شخصیت بھی بڑی دلکش تھی ٹھگنا قد، چپٹی ناک، ہنستے تو ایک آنکھ بند کر لیتے۔ دودو گجر بچپن سے محنتی تھے ان کے والد بھی مشہور چور اور رسہ گیر تھے۔ دودو صاحب صرف 12 سال کے تھے کہ ان کے والد صاحب کو ایک جھوٹے مقدمے میں بقول دودو صاحب کے گرفتار کر لیا گیا۔ حالانکہ وہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ بہر حال ان نامساعد حالات میں بھی دودو صاحب

نے ہمت نہ ہاری۔ ایک اُستاد کی صحبت میں رہ کر لوگوں کی جیبیں کاٹنے لگے لیکن یہاں بھی ظالم پولیس نے ایک دن پکڑ لیا اور اچھی خاصی درگت بنا دی۔ آپ خود سوچیں ایک بارہ سال کا معصوم جیب کترہ اور ظالم پولیس۔ بہرحال دودو صاحب نے بڑی مشکل سے جان چھڑالی اور ایک بس اڈے پر جھاڑو مارنے لگے۔ بس اڈے پر جھاڑو مارتے مارتے وہیں پر ہی مختلف بسوں کے لئے ہاکری کرنے لگے اور پھر ترقی کرتے گئے۔ پہلے ایک چھوٹا سا چائے کا ہوٹل کھولا پھر آبادی میں دودھ کی دکان کھولی اور پھر کچھ سال بعد ایک اچھے علاقے میں دودھ کی دکان کے ساتھ فلم انڈسٹری کا حصہ بن گئے۔ حالانکہ کچھ لوگ کہتے ہیں ان کی وجہ سے فلم انڈسٹری کو نقصان ہوا وہ جاہل اور مافیا ٹائپ آدمی ہیں اور ان کی فلم میں کہانی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی لیکن یہ بات ان کے دشمنوں نے اُڑائی ہوگی پہلی بات تو یہ کہ وہ چٹے ان پڑھ اور جاہل نہیں تھے تین چار جماعتیں پڑھے ہوئے تھے۔ دوسری بات کہ وہ مافیا ٹائپ آدمی تھے یہ بھی غلط اگر وہ تین چار سر پھرے ساتھ رکھتے تھے اور اسلحہ بھی تو وہ صرف اپنی حفاظت کے لئے ورنہ بہت رحم دل آدمی تھے۔ ان کی رحم دلی کا ایک واقعہ تو بہت مشہور تھا کہ ایک مرتبہ اپنی جیپ میں اپنے کارندوں کے ساتھ جارہے تھے کہ ان کی گاڑی ایک گھوڑے تانگے سے ٹکرا گئی۔ جس میں گھوڑا اور کوچوان دونوں زخمی ہوگئے۔ دودو صاحب فوراً جیپ سے اُترے اور گھوڑے کو گولی ماردی کہ میں کسی زخمی کو تڑپتا ہوا نہیں دیکھ سکتا اس کے بعد انہوں نے کوچوان سے پوچھا کہ تم زخمی تو نہیں مگر کوچوان سر پھٹنے اور ٹانگ زخمی ہونے کے باوجود لنگڑا کر بھاگ گیا اور کہا جی میں زخمی نہیں ہوں ورنہ شاید دودو صاحب اس کی کچھ "مدد" کرتے اور اس کے زخموں کا مداوا کرتے اور تیسری بات کہ ان کی فلم میں کہانی نہیں ہوتی یہ بھی غلط ہے۔ ایک مرتبہ میں شام کے وقت ان سے ملنے گیا کچھ ہوش میں تھے کہنے لگے ایک فلم کا نام اور کہانی ذہن میں ہے، سنو۔ میں نے عرض کیا میں ہمہ تن گوش ہوں۔ کہنے لگے فلم کا نام ہے جوڑی گجراں دی اور کہانی اس طرح ہے کہ ایک گجر ہوتا ہے اور دوسرا بھی گجر ہوتا ہے۔ دونوں کی لڑائی ہوتی ہے۔ میں نے کہا کس بات پر؟ کہنے لگے بس اس کو چھوڑو لڑنے کے لئے وجہ ضروری نہیں بس دونوں لڑتے ہیں اور جیسا کہ ہر فلم میں ہوتا ہے ایک مر جائے گا۔ ایک بچ جائے گا جو مر جائے گا وہ ولن ہوگا اور جو بچ گیا وہ ہیرو۔

دودو صاحب کی فلم کی ایک خاص بات یہ ہوتی تھی کہ فلم دیکھنے والے آخر تک نہیں سمجھ سکتے تھے کہ فلم کا ہیرو کون ہے اور ولن کون کیونکہ سب کے حلیے ایک جیسے ہوتے تھے۔ گھنگریالے بال، گلے میں بڑے تعویز مختلف رنگوں کی قمیض اور ہاتھوں میں گنڈاسے۔ فلم انڈسٹری میں اتنی خدمات کے باوجود دودو صاحب کی فلموں کو سینما نہیں ملتے تھے جس کی وجہ سے ان کی اکثر فلمیں سی ڈی پر ہی ریلیز ہوتیں مگر بدذوق لوگوں کو ان کے مقام کا کیا پتہ۔ لوگوں نے ان کی فلمیں سینما پر دیکھنا چھوڑیں اس کے بعد سی ڈی پر ریلیز ان کی فلموں کو رد کردیا جس سے دودو صاحب بہت رنجیدہ ہوئے اور فلمی دنیا کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کرلیا اور اس طرح فلم انڈسٹری کا عظیم نگینہ فلمی دنیا سے خفا ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ فلم انڈسٹری پر رحم کرے۔

ہمارے مخدوم دین محمد صاحب ان سیاستدانوں میں سے تھے جنہوں نے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کی۔ ضلع کونسل کے الیکشن سے

لے کر ایم این اے بننے تک بہت سے نشیب و فراز دیکھے مثلاً جب وہ ضلع کونسلر کا الیکشن لڑے تھے تب ان کا گھر صرف گاؤں میں تھا وہ بھی صرف دو تین کمرے پکے اور باقی دو تین کمرے جس میں بھینسوں کا ایک چھوٹا سا باڑا ملا کے کچے تھے پھر جب وہ صوبائی سیٹ جیتے تو لاہور میں ایک بڑی کوٹھی کے مالک بن گئے پھر جب وفاقی سیٹ انہوں نے جیتی تو اسلام آباد میں اس سے بھی بڑی کوٹھی کے مالک بن گئے۔ اس سب کے باوجود انکسار کا مجسمہ تھے۔ اپنے علاقے کے غریب لوگوں سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ فرماتے تھے ان لوگوں کی وجہ سے تو میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ البتہ علاقے میں ترقیاتی کام نہ کرواتے۔ جس کی وجہ وہ یہ بتاتے کہ اگر علاقے میں پکی سڑکیں اور سکول بن گئے تو لوگوں میں تکبر آ جائے گا وہ سینہ تان کے چلیں گے اور تکبر اللہ کو ناپسند ہے اس لئے یہ لوگ جتنے غریب ہونگے اتنا ان میں انکساری پیدا ہوگی جو اللہ کو پسند ہے۔

اس کے باوجود کچھ جاہل دیہاتیوں نے اپنے بچوں کو دوسرے گاؤں میں پڑھایا اور کالج یونیورسٹی سطح تک لے گئے۔ ان میں ایک لڑکی تھی اور دو لڑکے۔ چار سال بعد جب مخدوم صاحب علاقے میں آئے...... مخدوم صاحب الیکشن جیتنے کے بعد دوسرے الیکشن کے قریب ہی علاقے میں آتے تھے جس کا ان کے مخالفین نے جواز بنایا کہ وہ عوام اور اپنے علاقے کے لوگوں کو بھول جاتے ہیں حالانکہ وہ بھولتے نہیں تھے۔ اسمبلی میں جا کے اپنے علاقے کے لئے ترقیاتی فنڈ منظور کراتے یہ الگ بات ہے کہ نسیان کے مرض کے باعث علاقے میں ترقیاتی کام کرانا بھول جاتے تھے حالانکہ یہ ان کی مجبوری تھی کیونکہ نسیان میں انسان کو کچھ یاد نہیں رہتا۔ البتہ الیکشن سے پہلے وہ اپنے علاقے کے عوام کے ساتھ ہوتے اور اپنے علاقے کے لوگوں کا خیال بھی رکھتے۔ میں نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھا کہ وہ الیکشن کے دنوں میں دو دو تین تین دیگیں چاول کی بنواتے اور باورچی کو حکم دیتے ان میں تھوڑے سے چنے بھی ملا دو۔ کبھی کبھی تو کسی غریب دیہاتی کے ساتھ بیٹھ جاتے ایک نوالہ ہاتھ میں لیتے فوٹوگرافر کو اشارہ کرتے وہ تصویر بناتا پھر مخدوم صاحب وہ کھانے کے بجائے واپس رکھ دیتے اور کہتے یہ غریبوں کا حق ہے جسے میں نہیں کھا سکتا اور پھر دوسرے دن اخبارات میں خبر تصویر کے ساتھ چھپتی کہ مخدوم صاحب غریبوں کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے۔ لوگوں کے دکھ سکھ میں بھی شریک ہوتے ایک مرتبہ الیکشن مہم کے دوران ان کو پتہ چلا کہ برابر کے گاؤں میں کسی کا انتقال ہوگیا ہے۔ انہوں نے سوچا چلو تعزیت بھی کر لیتے ہیں اور اسی بہانے ووٹ بھی مانگ لیں گے۔ وہاں پہنچے، دعا کے بعد کہنے لگے مرحوم کے ساتھ میری بہت اچھی دوستی تھی۔ میں جب بھی گاؤں آتا وہ میرے گھر آتے رات دیر تک میرے ساتھ رہتے اور کبھی کبھار تو رات میرے ساتھ گزارتے۔ ابھی مخدوم صاحب نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ ایک دیہاتی بدتمیزی کے ساتھ اٹھا اور کہنے لگا مخدوم صاحب بکواس بند کریں مرنے والی میری بیوی تھی۔ اس طرح نہ وہ تعزیت صحیح طریقے سے کر سکے اور نہ ووٹ مانگ سکے تھے۔ کردار کے بھی غازی تھے جس لڑکی نے یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کی تھی اس کے والد مخدوم صاحب کو چاچا کہتے تھے ایک الیکشن مہم کے دوران لڑکی کے والد نے کہا چاچا جی میری بیٹی نے گریجویشن مکمل کر لی

ہے وہ آپ کو سلام بھی کرنا چاہتی ہے اور کسی سرکاری نوکری کے لئے عرض کرنا چاہتی ہے۔ مخدوم صاحب نے اجازت دے دی کہ سلام کرنے کیلئے آجائے پہلے ہم دیکھ تو لیں۔ جب وہ لڑکی سلام کرنے آئی تو مخدوم صاحب نے لڑکی کو دیکھتے ہی کہا ایسے چاند چہرے کو نوکری کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے آگے پیچھے نوکروں کی فوج ہوگی، ہم اس سے شادی کا اعلان کرتے ہیں۔ لڑکی کے غریب والد نے کہا چاچا جی خدا کا خوف کریں اپنی عمر دیکھیں اور بچی کی عمر دیکھیں۔ کہنے لگے خدا کے خوف سے شادی کر رہا ہوں ورنہ ایسے اٹھا لے جاؤں تو مجھے کون روکے گا۔ بہرحال دوسرے لوگوں نے بھی لڑکی کے والد کو سمجھایا کہ مخدوم صاحب کی بات ماننے میں ہی تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی بہتری ہے تب جا کے غریب دیہاتی کے عقل میں بات بیٹھی اور اس طرح ایک گھنٹے کے اندر ہی مخدوم صاحب کی خوشی اور مرضی سے نکاح ہوگیا اور اس لڑکی کو جیپ میں ڈال کے لے گئے۔ سنا ہے لڑکی رو رہی تھی۔ بھائی شادی میں تو سبھی لڑکیاں روتی ہیں اس میں مخدوم صاحب کا کیا قصور؟

آخر تک مخدوم صاحب کی صحت اور ہاضمہ دونوں اچھے رہے۔ تمیں سال تک علاقے کا فنڈ کھاتے رہے کبھی ڈکار بھی نہ لیا۔ مخدوم صاحب جب تک رہے اتحاد و اتفاق کا درس دیتے رہے لیکن ان کے بعد ان کے تینوں بیٹے اتفاق نہ رکھ سکے اب ایک پی پی میں ہے دوسرا ن لیگ میں اور تیسرا چھوٹا بیٹا تحریک انصاف میں ہے۔ شاید اس نااتفاقی میں ہی ان کا بھلا ہو۔

”اثر انگیز تشہیر“

ایک نابینا کسی عمارت کی سیڑھیوں پر بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا۔ اُس نے اپنے قدموں کے پاس ٹوپ کے ساتھ ایک تختی رکھی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا ”میں نابینا ہوں براہ کرم میری مدد کریں“۔
کسی تخلیقی تشہیر کار کا وہاں سے گزر ہوا تو وہ رُک گیا اور نابینا کے ٹوپ کا جائزہ لینے لگا۔ جس میں صرف چند سکے پڑے ہوئے تھے۔ تشہیر کار نے اس ٹوپ میں چند سکے اور ڈال دیئے۔ اُس نے نابینا کی اجازت کے بغیر تختی اُٹھائی اور اُسے پلٹ کر اس پر ایک پیغام لکھ دیا۔ پھر اُس نے وہ تختی دوبارہ نابینا کے قدموں کے پاس رکھ دی اور وہ وہاں سے چلا گیا۔
اس سہ پہر وہ تخلیقی تشہیر کار دوبارہ وہاں سے گزرا تو اُس نے دیکھا کہ نابینا کا ٹوپ سکوں اور نوٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ نابینا نے قدموں کی آہٹ سے اس تشہیر کار کو پہچان لیا اور اس سے سوال کیا کہ ”کیا وہ وہی شخص ہے جس نے اسکی تختی پر کوئی دوسرا پیغام لکھ دیا تھا؟“
ساتھ ہی اُس نے جاننا چاہا کہ اس نے کیا پیغام تحریر کیا تھا۔
تشہیر کار نے جواب دیا ”میں نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی تھی جو سچ نہ ہو۔ بس میں نے تمہاری لکھی ہوئی بات ذرا مختلف انداز میں تحریر کر دی تھی“ پھر وہ مسکراتا ہوا اپنی راہ ہولیا۔
نابینا کو پتہ نہ چل سکا کہ تختی پر وہ نئی تحریر کیا ہے۔ تشہیر کار نے یہ جملہ تحریر کیا تھا ”آج موسم بہار ہے رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے ہیں اور میں انہیں دیکھ نہیں سکتا“۔
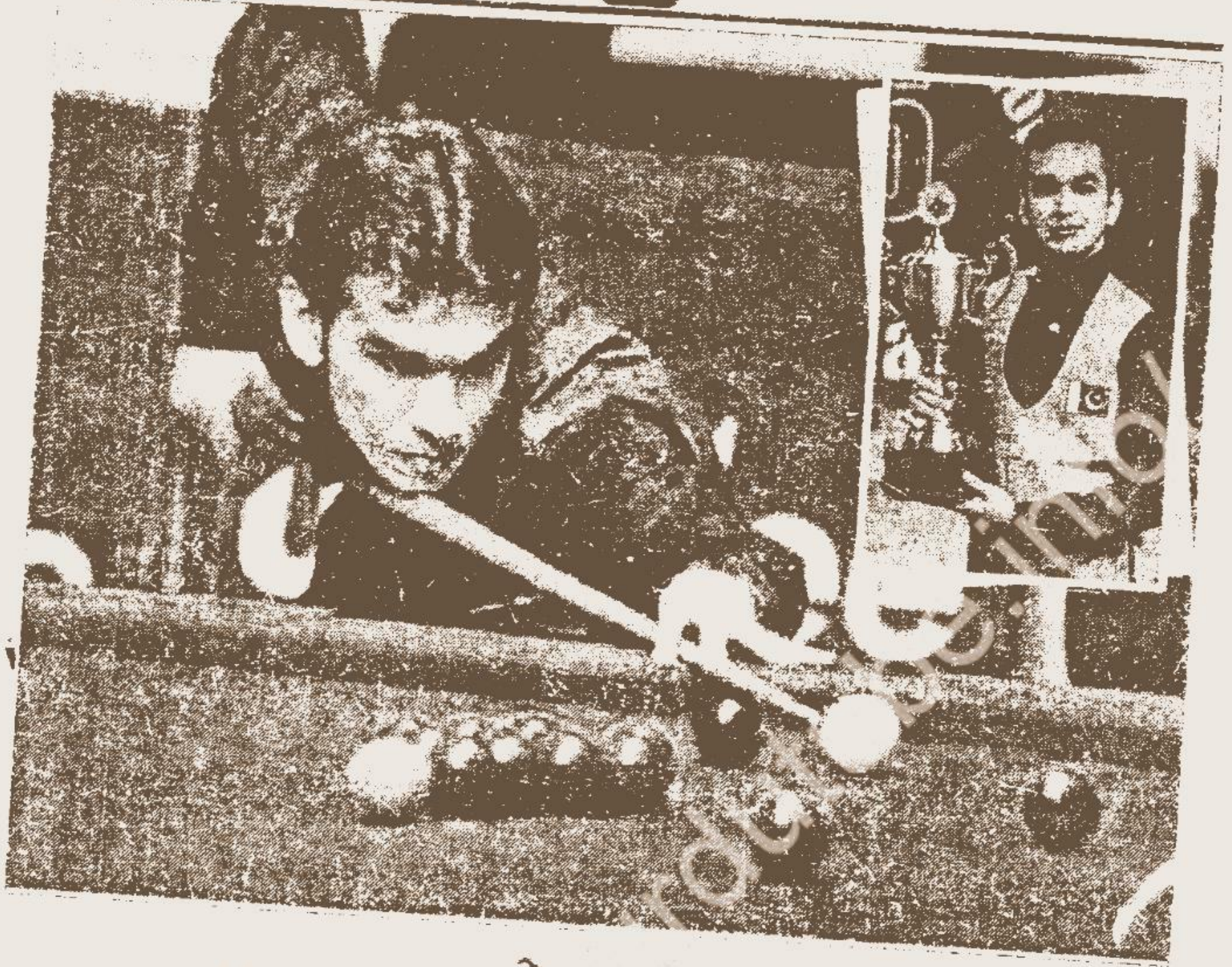
"اگلا ہدف ورلڈ چیمپئن بننا ہے"

حمزہ اکبر

• محمد یعقوب بھٹی

پاکستان کے قابل فخر سپوت حمزہ اکبر نے 17 سال بعد پاکستان کو ایشین سنوکر چیمپئن بنادیا۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو عزت دیتا ہے جو محنت کرتے ہیں!

سنوکر کا شمار نو سپورٹس میں ہوتا ہے۔ پاکستان نے اس کھیل میں ورلڈ اور ایشین ٹائٹل جیت رکھے ہیں۔ پہلے محمد یوسف نے بعد محمد آصف نے ورلڈ اور ایشین مقابلوں میں ملک کا نام روشن کیا، اب حمزہ اکبر نے ایشین چیمپئن بن کر ملک وقوم کا سر فخر سے بلند کردیا ہے۔ حمزہ ابھرتے ہوئے نوجوان کھلاڑی ہیں۔ گزشتہ دو تین سال سے قومی اور بین الاقوامی سطح کے ایونٹس میں پاکستان کا نام روشن کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو عزت دیتا ہے جو محنت کرتے ہیں۔ حمزہ اکبر کا بھی شمار ایسے نوجوان کھلاڑیوں میں ہوتا ہے جو محنت پر یقین رکھتے ہیں۔ سنوکر کے کھیل میں جہاں پاکستانی کھلاڑیوں کی محنت شامل ہے وہیں پر پاکستان

بلیئرڈ اینڈ سنوکر ایسوسی ایشن کے عہدیداران کو بھی اس بات کا کریڈٹ جاتا ہے جن کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر ہمارے کھلاڑیوں کو نمائندگی کا موقع مل رہا ہے۔

سنوکر کا کھیل پاکستان کے ہر گلی محلے میں کھیلا جاتا ہے ٹیلنٹ کی کمی نہیں ہے تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستانی نوجوان کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ حکومت پاکستان کی جانب سے کافی عرصہ سے اس کھیل میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی رہی ہے۔ امید ہے کہ اب یہ سلسلہ شروع ہوجائیگا۔ حمزہ اکبر سے پہلے محمد آصف ورلڈ اور ایشین مقابلوں میں پاکستان کا نام روشن کرچکے ہیں اب حمزہ اکبر نے پاکستان کا نام روشن کرنا شروع کیا ہے۔ حمزہ اکبر نے گزشتہ دنوں ایشین سنوکر چیمپئن شپ میں شرکت کی اور شاندار کھیل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹائٹل پاکستان کے نام کیا۔ پاکستانی کیوسٹ حمزہ اکبر نے ایشین سنوکر کا فائنل جیت کر 17 سال بعد پاکستان کو ایشین سنوکر کا چیمپئن بنا دیا جس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں ملائیشیا کے دارالحکومت کوالالمپور میں کھیلی جانے والی 31 ویں ایشین سنوکر چیمپئن شپ کے فائنل میں حمزہ اکبر کا مقابلہ بھارت کے پنکج ایڈوانی سے ہوا۔ پنکج ایڈوانی سنوکر کے کھیل میں ایک وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں حمزہ اکبر ایک نوجوان کھلاڑی ہیں۔ فائنل مقابلے میں حمزہ نے جس اعصاب شکن مقابلے میں کامیابی سمیٹی وہ قابل تعریف اور قابل تحسین ہے۔ بیسٹ آف 13 فریمز پر مشتمل فائنل مقابلہ میں حمزہ اور پنکج کے درمیان کانٹے کا مقابلہ ہوا۔ 22 سالہ حمزہ نے سخت مقابلے کے بعد چھ کے مقابلے میں سات فریمز سے کامیابی حاصل کر کے ایشین سنوکر کا تاج اپنے سر پر سجایا۔ حمزہ کی کامیابی کا سکور 28-66 ' 56-32 ' 64-38 ' 55-34 ' 17-68' 56-44 ' 56-63 ' 66-39 ' 32-67 ' 34-62 ' 10-85 '54-56 اور 56-55 رہا۔ اس سے قبل حمزہ اکبر نے فائنل مقابلہ میں میزبان ملائیشیا کے محمد رضا کو شکست دے کر فائنل تک رسائی حاصل کی تھی۔ اس سے قبل 1998ء میں پاکستان کے محمد یوسف نے ایشین سنوکر چیمپئن شپ جیتنے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ حمزہ اکبر کا کہنا ہے کہ اگر ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تو ان کا اگلا ہدف ورلڈ چیمپئن بننا ہے۔ نوجوان کھلاڑی گزشتہ چند سالوں سے جیسی کارکردگی دکھا رہا ہے اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ عالمی ٹائٹل جیت سکتا ہے۔ پاکستان بلیئرڈ اینڈ سنوکر ایسوسی ایشن کے صدر عالمگیر شیخ کا کہنا تھا کہ ہم نے اپنی مدد آپ کے تحت اس کھیل کو پاکستان میں ترقی دینا شروع کی تھی اب اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ ہمارے کھلاڑی ایشیا اور ورلڈ میں پاکستان کا نام روشن کرسکتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومتی سپورٹ کے بغیر کوئی کھیل ترقی نہیں کرسکتا سیاست سے باہر نکل کر اگر کھیلوں کی پروموشن کیلئے کام کیا جائے تو اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پاکستانی کھلاڑیوں میں بہت زیادہ ٹیلنٹ موجود ہے۔ قومی کھلاڑیوں کو ایشین چیمپئن بننے پر سات ہزار امریکی ڈالر انعامی رقم اور ٹرافی دی گئی ہے جب کہ پاکستان بلیئرڈ اینڈ سنوکر ایسوسی ایشن کے نائب صدر جاوید کریم نے حمزہ اکبر کی

شان دار کارکردگی پر تین لاکھ روپے کی انعامی رقم کا اعلان کیا ہے امید ہے کہ اب حمزہ اکبر پر انعامات کی بارش ہونا شروع ہو جائے گی جس میں ان کا اپنا ادارہ نیشنل بینک، حکومت پاکستان اور پنجاب حکومت کو بھی اپنا حصہ ڈالنا چاہیے۔۔

حمزہ اکبر کے کیریئر پر ایک نظر

حمزہ اکبر 12 نومبر 1993ء میں فیصل آباد میں پیدا ہوئے۔ 22 سالہ نوجوان کھلاڑی نے 2008ء میں سنوکر کے کھیل کا آغاز کیا۔ ایک سال بعد ہی 2009ء میں نیشنل جونیئر انڈر 21 میں شرکت کا موقع ملا جس میں نوجوان کھلاڑی نے فائنل کھیلنے کا اعزاز حاصل کیا۔ پہلے ہی قومی سطح کے ایونٹ میں حمزہ اکبر کی شان دار کارکردگی اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ نوجوان کھلاڑی بے شمار صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ حمزہ اکبر کا تعلق پنجاب سے ہے۔ انھوں نے 2011ء میں منعقد ہونے والی چھٹی جونیئر چیمپئن شپ میں شرکت کی اور [illegible] اس وقت حمزہ اکبر کی عمر صرف 18 سال تھی۔ 2013 [illegible] 21 [illegible] علاوہ 38 ویں [illegible] چیمپئن شپ کا فائنل [illegible] جونیئر انڈر 21 [illegible] رسائی حاصل [illegible] 2014ء [illegible]

نمایاں رہی۔ پنجاب جونیئر 2014ء کا ٹائٹل جیتنے کے علاوہ چھٹی نیشنل جونیئر انڈر 21 سنوکر چیمپئن شپ کے سیمی فائنل مرحلے تک رسائی کے علاوہ 39 ویں نیشنل سنوکر چیمپئن شپ میں فائنل کھیلنے کا اعزاز حاصل کیا اور رنر اپ رہے۔ حمزہ اکبر نے 2013ء میں بین الاقوامی مقابلوں میں پاکستان کی نمائندگی کرنا شروع کی۔ آئی بی ایس ایف ورلڈ انڈر 21 سنوکر چیمپئن شپ میں شرکت کی۔ چین کے شہر بیجنگ میں منعقد ہونے والے چیمپئن شپ میں پاکستان کی نمائندگی کی جس میں ایشین ٹیم ایونٹ میں چھٹی پوزیشن پر رہے۔ 2013-14 ایشین انڈر 21 سنوکر چیمپئن شپ میں شرکت کی جس میں ایشین جونیئر 9 [illegible] رہے۔ 2013ء میں ہی پاکستان نے 29 ویں ایشین سنوکر چیمپئن شپ کی میزبانی کے فرائض انجام دیئے جس میں حمزہ اکبر نے تین انٹرنیشنل مقابلوں میں پاکستان کی نمائندگی کی اور تینوں کے سیمی فائنل تک رسائی حاصل کر کے براؤنز میڈل کے حق دار قرار پائے جن میں بھارت کے شہر چندی گڑھ میں 15 ویں ایشین انڈر 21 سنوکر چیمپئن شپ، پاکستان کے شہر کراچی میں دوسری ایشین ٹیم ایونٹ اور تیسری 6 ریڈ بال سنوکر چیمپئن شپ اور پہلی قطر اکیڈمی 6 ریڈ بال سنوکر چیمپئن شپ شامل ہیں۔ حمزہ اکبر کا ٹورنامنٹ کا سب سے بڑا بریک 137 جبکہ پریکٹس میں 147 رہا ہے۔

چکنے پات

• نیوپی کیلی

روز نے ریلنگ کے قریب سیڑھی کے نیچے دیکھا۔ اس کی بہن کا سکڑا ہوا بے حس و حرکت جسم آخری سیڑھی کے پاس پڑا تھا۔ روز کے ہاتھ سے چھڑی چھوٹ کے نیچے گر گئی۔ وہ تیزی سے زینے کی طرف لپکی جیسے ہی اس نے پہلے زینے پر قدم رکھا، پھسل کے ڈگمگاتی ہوئی گری اور لڑھکتی ہوئی نیچے آ رہی۔ اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔

دونوں بہنیں بالائی منزل کے ایک کمرے میں بیٹھی کھڑکی سے پڑوس کی دنیا کا نظارہ کر رہی تھیں یہ ان کا پسندیدہ کمرہ تھا۔ یہاں دھوپ خوب آتی تھی۔ وہ دونوں بوڑھی اور کمزور تھیں۔ اچانک باورچی خانے میں چائے دانی کی سیٹی بجی، باورچی خانہ نیچے تھا۔ روز نے زینیا سے کہا، ''زینیا! تم یہاں سے نہ ہلنا میں لپک کر نیچے جاتی ہوں اور گرم گرم چائے بسکٹ اور مکھن لے کر ابھی آتی ہوں۔ زینیا نے کندھوں پر شال جمائی، روز چھڑی اٹھا کے آہستہ کمرے سے نکلی اور زینے اترنے لگی۔ زینے پر قالین نہیں تھا۔

''دس منٹ بعد روز کمرے میں داخل ہوئی زینیا بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگی تھی، روز نے آہستگی سے اسے پکارا ''زینیا! زینیا! چائے کا وقت ہو گیا ہے۔

''میں اپنی آنکھوں کو ذرا سکون پہنچا رہی تھی۔''

زینیا نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ٹرے کی طرف دیکھا۔ روز ٹرے لے کر کھڑکی کے پاس رکھی ہوئی میز کے قریب گئی۔ زینیا بولی، ''سورج کی روشنی میری آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔''

دونوں اپنی کرسیاں میز کے قریب کھسکا کے بسکٹ کھانے لگیں روز نے چینی کی نازک پیالیوں میں چائے انڈیلی پھر چائے دانی رنگین ٹی کوزی سے ڈھانک دی۔ روز اور زینیا دو مرجھائے ہوئے پھولوں کے مانند کھڑکی کے پاس بیٹھی چائے کی چسکیاں لیتی رہیں۔ باہر کی دنیا ان کی نظروں کے سامنے تھی۔ اچانک زینیا نے ممیائی ہوئی آواز میں کہا 'اوہ روز! ذرا دیکھو وہ سب وہاں جمع ہیں۔'' چائے اس کے کپڑوں پر گرتے گرتے بچی۔ ''وہ بچے'' کچھ دیر بعد اس نے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ کارل ہے۔ غالباً تیرہ سال کا ہوگا یا چودہ سال کا۔ ایک بیل کی طرح بڑھ رہا ہے۔''

''ہاں، بالکل جانور کی طرح'' روز نے کہا۔ ''وہ سب چھوٹے چھوٹے جانوروں کی طرح ہیں، دیکھو کیسے دوڑ رہے ہیں۔''

''گلہریوں کی طرح۔'' زینیا نے اپنی بہن کی تائید کی۔ ''یا خرگوشوں کی طرح۔''

''کارل کتنی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔'' زینیا بول پڑی۔ غالباً وہ اپنی بہن کی خواہش سن کر خوف زدہ ہونا نہیں چاہتی تھی۔ ''مائیک جیکسن بھی صرف بارہ سال کا ہے مگر بالکل ایک مرد معلوم ہوتا ہے۔''

''گیارہ سال کا ہے۔'' روز نے تصحیح کی۔

اپنی بوڑھی ہڈیوں کو گرمی پہنچانے کے لئے انہوں نے چائے کی دوسری پیالی پی۔ اب وہ خود کو پرسکون محسوس کر رہی تھیں سامنے لان میں کھیلتے ہوئے بچے ان کے لئے تسکین کا باعث تھے وہ سوچ رہی تھیں کہ زندگی وقت کی پابند نہیں ہوتی اگرچہ وقت تبدیل ہو چکا ہے لیکن بعض چیزیں قطعی نہیں بدلیں۔ مثال کے طور پر بچے یا مثال کے طور پر کھیل۔ زینیا نے اپنی آنکھوں پر عینک ٹھیک سے جماتے ہوئے سوال کیا۔ ''وہ لڑکا کون ہے؟''

''کون سا؟ کہاں؟''

''وہ چھوٹا سا لڑکا۔ وہی جو چیری کے درخت کے نیچے کھڑا ہے۔ اس کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ کھیل رہی ہے اور جوتوں پر مٹی کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔''

روز نے بھی عینک ٹھیک کی ''وہ تو کیبل خاندان کا لڑکا ہے کیبل خاندان دوسرے بلاک میں رہتا ہے اس نے پرانا مارش ہاؤس خرید لیا ہے کیا تمہیں یاد نہیں ہے؟''

''بے چارے مسٹر کیبل۔'' زینیا نے افسوس سے کہا۔

''وہ ہسپتال سے گھر واپس آ گئے ہیں۔''

''تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''جو لڑکا اپنا سودا سلف لاتا ہے کل میں نے اس سے پوچھا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ مسٹر کیبل تیزی سے صحت یاب ہو رہے ہیں ان کے سر کی ٹوٹی ہوئی ہڈی اچھی ہوتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر یہی کہتے ہیں۔''

''مارش ہاؤس بہت پرانا ہو گیا ہے چیزیں ٹوٹتی پھوٹتی رہتی ہیں دیمک زدہ لکڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی رہتی ہیں۔''

روز نے ایک لمحے کے لئے اپنی بہن کے تبصرے میں سچائی کے علاوہ کچھ اور نکتوں پر غور کیا پھر بولی۔ ''آج کل کے اکثر لوگ ہمارے زمانے کے لوگوں کی طرح باسلیقہ نہیں ہوتے۔ اگر مسٹر کیبل کے گھر میں گلی سڑی لکڑیاں ڈیڈی دیکھ لیتے تو فوراً مرمت کی پیش کش کرتے، وہ ایک ہتھوڑی اور چند کیلیں لے جاتے اور سفید لکڑیوں کا صندوق اس طرح نہ گرتا تم تو جانتی ہو۔''

''ایسا معلوم ہوتا ہے، مسٹر کیبل کا لڑکا، کارل کے کلب میں شامل ہو گیا ہے۔'' زینیا نے کہا۔ ''ہاں یہی معلوم ہوتا ہے وہ دیکھو کارل اپنا بازو اس کے کندھے پر رکھے ہوئے ہے۔ مسٹر کیبل کا لڑکا چند ہفتوں تک تنہا

تنہا سا رہا۔ اس کے ساتھ کوئی نہیں کھیلتا تھا۔“

”کیرن تو کھیلتی تھی۔“

”کیرن کسی شمار ہی میں نہیں ہے تمہیں تو معلوم ہے۔“

زینیا اپنی پیالی اُٹھائے ہوئے کھل کھلا کر ہنس پڑی ”میں سمجھ رہی ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ لڑکیاں نہ لڑکوں کا کھیل کھیلتی ہیں نہ ان کے کلب میں شامل ہوتی ہیں۔“

”وہ دیکھو وہ کیرن دکھائی دے رہی ہے وہ کارل کی طرف دوڑتی ہوئی آ رہی ہے۔“

زینیا نے تبصرہ کیا۔ ”وہ تو چیخ رہی ہے۔“

”آؤ“ روز نے ٹرے پر نظر ڈالی اور کھڑی ہوگئی۔ پھر کھڑکی کھول کے اس نے کیرن کو آواز دی کیرن ایک چھوٹی لڑکی تھی۔ اس کی پیشانی پر بھورے بھورے بال لٹک رہے تھے اس نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا۔ روز نے جھک کر زور سے کہا۔ ”بسکٹ بچی بسکٹ گھر کا بنا ہوا مکھن بھی ہے‘ آؤ ہمارے پاس آؤ۔“

کیرن نے کارل کی طرف دیکھا۔ کارل نے اس سے کچھ کہا اور اکھڑ پن سے ایک طرف چل دیا۔ یہی حرکت مسٹر کیمبل کے لڑکے اور اس کے ساتھی مائیک جیکسن نے بھی کی۔ کیرن تنہا رہ گئی ظاہر تھا کہ وہ اب تک ان کے حلقے میں پوری طرح شامل نہیں ہوئی ہے روز پھر کھڑکی پر جھک گئی۔ وہ بچی کا احساس بیگانگی ختم کرنا چاہتی تھی‘ اس کی دل جوئی کرنا چاہتی تھی سارا مقصد یہی تھا۔

کیرن نے رُکے رُکے قدم پھاٹک کی طرف بڑھائے اور مڑ کر کارل کی طرف دیکھا پھر تیزی سے پھاٹک کی طرف آنے لگی۔ روز نے اپنی بہن کی جانب مڑ کے دیکھا پھر اس نے نیچے کیرن کو آواز دی ”سامنے کا دروازہ کھلا ہوا ہے سیدھی اندر چلی آؤ پھر زینے سے اوپر آ جانا ہم دونوں تمہارے انتظار میں ہیں۔“

نیلی آنکھوں والی‘ پروں جیسے بکھرے ہوئے بالوں والی کیرن دروازے پر نمودار ہوئی۔ روز نے اس کا بازو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کیرن نے یہ ظاہر کیا کہ اس نے اس کی اس شفقت کا کوئی نوٹس نہیں لیا ہے۔ زینیا نے کہا۔ ”آؤٹ کیرن! تھوڑی سی چائے پی لو۔“

”زینیا!“ روز متوحش انداز میں چلائی۔ ”ابھی تو یہ بچی ہے۔“ اسے فوراً خیال آیا کہ کیرن کہیں اس کی بات کا برا نہ مان جائے۔ اس نے کہا۔ ”نیچے باورچی خانے کے فریج میں ٹھنڈا دودھ رکھا ہے بین کے اوپر الماری میں ایک صاف گلاس بھی ہے جاؤ‘ تم خود جا کر پی لو خود پی لو گی نا؟“

کیرن نے اثبات میں سر ہلایا اور کمرے سے چلی گئی۔

چند منٹ بعد روز او زینیا نے اس کی چاپ سنی وہ زینے چڑھ رہی تھی زینیا نے روز کا استخوانی بازو زور سے بھینچا۔ ”وہ دودھ ہر طرف گرا دے گی۔“

”شش“ روز نے آ[illegible] کہا ”کیرن کی قربت کے مقابلے میں دودھ کی کیا حیثیت ہے اس کے علاوہ بچی کو دل جوئی کی ضرورت بھی ہے ہمارا مقصد یہی تو ہے۔“ زینیا خاموش بیٹھی رہی۔

کیرن کمرے میں داخل ہوئی اس نے اطلاع دی ”میں نے دودھ بالکل نہیں گرایا۔“

”ہاں‘ ہاں ہمیں معلوم ہے‘ تم نے دودھ بالکل نہیں گرایا۔“ روز بولی۔ ”آؤ میرے قریب بیٹھ کے بسکٹ پر مکھن لگاؤ اور کھاؤ۔“

کیرن کو بسکٹ کھانے میں دشواری ہو رہی تھی مکھن کچھ پگھل گیا تھا بسکٹ سے بار بار گر جاتا تھا وہ بسکٹ منہ کی طرف اٹھاتی تو تھوڑا سا بسکٹ پلیٹ میں گر جاتا گرا ہوا ٹکڑا روز نے اٹھا کے اسے اپنے ہاتھ سے کھلایا۔ کیرن بولی۔ ”یہ پھسلنے والی چیز ہے۔“ اس نے دونوں بہنوں کی طرف کچھ سہم کے دیکھا کہ کہیں وہ اس کی نادانستہ غلطی پر سزا نہ دے دیں۔

روز اور زینیا ایک لمحے کے لئے گنگ ہو کر رہ گئیں ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا گفتگو کی

جائے ایک بچی سے بڑوں والی گفتگو نہیں کی جا سکتی تھی کہ کاروبار کیسا چل رہا ہے یا دنیا کی موجودہ صورت حال کیا ہے' کیرن کی دنیا ان کی دنیا سے مختلف تھی پھر کیا' کیا جائے؟ آخر زینیا نے گفتگو کا موضوع چن لیا۔ وہ بسکٹ کی طرف اشارہ کر کے کیرن سے بولی۔ ''کیا اس کا مزا اچھا ہے؟''

''ہاں اچھا ہے۔''

روز نے بھی ہمت کر کے کہا۔ ''مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ مسٹر کیبل اب روبہ صحت ہیں وہ بے چارے بہت بڑے حادثے سے دوچار ہوئے تھے۔''

''کارل کہتا ہے کہ لوگ حادثات سے اکثر دوچار ہوتے رہتے ہیں۔'' کیرن بسکٹ کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں' وہ صحیح کہتا ہے۔'' روز نے اتفاق کیا۔ ''حادثات تو ہوتے ہی ہیں لیکن اتنے زیادہ حادثات قابل رحم ہیں۔''

''وہ کہتا ہے'' کیرن نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''لوگوں کو اور ہوشیار رہنا چاہئے یہ انہی کی غلطی ہوتی ہے، کارل یہی کہتا ہے۔''

''تمہیں کارل پسند ہے؟'' زینیا نے پوچھا۔ اس کے ذہن میں اینڈریو نامی ایک شخص کی تصویر گھوم گئی اینڈریو سے وہ کسی زمانے میں محبت کرتی تھی۔

''بالکل سبھی بچے اسے پسند کرتے ہیں۔'' کیرن نے کہا ''کارل ٹھنڈے دل و دماغ کا لڑکا ہے۔''

''مجھے تو وہ دوسرے بچوں ہی کی طرح لگتا ہے۔'' زینیا نے چائے کی چسکی لی۔

روز نے اپنی بہن کو تنبیہی نظر سے دیکھا۔ ''کارل اپنے بھائی کی کمی شدت سے محسوس کرتا ہوگا۔ مجھے تو اس کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے وہ ننھا بچہ کتنا اچھا اور خوش اخلاق تھا۔''

''وہ تو کافی دن پہلے مرا تھا اور......'' کیرن نے کہنا شروع کیا۔

''اتنے زیادہ دن تو نہیں ہوئے۔'' روز اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھی۔ ''پچھلے اگست ہی کی تو بات ہے۔''

''ہاں' اور اب فروری ہے۔'' کیرن نے کہا۔

''کارل کا چھوٹا بھائی۔'' زینیا سوچتے ہوئے بولی۔ ''کیڑے مکوڑے مارنے والا زہر پی کے مر گیا تھا۔ شیشی پر لیبل نہیں تھا۔''

''اور مائیک جیکسن کے میپل روڈ والے چچا ایک پہاڑی چوٹی سے گر پڑے تھے اور مس جیرا کے جو پرائمری سکول میں پڑھاتی ہیں' وہ......''

''انہیں غالباً دھیان نہیں رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہی ہیں۔'' کیرن نے تبصرہ کیا۔

''ہاں۔'' روز نے کہا ''لوگوں کا کہنا ہے' ان کی کار سڑک کے کنارے پڑے ہوئے ملبے سے ٹکرا کر بالکل تباہ ہو گئی۔''

''وہ بے چاری خود بھی تقریباً تباہ ہو گئیں۔'' زینیا نے کہا۔

''بہتے دار کرسی میں بیٹھی رہتی ہے لیکن کارل کی ماں کا مرنا اتنے برسوں کا سب سے بدترین حادثہ تھا۔ دہشت ناک قطعی دہشت ناک اس کے نہانے کے ٹب میں بجلی دوڑ گئی تھی۔ ذرا سوچئے تو کتنا خوفناک منظر ہوگا۔''

''بہت خوف ناک۔'' روز نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ نہاتے وقت اس نے ٹب کے کنارے ریڈیو رکھ چھوڑا تھا۔ مجھے حادثے کی خبر ملی تھی تو میں نے سوچا تھا کاش ٹب کیروسین کا ہوتا۔''

''کیروسین کیا ہوتا ہے؟'' کیرن نے پوچھا۔

''مٹی کا تیل جسے لوگ لیمپ وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں' میرا مطلب ہے' استعمال کرتے تھے۔ یہ پٹرول کی طرح ایک سیال ہوتا ہے بس اسے آگ دکھاؤ اور یہ......''

''جل اٹھتا ہے؟'' کیرن بے صبری سے بولی۔

''ہاں پیاری بچی' فوراً جل اٹھتا ہے لیکن اب کبھی کبھی میں اس معاملے پر غور کرتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے

کہ کیروسین سے بھی حادثے ہو سکتے ہیں لیکن چھوڑو ہمیں اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں یہ پریشان کرنے والی باتیں ہیں ہمیں کسی خوش گوار موضوع پر بات کرنی چاہئے کارل تمہارا محبوب ہے کیرن؟" روز نے پوچھا۔

"محبوب کا کیا مطلب ہے؟"

روز ایک لمحے کے لئے گنگ رہ گئی۔ وہ کیرن کو کیرن کی زبان میں کس طرح سمجھائے؟"اس کا مطلب ہے اوہ' بوائے فرینڈ یعنی وہ تمہارا محبوب ہے۔" کیرن نے منہ بنایا"بولو بھی۔" روز نے ہنستے ہوئے اصرار کیا۔"اقرار کرلو میں نے کئی بار دیکھا ہے تم اسے تکتی ہو۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں' کارل ایک اچھا لڑکا ہے جب بھی وہ مجھ سے ملتا ہے بہت ادب اور شائستگی سے بات کرتا ہے۔"

"وہ میرا بوائے فرینڈ نہیں ہے۔" کیرن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔"بچی! روز نے افسردہ لہجے میں کہا۔"تم رو کیوں رہی ہو؟ کیوں' کیا بات ہے؟"

"کارل مجھے اپنے کلب میں شامل نہیں کرتا۔" کیرن تقریباً رندھی ہوئی آواز میں بولی۔"وہ کہتا ہے اس کے کلب میں صرف لڑکے شامل ہو سکتے ہیں کیونکہ لڑکے لڑکیوں سے زیادہ طاقت ور ہوتے ہیں وہ کہتا ہے لڑکیاں تو کلب میں داخلے کا امتحان تک پاس نہیں کر سکتیں۔ لڑکوں کے مقابلے میں ان کی جرأت اور برداشت کم ہوتی ہے۔"

جرأت اور برداشت؟ دونوں بہنیں چونک پڑیں لیکن انہوں نے ایسا ظاہر کیا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ روز نے پوچھا۔"کیا کارل تمہیں اعزازی رکن بھی نہیں بنا سکتا کیرن؟ اعزازی رکن بننا بھی مناسب رہے گا۔" کیرن کے استفسار پر روز کو یہ وضاحت کرنی پڑی کہ اعزازی رکن کسے کہتے ہیں۔

"ہر صورت میں ابتدائی امتحان پاس کرنا ضروری ہے۔" کیرن نے اپنے رخسار اور ہونٹ سے مکھن صاف کرتے ہوئے کہا۔

روز نے بتایا۔"جب میں کالج میں تھی میں نے سماجی بہبود کے شعبے میں داخلے کے لئے ابتدائی امتحان دیا تھا مجھے ایک مضحکہ خیز ہیٹ پہن کر بہت سے قصبوں میں جانا پڑا تھا اور......

کیرن نے اس کی بات کاٹ دی۔"کارل کے کلب میں شامل ہونے کے لئے یہ چیزیں نہیں کرنی پڑتیں۔"

"پھر کیا کرنا پڑتا ہے؟ روز نے دریافت کیا۔

"میں بتا نہیں سکتی۔" کیرن نے سرگوشی کی۔"یہ کلب کا راز ہے۔"

"لیکن تم نے تو کہا تھا کہ تم کلب کی رکن نہیں ہو۔ یہ اگر کلب کا راز ہے تو تمہیں رکن نہ ہونے کے باوجود کیسے معلوم ہو گیا؟"

کیرن نے ایک لمبی سانس لے کے دونوں ہاتھ گود میں رکھ لئے اور جلدی جلدی کہنے لگی۔"میں کارل سے ہمیشہ کہتی تھی کہ وہ مجھے اپنے کلب میں شامل کرلے۔ میں اس سے پوچھتی رہی میں نے کئی دفعہ پوچھا آخر اس نے مجھے ابتدائی امتحان کے متعلق بتا دیا لیکن میں آپ کو نہیں بتاؤں گی اس لئے کہ ......" اس کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔

روز نے زینیا کی طرف دیکھا انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں طے کرلیا کہ موضوع تبدیل کردیا جائے پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور موضوع منتخب کرتیں کیرن بول پڑی۔"میں غسل خانے جاؤں گی۔" کیرن نے اچانک کہا۔

"اوہ!" روز نے کہا۔

"اوہ" زینیا نے دہرایا پھر بولی۔"نیچے ہال میں دائیں طرف جو دوسرا دروازہ ہے وہیں ہے غسل خانہ ہاتھ دھونے کے لئے بیسن میں صابن بھی رکھا ہوا ہے۔"

کیرن نے پوچھا کہ کیا وہ ایک اور بسکٹ مکھن کے ساتھ لے سکتی ہے!لیکن تم تو غسل خانے جارہی ہو۔" زینیا بدحواس ہو کر تقریباً چیختی ہوئی بولی۔

"میں غسل خانے میں بھی کھاتی ہوں۔"

"تو لے لو" روز نے اس سے نظر چراتے ہوئے کہا۔

کیرن بسکٹ پر بہت سا مکھن جما کر چلی گئی۔

زینیا اپنی بہن کی طرف جھک کے سرگوشی میں بولی۔ "کیرن کے لئے کارل کے کلب میں شمولیت کی خواہش سوقیانہ ہے۔ اسے گھر میں رہنا چاہئے اور ایک گھریلو لڑکی بننے کی کوشش کرنی چاہئے۔"

"نہیں' یہ سوقیانہ بات نہیں ہے۔" روز نے کہا۔ "بچوں کو اپنی دنیا میں ایک دوسرے سے ملنے جلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالغ لوگ ان پر حکم جماتے رہتے ہیں یا انہیں نظرانداز کردیتے ہیں اس لئے بچوں کو ایک دوسرے کی خواہش ہوتی ہے اور اپنے خفیہ کلبوں کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"شاید تم صحیح کہہ رہی ہو۔" زینیا ہنسنے لگی۔

"میں بالکل صحیح کہہ رہی ہوں اوہ' دیکھو کچھ لڑکے چاقو سے کھیل رہے ہیں۔"

"وہ وہ بے چارے اپنا چاقو انجیر کے درخت پر پھینک کے نشانہ لگا رہے ہیں۔" معاً کارل اور دوسرے لڑکوں نے روز کی طرف دیکھا' روز نے ہاتھ ہلایا' جواب میں لڑکوں نے بھی ہاتھ ہلائے اسی لمحے ایک تیز اور باریک چیخ ابھری روز اپنی کرسی میں اکڑ کر رہ گئی اور تیز تیز سانس لینے لگی۔

"یہ کیرن کی چیخ ہے۔" زینیا اپنی کرسی سے کھڑی ہوئی اور لڑکھڑا کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"ٹھہرو' میں بھی چلتی ہوں۔" روز زور سے بولی لیکن زینیا کمرے سے نکل چکی تھی۔

روز کرسی سے اٹھی اور اپنی چھڑی اٹھا کے کمرے سے نکلی' کیرن اب بھی چیخ رہی تھی لیکن آواز غسل خانے سے نہیں آرہی تھی۔ روز نے محسوس کیا کہ آواز پہلی منزل کے کسی حصے سے آرہی ہے۔ وہ زینے کی طرف بڑھی زینہ نیچے ہال کی طرف جاتا تھا۔ زینے تک پہنچنے سے قبل ہی اس نے ایک اور چیخ سنی۔ یہ کیرن کی چیخ نہیں تھی پھر دفعتہً وہ چیخ کوئی چیز دھڑ دھڑ گرنے کی شور میں ڈوب گئی۔ شور پورے گھر میں گونج گیا۔

روز نے ریلنگ کے قریب پہنچ کے نیچے دیکھا۔ اس کی بہن کا سکڑا ہوا بے حس و حرکت جسم آخری سیڑھی کے پاس پڑا تھا۔ اب پورے مکان میں خاموشی چھا چکی تھی روز کے ہاتھ سے چھڑی چھوٹ کے نیچے گر گئی۔ وہ تیزی سے زینے کی طرف لپکی جیسے ہی اس نے پہلے زینے پر قدم رکھا' پھسل کے ڈگمگاتی ہوئی گری اور لڑھکتی ہوئی نیچے آرہی۔ اس پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔

نہ معلوم کتنی دیر بعد اس کے کانوں سے کچھ آوازیں ٹکرائیں لیکن وہ خود کچھ نہیں بول سکتی تھی۔ اس نے آوازیں غور سے سنیں کوئی لڑکا کہہ رہا تھا۔ "میں کہتا ہوں' یہ ٹھیک نہیں ہے چاہے جو کچھ بھی ہو وہ ایک لڑکی ہے۔"

"لیکن اب اسے کلب کی رکن بننے کا حق حاصل ہوگیا ہے۔" یہ کارل کی آواز تھی۔

روز کارل سے پکار کر کہنا چاہتی تھی کہ وہ اس کی مدد کرے۔ اسے سخت غصہ آیا کہ یہ لڑکے کیرن کے لئے کلب کی رکنیت جیسے احمقانہ مسئلے پر اس کے قریب کھڑے ہو کر بحث کر رہے ہیں۔ جب کہ وہ' جب کہ وہ ...... اسے اگلا لفظ سوچنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے کیرن کی آواز سنی۔ "پھر میں نے پہلے زینے پر بہت سا مکھن پھیلا دیا۔" کیرن کی آواز کچھ فاصلے سے آرہی تھی۔ "پھر میں نیچے آگئی اور منہ اوپر کر کے چیخنے لگی۔ یہ ترکیب کامیاب ثابت ہوئی۔"

کارل نے کہا۔ "میں کیرن کے لئے اپنے کلب کی باضابطہ رکنیت کا اعلان کرتا ہوں۔ وہ ابتدائی امتحان میں کامیاب ہوگئی ہے۔ اس نے ایک وقت میں دو شکار کئے ہیں اس طرح وہ ہم سے آگے بڑھ گئی ہے۔ کوئی میرے اعلان پر اعتراض کرنا چاہتا ہے؟" خاموشی رہی۔

کیرن نے کہا۔ "تم میں سے کسی نے کیروسین کے متعلق سنا ہے؟ میں نے سنا ہے آؤ میں تمہیں اس کے متعلق بتاؤں......"

شوکت افضل

پہلی قسط:

انا کی زنجیر

شوکت افضل کی زیرنظر کہانی ہمیشہ کی طرح دلچسپ کرداروں اور حقیقت سے قریب موضوع پر مبنی ہے۔ انھوں نے بڑی خوبصورتی سے ہمارے معاشرے میں بڑھتی مادہ پرستی اور دولت و وسائل رکھنے والوں کے کردار کی پستی کو بے نقاب کیا ہے۔ اس کہانی میں جہاں رومان کے رنگ دکھائے گئے ہیں وہاں ساتھ ساتھ کئی خوبصورت سبق بھی موجود ہیں۔ جب سچے جذبات کی قدر نہ کی جائے اور جائز ناجائز ذرائع سے دولت کو ہی اپنا سب کچھ تصور کرلیا جائے تو قدرت ایسے لوگوں کو کیسا سبق سکھاتی ہے، شوکت افضل کی اس کہانی میں بڑے پُراثر انداز سے یہ بات واضح کی گئی ہے۔ (مدیر)

ایک نوجوان کی کہانی جس کے جذبات کا مادہ پرست معاشرے میں کوئی مول نہ تھا

چوبی چھجوں اور بوسیدہ بالکونیوں والے کائی زدہ مکانات کے درمیان ناصر کا گھر بھی شامل تھا جو کسی کہن سالہ بوڑھے کی طرح کسی دم کا مہمان معلوم ہوتا تھا اور نجانے کتنی دیر سے بے مقصد کھڑا اپنے گردوپیش کو بیزاری سے دیکھ رہا تھا۔ اس محلے کی دیواریں مختلف فلمی پوسٹرز اور جلسوں کے اشتہارات سے اٹی ہوئی تھیں جن میں سے بیشتر اشتہارات قسم قسم کی بیماریوں کو چٹکیوں میں ٹھیک کردینے والے حکیموں، سنیاسی باواؤں اور قسمت کا ستارہ چمکانے والے نجومیوں کے تھے۔ ایک ردی خریدنے والا

کندھے پر تھیلے لٹکائے ہانک لگاتا گلیوں میں پھر رہا تھا۔ سامنے والے مکان کے دروازے کی شکستہ چق کے پیچھے سے ایک عورت نے اسے آواز دی۔

''اوہ!'' ناصر نے ایک گہری آہ بھر کر کہا۔ ''ہم سب تو خود اس محلے میں ردی کے سامان کی طرح ٹھنسے پڑے ہیں اور شاید ہمارا خریدار بھی کوئی نہیں۔''

ایک ٹوٹی ہوئی چق کے پیچھے سے عورت ردی اور ٹوٹے پھوٹے جوتے اور برتن نکال نکال کر باہر رکھ رہی تھی۔ اٹھی ہوئی چق میں سے پیچھے کمرے میں دیوار پر لگے فریم کیے ہوئے کپڑے پر دو خرگوشوں کی کڑھی ہوئی تصویر نمایاں طور پر نظر آ رہی تھی۔ یکایک گلی میں کھیلنے والے بچوں کا ایک غول شور مچاتا ناصر کے اردگرد پھیل گیا۔ ان میں چند ایک سرخ و سفید اور خوبصورت بچے بھی تھے جو میلے کپڑوں میں دمکتے ہوئے شاداب چہرے لیے چہکتے پھر رہے تھے۔ ناصر بھی اسی محلے میں جوان ہوا تھا مگر شعور میں آتے ہی اسے ان میلی کچیلی گلیوں اور اوپر تلے ٹھنسے مکانات سے نفرت سی ہو گئی۔ اس نے اپنے خیالات سے چونک کر اس طرح بچوں کو دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

''کاش ان معصوم چہروں اور شفاف روحوں کو ماحول بھی ویسا ہی ستھرا ملتا۔'' ناصر نے بیزاری سے لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

اس قسم کے سرخ و سفید بچے عموماً ان کشمیری کنبوں کی اولاد تھے جو تقریباً صدی پہلے تلاش معاش کی خاطر اپنے وطن کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب کے میدانوں میں اُترے تھے۔ ان کے بوجھ اٹھانے والے کسرتی جسموں کی وجہ سے اکثر کو پنجابی ریاستوں میں فن پہلوانی میں راجوں مہاراجوں کی سرپرستی میسر آئی اور پھر پنجاب کی آب و ہوا اور روایات میں مدغم ہو کر ان کا ایک اپنا ہی انداز بن گیا۔ یہ لوگ پنجابی بولتے، لمبے سڈول جسموں پر لمبے کرتے اور تہ بند استعمال کرتے۔ نکلے ہوئے پیٹوں کے ساتھ سینہ تان کر چلنا ان کا دیسی کشتی میں دلچسپی کا آئینہ دار ہوتا۔ فن پہلوانی کو زوال آیا تو پھر بھی ان ''پہلوان جی'' لوگوں نے دودھ، دہی، گوشت اور پھلوں سے ناطہ نہ توڑا۔ پہلے کھاتے تھے پھر بیچنا شروع کر دیا۔

جہاں تک ناصر اور اس کے خاندان کا تعلق تھا، اس کے آباؤ اجداد کا شمار کبھی مغلیہ دور کے امراء میں بھی ہوتا تھا۔ جب غدر پڑا تو اوروں کے ساتھ اس خاندان کو بھی بُرے دن دیکھنے پڑے لیکن اس کے باوجود رسی جل گئی مگر بل نہ گیا' کے مصداق یہ لوگ سر اٹھا کر ہی چلے لیکن پھر تقسیم کے وقت یہ لوگ ایسے اُجڑے کہ پھر ان کی کمر ہی ٹوٹ کر رہ گئی اور ان کے دکھوں کو سمجھنے والا کوئی نہ رہا۔ انہوں نے نامساعد حالات اور تقدیر کے کیسے کیسے جبر نہ سہے۔

ناصر نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے اور اپنی آنکھوں میں اُتر آنے والی نمی کو اپنی ہتھیلی پر جذب کرنے کی کوشش کرنے لگا اور پھر اندرونی کرب اور لاچاری سے مٹھیاں بھینچ کر اپنی گھسی ہوئی جینز کی جیبوں میں ٹھونس لیں اور اپنی کولہا پوری چپل گھسیٹتے ہوئے اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا ہو کر نہایت بیزاری سے اس بوسیدہ بوری سے بنے ہوئے پردے کو جھٹک کر اندر گھسا جو اس کے گھر کے دو بے رنگ دروازوں کے درمیان لٹک رہا تھا۔

''آٹا ختم تھا، کچھ چاول پڑے تھے میں نے اُبال لیے ہیں ساتھ شلجم کا سالن بنا پڑا ہے بیٹھ کر کھا لیتے تو میں بھی برتن دھو کر ذرا کمر لگا لیتی۔ آج نجانے کیا بات ہے جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے۔''

ناصر کی ماں نے اسے گھر میں داخل ہوتے ہی دیکھ کر کہا۔ تو ناصر کا موڈ اور کچھ بگڑ گیا۔ وہ بھنا کر بولا۔

''اماں میں نے کتنی بار کہا ہے مجھے عثمان کے پاس جانے دیں اب دیکھیں وہ وہاں کتنا کما رہا ہے دن پھیر دیئے ہیں اس نے ماں باپ کے بھی مگر ایک آپ ہیں کہ مجھے گھٹنے سے بندھا دیکھنا چاہتی ہیں۔ اس نے کتنی دفعہ مجھے بلایا ہے اگر آپ نے مجھے جانے دیا ہوتا تو اب تک آمدن کی کوئی نہ کوئی راہ کھل ہی گئی ہوتی۔''

''اللہ مالک ہے بیٹے' کھانے کو مل ہی جاتا ہے کہاں تم ٹھوکریں کھاتے پھرو گے۔'' اماں نے دھیمی اور متوکل آواز میں کہا۔

''ہاں روٹی تو کتوں کو بھی مل جاتی ہے ماں! لیکن یہ سسک سسک کر جینا مجھے بالکل پسند نہیں۔ ابا اب کہیں کمانے کے لائق رہے ہیں؟ اب یہ بھی کیا ہے کہ پیٹ بھر کھایا ہے تو لباس کا مسئلہ ہے اشتم پشتم لنڈے وغیرہ کا کپڑا نصیب ہوا تو پھٹے جوتے منہ چڑانے لگے اور پھر یہ جو آپ آئے دن پڑوسیوں سے اُدھار مانگتی ہیں نا پتہ ہے پھر یہ کتنا ذلیل کرتی ہیں آپ کو؟ چھری کی طرح کاٹتے ہیں ان کے طعنے میرے دل کو۔ دیکھا جائے تو ان میں اور آپ میں فرق ہی کیا ہے صرف یہی نا کہ ان کے مرد پردیس جا کر کمانے کو بُرا نہیں سمجھتے۔''

''اوہوں! پگلا نہ ہو تو۔'' صابر ماں نے پیار بھری تیوری سے بیٹے کو دیکھ کر کہا۔

''ماں یہ مذاق نہیں ہے میں صاف کہے دے رہا ہوں۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ میں نہیں رہ سکتا اب اس شہر میں۔''

ناصر نے اپنے سامنے رکھی چاولوں کی پلیٹ وہیں چھوڑی اور اُٹھ کر تیزی سے برآمدے کے چکر لگانے لگا۔

اماں کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے کتنی ہی دیر سوچتی رہی اور پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے بیٹے کی طرف غور سے دیکھا جس کے خوبصورت چہرے پر کرب تھا اور ماتھے پر اضطراب کی سلوٹیں پڑی تھیں اور پھر جیسے کوئی فیصلہ کر کے وہ اٹھی اور کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں روشنی کا صحیح انتظام نہ ہونے کے باعث دن میں بھی تاریکی کا سماں رہتا تھا۔ کچھ دیر کمرے سے ٹرنک کھلنے اور بند ہونے کی کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں اور پھر ناصر نے دیکھا کہ کمرے کی دہلیز پر کھڑی اماں اسے سرگوشی میں آواز دے رہی ہے۔

''ناصر......ناصر......ادھر آنا میرے بیٹے۔''

ناصر چپل گھسیٹتے ہوئے اماں کے قریب جا کر بولا۔ ''کیا بات ہے اماں؟''

اماں نے ایک پوٹلی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ناصر یہ پانچ سو روپیہ میں نے گور و کفن کے لئے سنبھال کر رکھا ہوا تھا بندے کا کچھ پتہ نہیں ہوتا لیکن اب تم اسے رکھ لو دیس پردیس کے معاملے میں کہیں ٹھوکریں ہی نہ کھاتے پھرو۔''

ناصر نے بھونچکا کر اپنی عظیم ماں کو دیکھا جو اسے تذبذب میں دیکھ کر فوراً کہنے لگی۔

''تھوڑے ہیں مگر یقین کرو ناصر یہ میری تمام عمر کی جمع پونجی ہے۔''

''ارے نہیں میری دُکھی ماں میں آپ کی تمام جمع پونجی نہیں لے سکتا۔ بس مجھے دو سو روپیہ دے دیں کرایہ وغیرہ بھی اسی میں ہو جائے گا۔ آپ بھی بیمار ہیں میرے بعد اگر آپ کو ضرورت پڑ گئی تو کس کے آگے ہاتھ پھیلائیں گی۔''

''بس بس رہنے دو۔ زیادہ باتیں نہیں کرو۔''

اماں نے پوٹلی اس کی جیب میں ٹھونس دی اور دوپٹے سے آنکھوں میں آئی نمی کو پونچھتے ہوئے کچن میں چلی گئی جو صحن کے ایک کونے میں ٹین کی چادروں سے بنا ہوا تھا اور دھونے کے لئے برتن اکٹھے کرنے لگی۔

ناصر کچھ دیر وہیں کھڑا اماں کے سراپے کو دیکھتا رہا اور پھر سر جھکا کر اندر سے اپنا چھوٹا سا ٹین کا پھولدار بکس نکال کر چارپائی پر رکھا اور پھر جوتا پہن کر تسمے باندھنے لگا۔

''اچھا تو اب میں چلا ماں اور اپنا خیال رکھنا ہاں ......''

اماں پیٹھ کیئے بیٹھی برتن دھو رہی تھی اور ناصر کو اس کے سامنے جانے کا حوصلہ ہی نہ ہوا اور اماں نے بھی پیٹھ کیئے کیئے گھٹنے پر ناک پونچھ کر سوں سوں کیا اور گلوگیر آواز میں بولی۔

''جاؤ خدا حافظ اللہ کے حوالے۔ اور ہاں کیا نام ہے اس حمیدے پہلوان کے بیٹے کا! ہاں عثمان۔ بیٹا سیدھے اس کے پاس جا کر ٹھہرنے کا بندوبست کرنا سمجھے اور خط بھی لکھنا۔''

''آپ فکر نہ کریں اماں بس دعا کرتی رہئے گا۔'' ناصر کہتا ہوا بوسیدہ پردہ اٹھا کر باہر گلی میں نکل گیا۔

عثمان ناصر کا پرانا کلاس فیلو اور دوست تھا اور ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ملازم تھا وہ جب کبھی چھٹی پر گھر جاتا ناصر کے گھریلو حالات دیکھتے ہوئے اسے ساتھ آنے پر اکساتا اب جو ناصر اس کے پاس پہنچ گیا تو اس نے ناصر کی رقم میں مزید کچھ اپنے پاس سے رقم ڈال کر ایسے سلیقے سے ناصر کو کام کی ابتداء کروائی کہ پہلی دفعہ ہی ناصر کے پاس دو ہزار روپے ہو گئے اور اس پہلے مرحلے میں ہی عثمان پر بھی واضح ہو گیا کہ ناصر بے پناہ ذہنی صلاحیتوں کا مالک ہے اب تو ناصر کو بھی ایک آس سی بندھ گئی شام کو اکثر کام کاج سے فارغ ہو کر وہ عثمان کے پاس ہوٹل میں جا بیٹھتا۔ قسم قسم کے لوگ دیکھتا' بھانت بھانت کی بولیاں سنتا اور محظوظ ہوتا۔ خوش باش جوڑے' جوان لڑکے لڑکیاں' بوڑھے بچے شام ہوتے ہی سیلاب کی طرح ہوٹل میں امڈ آتے۔ بنی ٹھنی پرفیومز میں بسی ادھیڑ عمر عورتیں جب بیوٹی پارلر میں سے ہو کر اپنے مردوں کے ساتھ ہوٹلوں میں داخل ہوتیں تو ان کو دیکھ کر ناصر کے دل سے اک ہوک نکلتی۔ اسے اپنی ماں یاد آ جاتی جس کے کپڑوں سے برتنوں اور پیاز کی بو نکلتی رہتی تھی جس کے خوبصورت چہرے پر جفاکشی اور غربت کی گھٹائیں چھائی رہتی تھیں جس کے ہاتھوں اور بازوؤں پر رگوں کے جال اُبھر آئے تھے اور وہ وقت سے بہت پہلے بوڑھی دکھائی دینے لگی تھی وہ ابھی تک بھی اپنی ماں کو کچھ بھی نہ بھیج سکا تھا اور زیادہ سے زیادہ رقم جمع کر کے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار جمانا چاہتا تھا مگر وہ قدرت کی اس تقسیم پر اکثر کڑھتا رہتا۔

''میرے مالک کہیں تُو نے بے تحاشا دیا اور کہیں اتنا بھی نہیں کہ گزارا ہی ہو سکے۔''

ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے آپ سے کہتا ناصر کو اکثر آنے جانے والوں کو گھورنے اور ٹھنڈی سانسیں بھرتا دیکھ کر عثمان کنکھیوں میں اسے نوٹ کرتا اور پھر ناصر کی پیٹھ تھپک کر حوصلہ دیتا۔''

''ارے یار ناصر کیوں اتنی آہیں بھرتا ہے تیری یہ ٹھنڈی سانسیں چھری کی طرح اُتر جاتی ہیں میرے سینے میں۔ دیکھ خوش رہا کر ہر وقت۔''

''سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہتا ہے کہ خوش رہا کروں۔ آخر کس برتے پر ڈھیٹ لوگوں کی طرح دانت نکالتا پھروں۔ میں تو خواہشوں کے تعاقب میں نکلا ہوا ایک بے راہ رو مسافر ہوں جو بے یقینی کی دھند میں بھٹکتا پھر رہا ہے۔'' ناصر نے گلوگیر

لہجے میں کہا۔

''چچ چچ۔'' عثمان نے چہرے پر مصنوعی غم کا تاثر لاتے ہوئے اپنی مسکراتی ہوئی چمکدار آنکھیں ناصر کے چہرے پر مرکوز کردیں اور نگاہیں قدرے سکیڑتے ہوئے بولا۔

''تیرے جیسا خوشنما چہرہ' لمبا قد' خوبصورت مضبوط ہاتھ پاؤں اور یہ بڑی بڑی ذہین آنکھیں میرے پاس ہوتیں تو میں ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا۔ ذہنی صلاحیت بھی اللہ تعالیٰ نے دینے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ہمت مرداں مدد خدا۔ ارے بھئی اور کیا چاہتے ہو۔ ابھی عملی دنیا میں قدم رکھے دن ہی کتنے ہوئے ہیں جانِ من جدوجہد کئے جاؤ پھر دیکھو کیسے بند راستے کھلتے ہیں۔''

باتیں کرتے کرتے عثمان کی نظر دروازے پر جا کر ٹک گئی۔ تو ناصر نے بھی سر موڑ کر ادھر دیکھا تو سامنے والے دروازے سے ایک پختہ عمر کا آدمی نہایت قیمتی سوٹ پہنے آنکھوں پر سونے کی کمانی کا چشمہ لگائے اندر داخل ہورہا تھا۔ عثمان آہستہ آہستہ ناصر کو بتانے لگا۔

''ناصر یہ اس شہر کا کروڑ پتی آدمی ہے سیٹھ کریم بخش۔ سب کہتے ہیں کہ شروع شروع میں یہ نہایت معمولی آدمی تھا' دیکھتے ہی دیکھتے دولت اس کی لونڈی بن گئی۔'' یہ سنتے ہی ناصر نے اس طرح آنکھیں پھاڑ کر سیٹھ کی طرف دیکھا جیسے دنیا کے آٹھویں عجوبہ کو دیکھ رہا ہے۔ اتنے میں جب سیٹھ قریب سے گزرنے لگا تو اسے دیکھتے ہی عثمان اٹھ کھڑا ہوا۔

''السلام علیکم سر!'' عثمان نے نہایت نیازمندی سے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم۔'' سیٹھ کریم بخش نے نخوت سے سر موڑ کر عثمان کو دیکھ اور پھر قدرے ملائمت سے سلام کا جواب دیا اور پھر اپنی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ناصر پر اس کی نظر جاٹکی۔ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ کے بعد سیٹھ کریم میز کے ساتھ لگی نشست پر جا بیٹھا۔ اُسے دیکھتے ناصر سمیت تمام بیرے اور ہوٹل کے ملازمین اس کے اردگرد منڈلانے لگے۔

تھوڑی دیر بعد جب ناصر اُٹھ کر چلا گیا تو عثمان کو بلا کر سیٹھ نے اس سے ناصر کے متعلق پوچھا۔

''وہ تمہارے ساتھ خوبصورت سا آدمی کون بیٹھا تھا؟''

''سر وہ میرا دوست ہے اور چند دن ہوئے کام کی تلاش میں یہاں آیا ہے۔''

''ہے کس قماش کا؟'' سیٹھ قدرے ابرو اوپر چڑھا کر بولا۔

''سر اے ون' آدمی ہے۔ ذہین' محنتی' آگے بڑھنے کا عزم لئے ہوئے لیکن غریبی اس کی ترقی اور خوشحالی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔'' عثمان نے بتایا۔

''میرا خیال ہے اسے میں کام دے دوں تو کیسا رہے گا۔'' سیٹھ نے کہا۔

''سر! آپ آزما کر دیکھ لیں لڑکا بے حد شریف اور جفاکش ہے۔ تنگدستی سے گھبرا کر گھر سے نکلا ہے۔ میرا خیال ہے ڈٹ کر کام کرے گا۔'' عثمان خوش ہو کر بولا۔

''ہوں۔'' سیٹھ پر سوچ انداز میں بولا۔ ''اچھا اسے کل میرے پاس لے آنا۔ تمہاری سفارش پر میں اسے رکھ لیتا ہوں مگر ایک بات کا خیال رہے اسے یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ میں نے خود اسے رکھنے کا خیال ظاہر کیا ہے۔''

''بہت اچھا سر، تھینک یو سر۔'' عثمان نے بے حد شکر گزاری سے سر جھکا کر کہا۔

سیٹھ کے ساتھ کام کرتے ناصر کو تین چار ماہ سے زائد عرصہ ہو چکا تھا مگر ابھی تک اسے اپنے کام کی نوعیت سمجھ میں نہ آئی تھی یوں تو وہ کئی قسم کے چھوٹے موٹے کام اس کے ذمہ لگائے رکھتا جو کہ ناصر بڑی ذہانت اور خوش اسلوبی سے سرانجام دیتا مگر ایک کام جو کہ مہینے میں ایک دو بار اسے کرنا ہوتا وہ ناصر کو کھٹک جاتا اگرچہ اس نے اس کام کو بھی ابھی تک پوری ذمہ داری سے نبھایا تھا۔ سیٹھ اسے کچھ پیکٹ دیتا جو کہ اس نے نہایت خاموشی اور راز داری سے آبادی سے باہر واقع ایک پہاڑی کے پیچھے ایک وادی میں اس کے منتظر ایک آدمی کے حوالے کرنے ہوتے اور ہدایات کے مطابق وہ بغیر کوئی بات کئے واپس آتا۔ واپسی پر وہ شخص کچھ پیکٹ دیتا جو کہ وہ سیٹھ کو پہنچا دیتا۔ سیٹھ اس دن بڑا خوش ہوتا اور اس کی پیٹھ تھپک کر کہتا' ''لو بھئی آج تمہارے اکاؤنٹ میں مزید دو ہزار روپوں کا اضافہ ہوگیا۔'' اس کے علاوہ اپنے گھر بھیجنے کے لئے بھی اسے پانچ سو ہفتہ وار دیتا اور مزید اس کے اخراجات کے لئے بھی اسے خاصا دیتا دلاتا رہتا۔ اب ناصر محسوس کررہا تھا کہ اس کے دن پھر گئے ہیں اس کی صحت پہلے سے اچھی ہوگئی تھی وہ مزید نکھر گیا تھا۔ اعلیٰ لباس پہنتا اور آرام سے عثمان والے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھاتا۔ اب اس کے چہرے سے مایوسی کا نقاب سرک کر اس کی جگہ شگفتگی چھا گئی تھی۔ شکل و صورت تو قدرت نے نہایت فیاضی سے اسے بخشی تھی اوپر سے اچھی تراش خراش کا لباس اسے سب میں ممتاز کردیتا اور وہ ہر پہلو سے کسی اعلیٰ خاندان کا خوبرو نوجوان نظر آتا۔ اب تو ہوٹل میں آنے والی اونچے گھرانوں کی لڑکیاں بھی اسے پسندیدگی سے دیکھتیں لیکن ناصر سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بنا رہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ سب کچھ قبل از وقت ہوگا۔ ابھی اسے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لئے اپنا مکان چاہئے تھا بینک بیلنس چاہئے تھا تاکہ وہ اپنے والدین اور چھوٹے بھائی بہنوں کو پاس لاکر رکھ سکے۔ اسے اپنی مصیبت زدہ ماں ہمیشہ یاد رہتی۔ وہ اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا اور پھر ابھی تو اسے چھوٹے بھائی کو تعلیم دے کر کسی قابل بنانا تھا' بہنوں کی شادیاں کرنی تھیں۔

ناصر اکثر اپنے کام کی نوعیت کے بارے میں سوچتا رہتا جس کے بدلے ہر بار دو ہزار روپے کی رقم اس کے حساب میں جمع کردی جاتی۔

ایک دفعہ سیٹھ کو موڈ میں دیکھ کر ناصر پوچھ ہی بیٹھا۔ سیٹھ نے آنکھوں پر سے عینک کے شیشے اوپر تلے کرتے ہوئے غور سے ناصر کی طرف دیکھا اور پھر قدرے کھانس کر بولا۔

''لڑکے تم اپنے کام سے کام رکھو اور اپنی اُجرت لیتے جاؤ زیادہ پیچیدگیوں میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہرحال اتنا یاد رکھو کچھ چیزوں کے بارے میں ہمیں پہلے سے علم ہوتا ہے لیکن کچھ چیزوں کے بارے میں جاننے کے لئے ہمیں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ویسے یہ بتاؤ کہ یہ کام تمہیں مشکل لگ رہا ہے یا پسند نہیں آرہا؟'' سیٹھ نے ابرو اوپر اُٹھا کر ناصر کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں سیٹھ صاحب۔ نوکری تو نوکری ہی ہوئی۔ بس یہ سب ذرا عجیب سا لگتا ہے۔'' ناصر نے قدرے پرتجسس انداز میں کہا۔

''عادی ہوجاؤ گے تو کچھ بھی عجیب نہیں لگے گا۔ ایک وقت میں ایک چیز بلکہ کوئی بھی چیز اس وقت تک ہماری سمجھ میں نہیں آتی جب تک اس کا مناسب وقت نہ آجائے۔ بے صبری اور جلد بازی سے ہمیں سوائے الجھن اور انتشار کے اور کچھ بھی

حاصل نہیں ہوسکتا سمجھے۔'' سیٹھ نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔

''ٹھیک ہے جی۔'' ناصر نے سر ہلا کر کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا اور سلام کر کے باہر نکل گیا۔

سیٹھ ناصر سے کافی مطمئن اور اس کی جملہ کارکردگی سے خوش تھا چنانچہ اب اس نے ناصر کو اکثر گھر کے اندر بھی کسی نہ کسی کام کاج کیلئے بلانا شروع کردیا۔ معلوم تو یہی ہوتا تھا کہ اتنی بڑی عالیشان کوٹھی میں سیٹھ کریم اکیلا ہی رہتا ہے مگر اس دن جب ناصر نے سیٹھ کو اپنے آنے کی اطلاع دی تو اس نے اسے اندر ہی بلالیا۔ آج سیٹھ کریم بڑے موڈ میں تھا اور اپنی خوبصورت بیٹی کے ساتھ لان میں ہی بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ قریب ہی مخملیں گھاس پر بیٹھا السیشن کتا ناصر پر بھونکتے ہوئے لپکا تو سیٹھ ہنستے ہوئے بولا۔

''ارے بھئی گھر کا ہی آدمی ہے یہ تو پکی' اور بھئی بیٹھو ناصر۔'' وہ ایک علیحدہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ تو سیٹھ بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔'' بیٹے سارہ! یہ ناصر ہے ہمارا نیا اسسٹنٹ منیجر۔ پلیز اس کے لئے چائے کی ایک پیالی بنادو۔''

سارہ نے اچٹتی نظر سے ناصر کو دیکھا اور پھر سر جھکا کر چائے بنانے لگی ناصر نہایت محویت سے اسے چائے پیالی میں ڈالتے دیکھنے لگا۔

''شوگر۔'' ناصر کے کانوں میں جیسے ایک ننھا سا گھنگھرو بج اٹھا اور وہ یکدم اپنے خیال سے چونک پڑا اور گڑبڑائے سے لہجے میں بولا۔

''ڈال دیں جی جتنی مرضی۔''

سارہ کے ہونٹوں کا ایک کونا مسکراہٹ کو کنٹرول کرنے کی کوشش میں دب سا گیا مگر پھر لمحے کے تذبذب کے بعد اس نے ڈیڑھ چمچ چینی ڈال کر پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ پیالی تھامتے ہوئے ناصر احتراماً کھڑا ہوگیا۔ اس کی خوبصورت مرمریں انگلیوں سے پیالی لیتے ہوئے لحظ بھر کو ناصر کی نگاہیں سارہ کی بڑی بڑی آنکھوں سے چار ہوئیں اور اس لمحے میں ناصر نے اپنا دل سینے میں ڈولتا محسوس کیا اور میٹھی میٹھی کسک کا احساس ایک دھیمی دھیمی خوشبو کی طرح اس کے من کو آنچ دینے لگا۔ اس دن ناصر گنگناتا ہوا سیٹھ کریم کے گھر سے نکلا۔ اب اس کی زندگی اور ہی ڈگر پر چل نکلی تھی؛ اسے نوکری مل چکی تھی اور رہائش کا انتظام ہوچکا تھا۔ مالی حالات بھی اطمینان بخش تھے اور اب وہ ایک ایسی ہستی سے ملا تھا جس نے اس کی بے رس زندگی کو اک نئے کیف سے آگاہ کیا تھا۔ اب وہ اپنی خداداد ذہانت اور کارکردگی کا زیادہ مظاہرہ کرنے لگا تھا۔ نتیجتاً اسے سارہ کے زیادہ قریب آنے کا موقع ملنے لگا۔ سارہ کو دیکھتے ہی ناصر کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی اور وہ پروانے کی طرح اس کے گرد منڈلانے لگتا۔ ناصر ایک سمجھ دار نوجوان تھا جس کا دامن آج تک کسی بھی بے راہ روی سے آلودہ نہ رہا تھا مگر سارہ کے بارے میں اسے نجانے کیا ہوگیا تھا' بے شک سارہ کا تصور جانفزا تو تھا مگر وہ اتنا بھی نادان نہ تھا کہ اپنے اور اس کے درمیان طبقاتی حد بندی کو نہ سمجھ سکے۔ اس کے باوجود نہ تو اس نے اپنے جذبوں پر بندھ باندھنے کی کوشش کی نہ ہی اپنی کم مائیگی کا خیال کیا۔

جہاں تک سارہ کے رویئے کا سوال تھا ناصر کسی فیصلہ پر پہنچنے سے قاصر ہی رہا یا تو وہ اتنی معصوم اور بھولی بھالی تھی کہ اسے دنیا کی ہوا ہی نہ لگی تھی اور یا اس نے اپنے اردگرد ایسا حصار کھینچ رکھا تھا کہ کوئی دوسرا آدمی اس کے مزاج یا اس کے احساسات کی تہہ تک پہنچ ہی نہ پائے۔ کبھی تو وہ نکہت آمیز ہوا کا اک خنک اور سبک رو جھونکا محسوس ہوتی' جس کے

سکون بخش احساس سے آنکھیں مند نے سے لگتیں مگر کبھی وہ گھنگھور گھٹاؤں کی چادر تنے آسمان کی طرح نظر آتی پراسرار نا قابل فہم اور نا قابل تسخیر۔

اگلے دن اس گلشن میں ناصر کا سارہ کے بارے میں عثمان سے ذکر چلا تو عثمان قدرے بھونچکا سا رہ گیا۔ اس نے ناصر کو سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''دیکھو یار! میں سمجھتا ہوں ابھی ان باتوں کا وقت نہیں آیا۔ ابھی تم نے اس ظالم دنیا میں قدم جمانے کے لئے بہت کچھ کرنا ہے۔ ٹھیک ہے تم ایک باصلاحیت نوجوان ہو مگر فی الحال تمہاری صلاحیتیں تیشہ طلب ہیں۔ میں تمہارے یہ مضبوط بازو، روشن ذہین آنکھیں اور اعلیٰ دماغ محض عورتوں کو متاثر کرنے کے فضول کام میں ضائع ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''اس لئے تو میں تمہارے پاس آیا تھا۔ تم سے زیادہ مجھے کون جان یا سمجھ سکتا ہے۔ تمہارا وجود میرے لئے حوصلے اور برکت کا سبب بنا عثمان اور آج ابھی میں جس حیثیت میں ہوں تمہاری وجہ سے ہی ہوں لیکن......؟''

ناصر نے عثمان کے کندے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا مگر عثمان نے اس کی بات کو درمیان سے ہی کاٹ دیا اور کہنے لگا۔

''ان جذبات کے اظہار کا یہ موقع نہیں ہے دوست بس تم ایک دفعہ اپنے دل کو ہر قسم کے خیالات سے صاف کر کے سیٹھ کے دل میں اپنا مقام پیدا کرنے کی کوشش کرو پھر دیکھو وہ تمہیں کتنا اونچا لے جاتا ہے۔ محنتی لوگ اسے بے حد پسند ہیں اور پھر یہ خود بھی تو جو کچھ آج تمہارے سامنے ہے انتھک محنت کی بنا پر ہی ہے۔ رہ گئی سارہ والی بات تو اس کے بارے میں، میں تمہیں صاف صاف کہے دیتا ہوں سارہ ایک ایسے باپ کی اکلوتی واحد اولاد ہے جو پائی پائی پر نگاہ رکھنے والا ایک مادہ پرست بوڑھا ہے جو کہ اپنی اس بیٹی کو بھی بھاری سرمایہ سمجھ کر کسی خاص وقت پر اسے اپنے کسی کاروبار میں لگائے گا اگر اس وقت اسے تمہارے خیالات کی ہوا بھی پہنچ گئی تو میرا خیال ہے وہ حریص آدمی کبھی تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ وہ اپنی اس بیٹی کو عام لوگوں کی نگاہوں سے بھی چھپائے پھرتا ہے۔ آیا کچھ تمہارے دماغ شریف میں؟''

عثمان نے گہری سوچ میں ڈوبے ناصر کی پشت پر تھپکی دے کر مسکراتے ہوئے کہا تو ناصر چونک پڑا اور غم بھری مسکراہٹ سے بولا۔ یار اس وقت میرے ذہن میں منیر نیازی کی جو مصری گردش کر رہی ہے

کج انج وی راہواں اوکھیاں سن
کج گل وچ غم دا طوق وی سی
کج شہر دے لوگ وی ظالم سن
کج مینوں مرن دا شوق وی سی

''عثمان میرے بھائی میرے دوست میں نے بھی اس نہج پر بہت سوچا ہے مگر نجانے کیا بات ہے میں اس طرف کھلنے والی اپنے ذہن کی کھڑکی بند نہیں کر سکتا اور پھر نوکری کی ہے دل و دماغ تو نہیں بیچا نا!''

''ہم لوگ زندگی کی سٹیج کے وہ کردار ہیں ناصر جن کا کوئی بیک گراؤنڈ نہیں۔ ابھی تم یہاں نئے نئے قدم رکھ رہے ہو نا۔ اس لئے ایسی باتیں کر رہے ہو مگر اس سے پہلے کہ ٹھوکر لگا کر وقت تمہیں سمجھائے میرا فرض بنتا تھا کہ تمہیں خبردار کر دوں اب آگے تمہاری مرضی۔'' عثمان نے آزردہ خاطر ہو کر کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

وقت پر لگا کر اُڑتا رہا۔ ناصر کو سیٹھ کریم کے پاس کام کرتے ہوئے ایک سال گزر چکا تھا۔ اب وہ پہلا سا ناصر نہیں رہا تھا۔ خوشحالی ڈھیرے ڈھیرے

اس کے گھر میں قدم جما رہی تھی وہ جب بھی والدین سے ملنے جاتا تحفوں سے لدا پھندا جاتا اور اب تو اس نے گندے محلے سے مکان بھی تبدیل کرلیا تھا۔ عثمان نے جب سے اسے سارہ کے بارے میں سمجھایا تھا تو وہ پہلے کی نسبت محتاط تو ہوگیا تھا پھر بھی سارہ سے جب کبھی سامنا ہوتا اسے اپنے دل پر اختیار نہ رہتا مگر لگتا تھا کہ سارہ کو بھی اپنے منفرد اور مخصوص ہونے کا شدید احساس تھا۔ ناصر اس سے کسی نہ کسی بہانے بات کرنے کی کوشش میں رہتا مگر وہ اکثر اسے منقش فریم والے بڑے سے صوفے میں دھنسی کسی مشہور انگریزی مصنف کے ناول میں کھوئی یا اپنی کسی انٹلکچوئل دوست کے ساتھ فون پر آرٹ، ادب اور کلچر پر گفتگو میں مصروف ملتی۔

سیٹھ کریم بخش بزنس کے سلسلے میں چند روز کے لئے ہانگ کانگ گیا ہوا تھا۔ جاتے وقت وہ ناصر کے ذمہ لگا گیا تھا کہ کچھ کمروں میں الیکٹریشن کے ساتھ رہ کر بجلی کی فٹنگ درست کرادے۔ کیونکہ ایئر کنڈیشنر صحیح کام نہ کررہے تھے۔ وہ روزانہ کوٹھی جاتا مگر سارہ سے اس کی ملاقات نہ ہوسکی۔ آخر ایک دن وہ اسے لان میں فوارے کے پاس بیٹھی مل ہی گئی۔ اس وقت وہ بڑے موڈ میں تھی اور اپنے السیشن کتے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ یہ گنگناتی سی سہ پہر تھی۔ فضا ایک مست آوارہ سی خوشبو سے بوجھل تھی۔

آج ناصر خاص طور پر نیا سوٹ پہن کر آیا تھا۔ جو اس کے لمبے چوڑے سراپے اور سرخ و سفید رنگت پر بے حد سج رہا تھا۔ بال بھی نہایت اہتمام سے سیٹ کئے گئے تھے جب وہ قریب سے گزرا تو اس کے پاؤں کی آہٹ پر سارہ نے مڑ کر دیکھا اور پھر اس کی نظریں ایک ثانیہ کے لئے ناصر کے وجیہ سراپا پر ٹک سی گئیں ناصر نے بھی سارہ کی طرف نظر بھر کے دیکھا۔ سارہ کے کانوں پر جھولتی ہوئی چھوٹی سی لٹ کے نیچے ایک آویزہ ستارے کی طرح ٹمٹما رہا تھا۔ گلاب کی پتیوں جیسے خوبصورت ہونٹ ذرا ذرا کھلے ہوئے اور بڑی بڑی خوشنما آنکھوں سے اپنی طرف اسے دیکھتے ہوئے ناصر کو وہ بڑی پیاری لگی اور جیسے کہ انہونی ہوکر رہتی ہے ناصر کے قدم بے اختیار اس کی طرف بڑھ گئے۔ اس وقت اسے کچھ یاد نہ رہا نہ تو طبقاتی اونچ نیچ نہ ہی عثمان کے پندونصائح۔ بس ایک وحشی سی آرزو خار دار جھاڑی کی طرح اس کے تن من سے لپٹ گئی اور ناصر سارہ کے قریب آ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

''بیٹھنے کو نہیں کہیں گی میڈم۔''

''ہاں ہاں بیٹھو کوئی ضروری کام ہے کیا؟'' سارہ نے اس کے دمکتے چہرے اور مسحور کن نگاہوں سے نظریں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''جی وہ کوئی کام تو نہیں تھا آپ کے ساتھ۔ صرف کچھ کہنا چاہتا تھا۔'' وہ ہاتھوں کو باہم رگڑتے ہوئے قدرے لجاجت سے بولا۔

''تو ٹھیک ہے کہہ ڈالئے پھر جلدی سے ساڑھے پانچ بجے میری ایک دوست بھی آرہی ہے۔'' سارہ نے جھٹ کلائی آنکھوں کے سامنے کرکے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ دراصل میں یہ کہہ رہا تھا کہ میرا روزانہ کئی قسم کی لڑکیوں سے واسطہ پڑتا ہے مگر آپ کی طرح مجھے کسی نے بھی اس طرح متوجہ نہیں کیا۔'' وہ خشک گلے سے تھوک نگل کر بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

سارہ نے قدرے تعجب سے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر بولی

''ہاں تو پھر۔''

ناصر کچھ نروس ہوگیا مگر پھر اپنے آپ کو سنبھال کر بولا۔ ''جی آپ تو نہایت حیرت سے مجھے دیکھنے

لگیں مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک انسان لاشعوری طور پر جب دوسرے انسان کو اپنی طرف کھینچتا ہے تو دونوں کے درمیان ضرور کوئی نہ کوئی ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔"

"ناصر صاحب کبھی آپ نے مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کی حقیقت کو سمجھا ہے۔" سارہ نے سرخ چہرے کے ساتھ کہا۔"میرے اور آپ کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے اور ایسی بات کرنے سے پہلے آپ کو سوچ لینا چاہئے تھا۔"

"یہ سب آپ کا خود ساختہ کامپلیکس ہے مس سارہ' ورنہ خدا کے نزدیک سب برابر ہیں اور پھر مجھ میں کس بات کی کمی ہے بہرحال وقت کے ساتھ ساتھ آپ کو خود ہی معلوم ہوگا کہ اس عالیشان حویلی کی اس عارضی جنت میں خود کو محبوس کر کے آپ روح کی اس پکار سے کان بند کر رہی ہیں جو کہ زندگی میں صرف ایک بار دل پر دستک دیتی ہے۔" ناصر نے بھی ہمت کر کے کہا۔

سارہ پہلے تو پوری کھلی آنکھوں سے ناصر کی بات سنتی رہی پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کی نیلاہٹیں شعلے سے اگلنے لگیں وہ کرسی سے یکدم اٹھ کھڑی ہوئی اور تلملاتے ہوئے پاؤں پٹخ کر بولی۔

"مائی فٹ۔ چلے جاؤ یہاں سے I SAY GET OUT" وہ انگلی سے گیٹ کی طرف اشارہ کر کے چڑھتے ہوئے سانسوں کے درمیان بولی۔

ناصر کو سارہ سے ایسے رویئے کی امید نہ تھی۔ پہلے تو اس نے بھونچکا ہو کر سارہ کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر باہر جانے کو قدم بڑھا دیئے۔ باہر سلگتی ہوئی سی شام چھا رہی تھی اداسی بال بکھرائے رو رہی تھی۔ ناصر خستہ اور درماندہ اپنے نوخیز ارمانوں کی لاش کندھے پر اٹھائے وہاں سے نکلا اور سارہ پاؤں پٹختی ہوئی کمرے کی طرف چل دی۔

جیون کے گہرے پانی میں ہے تو اک گرداب
میں ہوں اک سوکھی ٹہنی پر رکھا سرخ گلاب

کچھ دن بعد سیٹھ واپس آیا اور ناصر کو بلا بھیجا۔"میری عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر تم نے میری بیٹی کو ورغلانے کی کوشش کی۔ میں کہتا ہوں تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی نمک حرام ٹٹ پونجیے؟" سیٹھ زخمی شیر کی طرح پھنکارتے ہوئے بولا۔"میں نے آج تک اس پر کسی مرد کا سایہ تک نہیں پڑنے دیا۔" ایک اور نیا دھچکا' نیا صدمہ ناصر کے وجود کو جھنجھوڑتا چلا گیا۔

"تو سارہ نے صرف خود بے عزتی کرنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ باپ کو بھی میرے خلاف بھڑکا دیا۔" ناصر کے اکڑے ہوئے اعصاب مزید جھنجنا اٹھے۔

"بنیا باپ کی بنیا ذہنیت کی بیٹی۔" ناصر نے دانت پیس کر سوچا اور اس ایک لمحے میں جو پیار اسے سارہ سے تھا نفرت کا کڑوا زہر بن کر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

"گندی نالی کے ذلیل کیڑے! میں نے تجھے انسان بنانے کی کوشش کی اور تم لگے حد سے بڑھنے' تم نے اپنی حیثیت کو جلد ہی بھلا دیا۔ ہیں!"

"بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے انسان بنایا لیکن میرا خیال ہے کہ جسے خود انسانوں کی طرح بولنا نہ آتا ہو وہ کسی کو کیا انسان بنائے گا اور آپ کی اطلاع کیلئے عرض ہے سیٹھ صاحب کہ میں نے بھی دن رات ایک کر کے جان ہتھیلی پر رکھ کر آپ کیلئے انتھک کام کیا ہے۔" ناصر نے بھی جواب دیا۔

"میں کہتا ہوں بند کرو بکواس اپنی اور دفعان ہو جاؤ یہاں سے اور آئندہ کبھی اپنی صورت دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔" سیٹھ نے ہاتھ میں پکڑا بید لہرایا۔

"ٹھیک ہے آپ میرا حساب جو آپ کے ذمہ نکلتا ہے وہ بے باق کر دیں میں خود بھی ایک

منٹ یہاں رہنا نہیں چاہتا۔'' ناصر نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

''حساب' کیسا حساب' کس کا حساب کون سا حساب؟ ارے میاں چلتے پھرتے نظر آؤ۔ یہ جو اعلیٰ سے اعلیٰ پہنتے اور کھاتے رہے اور گھر بھیجتے رہے یہ سب تمہارے باوا کا مال ہے کیا؟ نہ تو یہ فرم تمہاری نہ ہی تم پارٹنر محض دو کوڑی کے ملازم ہو کر اتنی اکڑ فوں دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔؟'' سیٹھ تمسخر بھرے لہجے میں بولا۔

''مگر وہ رقم جو ہر بار مال پہنچانے کے بعد آپ کہا کرتے تھے کہ دو ہزار مزید تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اب تک لاکھ سے اوپر ہو چکی ہے میں اس کا ذکر کر رہا ہوں۔ کوئی خیرات نہیں مانگ رہا۔'' ناصر نے دانت بھینچ کر کہا۔'' نہ ہی انعام مانگ رہا ہوں۔''

بوڑھے کے سر کو جھٹکا سا لگا اور غصے سے اس کے سر کے بال جیسے کھڑے ہو گئے۔ اس کے خرانٹ مکروہ چہرے پر مزید خباثت پھیل گئی۔ وہ کھوکھلا سا قہقہہ لگا کر بولا۔'' ٹھیک ہے جلد ہی تمہیں تمہارا حق بھی مل جائے گا اور انعام بھی لیکن اس وقت جتنی جلدی ہو سکے میری نظروں کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔'' وہ اپنی استخوانی انگلی اٹھا کر بولا۔

اور پھر اسی رات سیٹھ کے کرائے کے غنڈوں نے ناصر کو اس کا حق بھی دلوا دیا اور انعام بھی۔

جب ناصر کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک نیم تاریک کمرے میں چارپائی پر پڑے پایا۔ طاقچے پر رکھی ایک لالٹین کمرے کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ مٹی کے تیل اور سیلن کی بدبو اس کے اردگرد پھیلی ہوئی تھی وہ آنکھیں جھپ جھپک کر چند ثانئے سوچتا اور حیران ہوتا رہا۔

''میں کون ہوں؟' کیا ہوں؟ ' کیوں ہوں؟ اور کس جگہ پر ہوں؟'' ہر سوال ایک لمحہ کیلئے ذہن کی دھند سے اٹھتا لیکن جواب نہ پا کر پھر اسی دھند میں کھو جاتا۔ اس نے سر ہلانے کی کوشش کی تو درد کی شدت سے اس کی چیخ نکل گئی اور اس کا سر جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر سر کو ٹٹولا۔ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی مگر کانوں اور گردن کے نیچے خون کے کھرنڈ جمے ہوئے تھے۔ اس نے ٹانگ سرکانے کی کوشش کی مگر معلوم ہوا تمام جسم کا جیسے انگ انگ جدا ہو چکا ہے۔ ایک دل دوز کراہ اس کے زخمی سینے سے نکل کر کوٹھڑی میں گونج اٹھی۔

یکلخت ایک سایہ سا لپک کر اسکی طرف آیا اور اس پر جھک گیا مگر اتنے میں وہ پھر بیہوشی کی سرحدوں کو چھونے لگا اور پھر نجانے کتنی ہی ساعتیں ہوش و بے ہوشی کے پل صراط پر گزارنے کے بعد اس نے مکمل طور پر ہوش میں آتے ہوئے جب آنکھیں کھولیں تو کوٹھڑی کی کھڑکی میں سے آتی ہوئی روشنی کی کرنوں اور جنگل کے پیڑوں کی تازہ خوشبو نے اسے زندگی کا احساس دلایا۔'' کیا میں زندہ ہوں ہاں شاید میں زندہ ہوں لیکن میں تو مر گیا تھا۔'' وہ سوچنے لگا اور اس کا ذہن جیسے خلا میں ہچکولے کھانے لگا۔

''اب یہ مکمل ہوش میں آچکا ہے اور اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔''

قریب بیٹھے ڈاکٹر کی آواز پر اس نے آنکھیں گھما کر دیکھا۔ سامنے ایک بوڑھا کھڑا مترحم نظروں سے اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''مگر اس کی صورت میں واضح تبدیلی آجائے گی۔'' ڈاکٹر نے اس کے ناک کے بانسے پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا ڈاکٹر کے رخصت ہونے کے بعد بوڑھے نے ناصر سے پوچھا۔'' اب زیادہ درد تو نہیں ہو رہا ہے بیٹے؟''

ناصر نے غور سے بوڑھے کو دیکھا تو اس کی صورت جانی پہچانی نظر آئی۔

''مجھے پہچانو ناصر میں سیٹھ کریم کا منشی ہوں جب غنڈے تمہیں ختم کر کے جنگل میں پھینک گئے تو میں جو چپکے چپکے ان کا پیچھا کر رہا تھا تمہارا نیم مردہ جسم ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا۔ ان کے جانے کے بعد میں تمہیں اٹھا کر اس کوٹھڑی میں لے آیا۔ ڈر کے مارے ہسپتال تو نہیں پہنچا سکتا تھا یہ خدا ترس ڈاکٹر میرا پرانا واقف ہے اس سے میں نے تمام ماجرا بیان کیا تو اس نے اپنی تمام کوششیں تم پر صرف کر ڈالیں تم اب تک خون کی بوتلوں اور گلوکوز پر زندہ ہو اور تمہارا بچ رہنا بھی معجزے سے کم نہیں ہے۔ خیر میں اب تمہارے لئے چائے لاتا ہوں'' جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔'' یہ کہہ کر بوڑھا باہر نکل گیا۔

سیٹھ کے غنڈوں نے ناصر کو نہایت بے دردی سے مارا تھا۔ خصوصاً چہرے پر تو اسے ایسی ضربیں لگی تھیں کہ اس کے چہرے کی ہیئت ہی تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔ اب وہ قدرے بہتر تھا منشی نے اسے شہر سے باہر ایک جنگل میں نہایت خفیہ مقام پر رکھا ہوا تھا۔ تاکہ اس کے پاس اس کی آمدورفت کو کوئی معلوم نہ کرلے۔ وہ تقریباً روزانہ ہی ضروریات زندگی لے کر اس کے پاس پہنچ جاتا ناصر اس مخص کا نہایت ہی شکر گزار تھا وہ اکثر سوچتا کہ اگر یہ نہ ہوتا تو وہ جنگلی درندوں کا لقمہ بن گیا ہوتا۔

''بابا کیا تمہارا اس دنیا میں اور کوئی نہیں جو تم میرے ساتھ اتنی شفقت کا برتاؤ کرتے ہو؟'' ایک دن ناصر بابا سے پوچھ ہی بیٹھا۔ یہ سنتے ہی بڑے میاں کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے۔ ''بیٹے تم ٹھیک سمجھے ہو۔'' وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ایک بیٹی تھی وہ......وہ......مجھے اب تجھے بتاتے ہوئے سخت شرم محسوس ہوتی ہے' اسی خبیث مردود سیٹھ کریم بخش کی ہوس کا شکار ہوگئی۔ وہ نادان تھی شادی کے وعدے پر سبز باغ دکھا کر اسے کہیں کا نہ چھوڑا۔ یہ خرانٹ تو اس سے پہلے بھی کئی بھولی بھالی نادان ناعاقبت اندیش لڑکیوں کو برباد کر چکا ہے۔ میری بچی غیرت مند تھی' اس نے زہر کھا کر زندگی ختم کر لی۔ اس وقت سے میرے دل میں اس پیر فرتوت کیخلاف غم وغصہ کا لاوا اُبل رہا ہے۔ آرزوئے انتقام سے میں کب کا تلملا رہا ہوں مگر اپنی بے بسی اور بے مائیگی کی وجہ سے کوئی ذریعہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس طرح اپنے دل میں بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کروں۔''

یہ سب سنتے ہی ناصر نے اٹھنے کی کوشش کی مگر درد کی ایسی ٹیس اٹھی کہ ہڈیاں چرچرا کر رہ گئیں اور اسی درد کی اذیت اور بے پناہ کرب نے اس کے دل میں چھپی اس نفرت کی بھٹی کو مزید ہوا دی جو کہ اسے سیٹھ اور اس کی بیٹی سے ہو چکی تھی مگر وہ بھی بے بس تھا اور ہڈیوں کی مالا بن چکا تھا۔ اب ناصر وہاں تھا ہی کہاں اس کے چہرے کے نقوش جو انسان کی پہچان ہوتے ہیں اس طرح مسخ ہو چکے تھے کہ وہ کچھ کا کچھ بن چکا تھا۔

چند ہفتوں کے بعد وہ اس قابل ہوا کہ چاروں ہاتھوں پاؤں کے بل آہستہ آہستہ کمرے کے اندر چل پھر لیتا اور کوئی نہ کوئی چیز ہاتھ میں پکڑ لیتا۔ اب اس کی زندگی ایک لامتناہی صحرا تھی۔ ایک ہولناک تنہائی اور سناٹا تھا اور اس کی مجروح زندگی تھی وہ ایک چنچل بے کل لہر تھا جو ساحل سے ہم آغوش ہونے کی تمنا کرتے کرتے ایک چٹان سے ٹکرا کر پارہ پارہ ہو چکا تھا اب سب کچھ ختم ہو چکا تھا صرف اس کا لہو لہو وجود تھا۔ اس کے ریزہ ریزہ خواب تھے اور ان ریزوں کی چبھن اس کی روح کو تڑپاتی رہتی ایسی آندھی چلی تھی کہ اس کی منزل کا نام ونشان تک مٹ

کر رہ گیا تھا۔ ناصر کی رگوں میں خون کی جگہ پگھلی ہوئی آگ دوڑتی رہتی جس کی حدت سے جسم تو جسم اس کی روح تک جھلستی رہتی۔

بالآخر کچھ عرصے بعد وہ اتنی توانائی محسوس کرنے لگا کہ اب وہ سیدھا ٹانگوں پر کھڑا ہو سکتا تھا۔ بابا کے پاس سیٹھ کے بہت راز تھے اب ناصر کو بھی پتہ چل چکا تھا کہ سیٹھ ایک بہت بڑا اسمگلر تھا اور بظاہر بزنس کا چکر چلائے ہوئے تھا۔

''شکر کرو میاں تم پکڑے نہیں گئے ورنہ اب تک جیل کی ہوا کھا رہے ہوتے وہ تم سے سمگلنگ کا کام لیتا رہا ہے۔'' بوڑھے بابا نے ناصر کی پیٹھ پر تھپک کر کہا۔

''میں تو کہتا ہوں بابا اس دنیا میں غریب ہونا بھی بہت بڑا جرم ہے نجانے قدرت نے کیوں پیدا کردیا ہمیں۔'' ناصر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''قدرت کی ہر تخلیق میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہے میاں۔ اس کے نزدیک کوئی بھی شے غیر اہم نہیں ہے خدا کے نزدیک چھوٹا بڑا سب برابر ہیں وہ جسے چاہے جس طرح نوازے۔ قصور تو ہمارا اپنا ہے۔ ہمارے کردار میں وہ چیز نہیں ہے جو فطرت کا حصہ ہوتی ہے۔ ہمارے دل نفرتوں اور اونچ نیچ کی آماجگاہ ہیں لالچ اور ہوس ہمارا مقصد حیات بن چکے ہیں'' بابا نے متفکر لہجے میں جواب دیا تو ناصر کے منہ سے سرد آہ نکل گئی۔

''میں ہوں امیدوں کا قیدی اپنے لہو کا خواب
تمہاری خواہش زندان میرا۔''

جب ناصر تنہا ہوتا تو بے چارگی سے جھونپڑی کے چاروں طرف دیکھتا چند دن پہلے وہ ایک مسرور انسان تھا۔ جس کی قسمت کا ستارہ چمک رہا تھا مگر اب اس کی رنگین تمنائیں خاک میں مل چکی تھیں خوشیوں کے مدارج طے کرتے کرتے آسمان تک جا پہنچنا اور پھر پامال و مجروح ہو کر تحت الثریٰ کی پستیوں میں آ گرنا کتنا روح فرسا انقلاب تھا۔ ہر لمحہ ہر پل اسے اپنی بدقسمتی کا احساس دلاتے ہوئے گزرتا۔ روشنی کے بعد آنے والا اندھیرا کس قدر بھیانک لگتا ہے اور آج اس نے تنگ آ کر باہر نکلنے کا فیصلہ کر ہی لیا جب بابا آیا تو اس نے بتایا۔

''بابا میں ذرا اس جگہ تک جانا چاہتا ہوں جہاں میں سیٹھ کا مال پہنچایا کرتا تھا۔''

''ارے ارے پھر کہیں مصیبت میں نہ پھنس جانا۔ سیٹھ بڑا مکار اور کائیاں آدمی ہے۔'' بابا نے دہل کر کہا۔

''اب تو وہ مجھے کیا پھنسائے گا جب اس نے میرا حلیہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے اور پھر اس کے خیال میں تو مر کھپ بھی چکا ہوں۔'' ناصر نے زہر خند لہجے میں کہا تو بابا اسے پرسوچ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ٹوٹی ہوئی ناک ٹیڑھے جبڑے اور بڑھی ہوئی ڈاڑھی میں وہ ایک قطعی مختلف آدمی لگ رہا تھا۔

آخر وہ چھپتا چھپاتا عمارتوں اور درختوں کی اوٹ لیتا اس پہاڑی مقام کی طرف جا ہی پہنچا۔ جہاں وہ نادانستگی میں ہی جان ہتھیلی پر رکھ کر سمگلنگ کا سامان پہنچاتا رہا تھا۔

وہی دشوار گزار سرسبز پگڈنڈیاں بڑے بڑے پتھروں کے ساتھ اگی ہوئی گھاس میں سے سر نکالے بے شمار لہلہاتے ہوئے خود رو پھول دور پرے نشیب میں ایک ندی بہتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی جس کے رو پہلے پانی پر شفق کی کرنیں رقصاں تھیں اور گھاس کی پتیوں پر طلوع ہوتے سورج کی نظر پڑتے ہی شبنم کے موتی اپنا وجود کھونے لگے تھے۔ درختوں کی ٹہنیوں میں چھپی چڑیاں شور مچا رہی تھیں اوپر آسمان کی پہنائیوں میں پرندے پر پھیلائے اڑ رہے تھے فضا میں ایک رومان انگیز تاثر تھا اور

درختوں میں سے گزرتی ہوئی ہوا کی شائیں شائیں ماحول کو پراسرار بنا رہی تھیں۔

ناصر تھوڑا اوپر پہنچ کر ستا رہا تھا کہ اچانک فائر کی آواز سے اس کا دل ایسا دھڑکا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آگرے گا ناصر وہیں دبک گیا۔ ایک منٹ بعد پھر فائر کی آواز آئی ناصر نے اندازے سے سمت کا تعین کیا تو معلوم ہوا کہ فائروں کا رُخ کم از کم اس کی طرف نہیں ہے۔ تجسس نے پھر سر اٹھانے پر اسے مجبور کیا اور وہ آہستہ آہستہ رینگتا پتھروں کی اوٹ لیتا ہوا اوپر کو کھسکنے لگا اور جونہی وہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا تو ایک پتھر کے پیچھے سے سر نکال کر دیکھا۔

''اف میرے خدا یہ تو وہی غنڈے معلوم ہوتے ہیں جنہوں نے مجھے مارا تھا۔'' یکدم ناصر کے منہ سے نکلا اور پتھر کے پیچھے دبک کر ان کی حرکات و سکنات کو دیکھنے لگا۔

غنڈوں کے پاس ریوالور تھے اور وہ ایک شخص کا تعاقب کر رہے تھے جواباً وہ شخص بھی اوٹ لے لے کر فائر کر رہا تھا لیکن سخت زخمی معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے کپڑے خون سے تر تھے اور وہ بڑی مشکل سے ان سے جان بچا رہا تھا۔ ناصر کا دل جذبہ ترحم سے لبریز ہو گیا اور اس کا دماغ اس شخص کو ان غنڈوں کے چنگل سے بچانے کی کوئی تدبیر سوچنے لگا اور جونہی غنڈوں کا گھیرا اس کے گرد تنگ ہونے لگا ناصر دونوں ہاتھوں کا بگل سا بنا کر منہ پر رکھتے ہوئے دہشت زدہ آواز میں زور سے چلایا۔

''پولیس، پولیس ارے بھاگو بھاگو'' اور خود ایک چٹان کے پیچھے چھپ گیا۔ غنڈوں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر تتر بتر ہو کر بھاگتے اور ہوائی فائر کرتے ہوئے پرے کھڑی جیپ میں دھم دھم کود کر سوار ہو گئے اور ڈرائیور نے جیپ دوڑا دی۔

ناصر چٹان کے پیچھے سے نکلا اور بمشکل کسی نہ کسی طرح اس زخمی شخص تک جا پہنچا۔ اس آدمی کا چہرہ درد سے زرد ہو رہا تھا اور خون اس کے کپڑوں سے رس رہا تھا۔ ناصر کو دیکھتے ہی وہ خوفزدہ لہجے میں اٹک اٹک کر کہنے لگا۔

''ک...... کک......کون ہو تم...... میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''میں جو بھی ہوں تمہارا خیر خواہ ہوں دوست۔ مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں میں نے جب دیکھا کہ وہ تمہیں ختم کرنے کے درپے ہیں تو میں نے ہی پہاڑی پر سے جھوٹ موٹ پولیس پولیس کی آوازیں نکال کر ان کو بھاگنے پر مجبور کیا۔''

''بہت بہت شکریہ اللہ تمہیں اس نیکی کا اجر دے۔'' وہ بڑے کرب سے ہونٹ کاٹ کر کراہتے ہوئے بولا۔

''آپ کی حالت ٹھیک نہیں ہے آپ ٹھہریں تو میں کسی گاڑی کا انتظام کر کے آپ کو ہسپتال لے جاؤں۔''

''نہیں نہیں مجھے کہیں مت لے جاؤ، میں کہیں بھی جانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں مجھے یہیں چھوڑ دو۔'' ''یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ کو ایسی حالت میں یہیں چھوڑ دوں آخر انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں آپ کو کندھے پر اٹھا کر لے جاتا اگر خود بھی بیمار نہ ہوتا۔ بہرحال میرا خیال ہے کوئی نہ کوئی بس یا گاڑی مل ہی جائے گی۔''

''دیکھو میری بات سنو'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ''پولیس میرے پیچھے ہے اور پھر وہ غنڈے بے حد خطرناک ہیں میرے ساتھ وہ آپ کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے بس مجھے یہیں میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔''

ناصر عجیب شش و پنج میں تھا آخر اسے یاد آیا

جن دنوں وہ یہاں مال پہنچانے آیا کرتا تھا تو یہاں قریب ہی ایک جھونپڑی میں ایک مست ملنگ قسم کا شخص رہتا تھا ناصر کسی نہ کسی طرح بڑی مشکل سے اس شخص کو وہاں پہنچانے کی کوشش میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اب جھونپڑی خالی پڑی تھی لیکن وہاں ضروریات کی کافی چیزیں مل گئیں ناصر حتی الامکان اس کی دیکھ بھال کرتا رہا شہر جا کر کچھ سپرٹ مرہم اور پٹیاں وغیرہ بھی لے کر آیا مگر زخمی کی حالت دن بدن بگڑتی گئی۔ ایک تو وہ ڈاکٹروں کو لانے یا ہسپتال جانے کے بالکل خلاف تھا اوپر سے اب اسے تیز بخار نے بھی آ گھیرا وہ بے ہوشی میں ڈوبا ہوا رہتا۔

تیسری رات ناصر کی آنکھ لگی ہی تھی کہ اس کے کراہنے کی آواز پر پھر کھل گئی۔ ناصر اٹھ کر اس کے پاس گیا تو وہ بڑی مشکل سے کہنے لگا۔

''ناصر میری بات سنو' بڑے غور سے۔ میرا آخری وقت آ پہنچا ہے تم نے تو میری بڑی خدمت کی میں تمہاری اس انسان دوستی سے حد درجہ متاثر ہوا ہوں سیٹھ کا میں پارٹنر تھا اور ایک بڑی رقم پر میرا اس سے جھگڑا ہو گیا جو کہ میں کسی بھی صورت اس کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ رقم میں نے ایک جگہ دفن کر رکھی ہے جہاں سیٹھ کے غنڈے ساری زندگی نہیں پہنچ سکتے۔ تمہاری بے لوث رفاقت نے مرتے مرتے بھی میری اندھیری راہوں میں خلوص کی شمع روشن کی ہے میں تمہارے اس خلوص کی اور تو کوئی قیمت ادا نہیں کر سکتا مگر میں تمہیں وہ رقم اپنی طرف سے تحفہ میں دیتا ہوں اور یہ تحفہ تمہیں قبول کرنا ہو گا۔''

ناصر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے کبھی بھی اپنے سامنے کسی کو مرتے نہیں دیکھا تھا۔

دوسرے دن اسے خون کی ایک بڑی سی قے آئی اور وہ ہچکی لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ ناصر نے راتوں رات اسے دفن کیا اور قبر پر فاتحہ پڑھ کر آدھی رات کو اپنی پرانی جھونپڑی میں جا پہنچا جہاں بابا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں نے مل کر جب بریف کیس کھولا تو اس میں سے ساٹھ لاکھ کی رقم برآمد ہوئی ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بابا نے ایک پرانی رضائی ادھیڑ کر تمام رقم اس میں سی دی اور صبح کاذب کے ملگجے اندھیرے میں یہ شہر چھوڑ گئے۔

ناصر نہایت باصلاحیت نوجوان تھا اتنی بڑی رقم ہاتھ آ جانے کے بعد اس میں حد درجہ اعتماد بھر آیا۔ وہ ذہین نوجوان تھا مگر حالات کے ہاتھوں اس کی صلاحیتیں دبی ہوئی تھیں قدرت کی طرف سے دن پھرنے لگیں تو قسمت کی دیوی ایسے بھی مہربان ہو جایا کرتی ہے۔ اب ناصر بہت بڑا رئیس کہلاتا تھا اور اس کا بزنس بہت پھیلا ہوا تھا۔ پلاسٹک سرجری کے بعد اس کی پہلی سی صورت تو لوٹ کر نہ آ سکی تھی لیکن ٹوٹے پھوٹے نقوش کی سرجری ہو کر وہ پہل سے قطعی مختلف مگر نہایت ہی خوبرو دلکش اور وجیہہ شخص نظر آتا تھا۔ جسے دیکھ کر کوئی بھی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی ناصر ہے اب اس نے اپنا نام بھی بدل کر سیٹھ شاہد حسین رکھ لیا تھا۔

عزت' دولت' وثروت منڈیر پر بیٹھے اس کوے کی مانند ہے جو اڑ کر بھی اس منڈیر پر بھی اس منڈیر پر کائیں کائیں کرتا ہے۔

اس بے وفا کا شہر لٹی لٹی سی کوئی آرزو' بکھرا ہو کوئی خواب' جس خواب کی کرچیوں میں اس کے دل کا لہو شامل تھا۔ جب بھی وہ اکیلا ہوتا اس کے احساس کے ایوانوں میں ماضی کے عکس اس کی روح میں نشتر کی طرح اُتر جاتے اور وہ جیسے انگاروں پر لوٹنے لگتا۔ انتقام کی آگ اس کے حلق میں جیسے

کانٹے سے اُگا دیتی۔

آخر ایک دن اس نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو جہاز میں سیٹیں بک کروانے کیلئے کہہ ہی ڈالا اور وہ پتھروں کے اس شہر میں جہاں سے وہ اپنی بے آواز دستکوں کے ساتھ چور چور وجود کو لئے نکلا تھا' ایک بار پھر نئے انداز سے وارد ہوا اور آج کل عثمان والے اسی پرانے فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ اس کی شخصیت امارت اور شاہ خرچی کا بڑا چرچا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی ہوٹل کے منیجر کو پانچ لاکھ روپے بطور امانت رکھنے کو دیا اور منیجر کے حیران ہونے پر بولا۔

''ارے بھئی اتنی تھوڑی بہت رقم تو ساتھ رہتی ہے اور پھر میں خوامخواہ آپ لوگوں کو چیکوں اور بینکوں کے چکر لگوانے کی کہاں زحمت دیتا پھروں۔''

منیجر ایسا مرعوب ہوا کہ ہر وقت جی حضوری کرتے کرتے سیٹھ شاہد حسین کو ہوٹل کے تمام اندرونی حالات سے آگاہ کر دیا۔ معلوم ہوا کہ بظاہر چمکتا دمکتا کروفر والا ہوٹل اندر سے گھاٹے میں جا رہا ہے چنانچہ مالکان سے بات چیت کے بعد شاہد نے وہ ہوٹل خرید لیا اور اوپر والی منزل میں ردوبدل کر کے ایک شاندار سوٹ تیار کروایا۔ اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ جب وہ عثمان کے قریب سے گزرتا تو وہ بھی مودب ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا اور سلام کے لئے ہاتھ ماتھے پر رکھ لیتا اور سیٹھ شاہد حسین کے سیاہ چشمے کے پیچھے چھپی آنکھیں یہ دیکھ کر مسکرانے لگتیں کہ کیسا الو بن رہا ہے یہ اپنا جگری یار بھی مگر وہ وقت سے پہلے اس پر اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں
وہ اک خلش کہ جسے ترا نام کہتے ہیں

سیٹھ کریم بخش مع اپنی بیٹی سارہ کے ہوٹل میں اسے بیٹھا نظر آ ہی گیا۔ سیٹھ شاہد حسین بھی ان کے سامنے کی ایک میز پر جا کر بیٹھ گیا جونہی سیٹھ شاد حسین کے باڈی گارڈز نے سیٹھ کریم کی میز پر آ کر ادب سے سر جھکا کر کہا۔

''سر سیٹھ شاہد حسین صاحب سلام کہتے ہیں۔''

تو سیٹھ کریم نے چونک کر قریبی میز کی طرف دیکھا اور شاہد کی میز پر آ کھڑا ہوا سیٹھ شاہد نے بھی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

''سیٹھ صاحب! میں نے آپ کا بڑا چرچا سنا ہے مجھے آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ سارہ بیٹی آپ بھی یہاں آ جائیے۔ ان سے ملئے یہ وہ سیٹھ شاہد حسین صاحب جن کا کل میں ذکر کر رہا تھا۔ وہ دشمن جاں اپنی سیٹ سے اٹھی اور ایک لچکتی سرسبز ٹہنی کی طرح ہوا میں جھومتی ہوئی اس کے سامنے آ بیٹھی اور زیر لب تبسم کے ساتھ اپنی حیرت انگیز طور پر بڑی بڑی جھالروں والی پلکوں کو اٹھاتے گراتے جادو بھری آنکھوں سے سیٹھ شاہد حسین کو دیکھنے لگی۔

سیاہ چشمے کے پیچھے سے شاہد کی آنکھیں سلگ اٹھیں اور نفرت کی ایک تیز لہر اس کے تن بدن کو تیز دھار چھری کی طرح چیرتی چلی گئی۔ مگر وہ اپنے آپ پر کنٹرول کرتے ہوئے بولا۔

''ارے صاحب! اس شہر میں اس ہوٹل کو خرید کر میں بور ہو رہا ہوں۔ زیادہ رقم کے تو میں نے مختلف کمپنیوں کے شیئرز خرید رکھے ہیں اب کہتا ہوں کہ یہاں کے کسی تجربہ کار آدمی سے شراکت کر کے کوئی معمولی سا ستر اسی لاکھ کا کاروبار ہی کیوں نہ کر لوں۔

سیٹھ شاہد حسین نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لے کر منہ بگاڑتے ہوئے کہا۔ تو سیٹھ کریم بخش جو کہ اسے بڑی دیر سے کرید رہا تھا یہ سن کر اس کی باچھیں ہی کھل گئیں اور خوش ہوتے ہوئے کہنے لگا......

''جناب آپ کسی وقت فارغ ہو کر میرے دفتر میں تشریف لائیں تو ذرا گفت وشنید ہو جائے۔ سٹاک

ایکسچینج کا کاروبار ہے میرا شاید آپ میری شراکت اپنے ساتھ پسند فرمائیں۔ میرے کاروبار میں۔ بلکہ آپ یوں کریں کہ کل رات کا کھانا میرے ساتھ تناول فرمائیں۔ اس طرح گپ شپ بھی ہو جائے گی۔ اور ہمیں آپ کی خدمت کا موقع بھی مل جائے گا۔ جی؟"

بظاہر وہ بڑے اخلاق کا مظاہرہ کر رہا تھا مگر ناصر صاف محسوس کر رہا تھا کہ وہاں اخلاق کے علاوہ بھی کوئی بات ہے اور سارہ نے تو جن نگاہوں سے اسے دیکھا ناصر کے دل کی دھڑکنیں بے ربط سی ہونے لگیں۔ سارہ کا چہرہ اس کے دلی جذبات کی چغلی کھا رہا تھا۔ اس کے رخساروں میں ایک آگ سی دہک رہی تھی اور خمار آلود آنکھوں میں انجانے سے خواب نظر آ رہے تھے۔

"تم وہی شخص ہو مگر تب تمہارے نام کے ساتھ سیٹھ کا لیبل نہ تھا ناصر اور صرف اسی قصور کی بنا پر اس لڑکی نے تمہیں زندہ درگور کروا دیا تھا اور آج اس کی مخمور نگاہوں کی تتلیاں تمہارے خوشنما سراپے کے گرد نہیں بلکہ تمہارے بینک بیلنس پر اڑ رہی ہیں۔" یہ خیال آتے ہی ناصر کے ذہن کو جیسے سیاہ ناگ نے ڈس لیا۔ اس کا چہرہ متغیر ہونے لگا اور نفرت کی ایک تند لہر اسے شرابور کر گئی مگر ناصر کو اپنے احساسات پر کمال کا کنٹرول تھا اور دوسرے وہ اب سیٹھ شاہد حسین تھا اور اس روپ میں وہ سیٹھ کریم کے گھر ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ کہاں ایک وقت تھا کہ وہ وہاں دو کوڑی کا گھٹیا ملازم سمجھا جاتا تھا اور کہاں یہ عالم کہ وہ آتا تو سارہ اس کے راستہ میں بچھ بچھ جاتی اور اگر وہ نہ آتا تو فون پر فون کرتی۔

ان دنوں پھر بہار پورے جوبن کے ساتھ سیٹھ کریم کے لان میں اُتری ہوئی تھی۔ رنگ برنگے پھولوں کی خوشبو ہر طرف سرسرا رہی تھی اور موتی بکھیرتے فوارہ کے قریب ایزل رکھے سارہ کسی تصویر میں رنگ بھر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ ہی اس کی نظریں بار بار بے تابی سے گیٹ کی طرف اٹھ جاتیں۔ وہ خود بھی بہار کا اک حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے رخساروں کے گلاب نکھرے نکھرے لگ رہے تھے ورآنکھیں عجیب سی لو دے رہی تھیں۔

جونہی ناصر کی کار پورچ میں تیزی سے داخل ہو کر آ رُکی تو یکدم سارہ کا دل دھک دھک کرنے لگا وہ سرخ ہوگئی۔ اس ایک تابندہ لمحے کا اس کو صبح سے انتظار تھا۔ جب کار سے اتر کر قدم قدم چلتا ناصر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو سیٹھ شاہد حسین کی پذیرائی میں اس کے گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ مسکرا اُٹھے اور اس کی روح کی گہرائیوں میں نغموں کا ایک سروش سا گونجنے لگا اور شاہد حسین کے بھیس میں ناصر ایک لحہ کو رُکا اس نے غور سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہی چار دیواری، وہی مٹی، وہی گھاس، وہی پھول، وہی فوارہ، وہی سنگدل مرمریں پیکر اور اس کے دل کے سناٹوں میں سے ایک وحشی پکارا۔

"اٹھاؤ پتھر ان ہاتھوں میں اور کرو پتھراؤ اس منظر پر کیونکہ یہ وہی مقام ہے جہاں تمہارے معصوم خواب ریزہ ریزہ ہو کر بکھرے تھے۔ کیونکہ اس وقت تم ایک چمکتی دمکتی سپورٹس کار سے اُترنے کے بجائے قدم قدم چل کر اس کوچے میں آئے تھے۔ اس وقت تمہارے ہاتھوں پر زر و جواہر کے بجائے ایک محبت بھرے معصوم دل کا توشہ دھرا تھا اور چونکہ اس منڈی میں احساسات جذبات زر و جواہر کے پلڑے میں رکھ کر تولے جاتے ہیں اس لئے تمہارا دل اٹھا کر خاک پر پھینک دیا گیا قدموں تلے روند دیا گیا اور تمہارا وجود پامال و برباد کر دیا گیا۔"

لیکن پھر جلد ہی اس نے اندر کے اندھیروں میں چھپے تاخت و تاراج ناصر اور باہر کے سیٹھ شاہد حسین کے درمیان ایک دبیز پردہ حائل کر دیا اور چہرے پر ایک روشن اور دلکش مسکراہٹ سجاتے ہوئے پوچھا۔

''سیٹھ صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ ......وہ تو جی کل سے سنگاپور گئے ہوئے ہیں۔'' سارہ لجا کر بولی۔

''کب تک واپسی ہے؟'' ناصر نے پھولوں کے تختے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔

''شاید دو تین دن تک میرا خیال ہے آج رات فون پر ہی وہ اپنا صحیح پروگرام بتاسکیں گے۔'' سارہ نے برش ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا بنا رہی ہیں؟'' ناصر نے ایزل پر لگے نامکمل سکیچ پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔ جہاں درختوں کی سرسبز قطاریں سر ابھار رہی تھیں۔

''میرا خیال ہے کوئی جنگل بنا رہی ہیں لیکن چار دیواری میں گھرا ہوا انسان قدرتی نظارے کیا بنائے گا۔ ارے بھئی ہر چیز کے مکمل کرنے کے لئے پورا ماحول چاہئے ہی تو کیا خیال ہے کچھ وقت گھومنے پھرنے میں نہ گزارا جائے۔؟''

یہ سن کر سارہ کی روح تک جھوم اٹھی وہ دلربایانہ انداز میں بولی۔''آپ کہیں اور ہم نہ جائیں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے چلئے۔'' ناصر نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں ذرا کپڑے بدل لوں۔'' یہ کہتے ہوئے سارہ اندر چلی گئی۔

اور جب تھوڑی دیر کے بعد باہر آئی تو ہلکی گلابی ساڑھی میں وہ تازہ مہکتا گلاب لگ رہی تھی اس میں شک نہ تھا کہ وہ دنیا کی حسین ترین لڑکیوں میں سے ایک تھی اور اسے دیکھ کر ناصر کو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ شاید اسے پہلی بار ہی دیکھ رہا ہو اور آج اسے پھر اتنے قریب دیکھ کر اس کے ذہن میں ایک ہلچل سی مچلنے لگی۔

کار ان دونوں کو ایک انجانے جھونکے کی طرح اُڑائے لئے جا رہی تھی۔ وہ ناصر کے پہلو میں ایک بے خودی کی سی سرشار کیفیت میں گم بیٹھی تھی شام کی خنک مشکبار ہواؤں کے لطیف جھونکے اس کے بالوں سے کھیل رہے تھے۔ اسے یہ لمحات نہایت حسین و دلکش محسوس ہو رہے تھے اور اس کی رگ رگ میں اک نشہ ایک کیف سا دوڑ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ شاہد اسی طرح ڈرائیو کرتا رہے اور وہ اسی طرح سرور کے عالم میں کار کے ساتھ ساتھ دوڑتے نظاروں میں گم رہے۔

لیکن اسے کیا خبر تھی کہ جس کا ساتھ اس وقت اس کے لئے اس کے من کا سکھ بنا ہوا ہے وہ خود دکھ کی چادر اوڑھے نامرادی کے دھوم بھرے راستوں پر گامزن ہے۔ اس کے کپکپاتے ہونٹ کچھ کہنا چاہ کر بھی کچھ نہیں کہہ پا رہے۔ اس کی مجروح آنکھوں میں ٹوٹے خوابوں کی سنگدل کرچیاں پیوست ہیں اور اس کا دل پیار کی حلاوت سے خالی ہے۔ اس نقرئی خالی پیمانے کی طرح جو کسی شہزادے کے ہاتھ سے گر کر کسی کونے کھدرے میں اوندھا پڑا ہوا اور پھر سارہ نے دیکھا کہ سیٹھ شاہد حسین کے حسین اور وجیہہ چہرے پر پرچھائیاں سی لرز رہی ہیں اور وہ ساکت بیٹھا بالکل سامنے دیکھ رہا ہے اس کے جبڑے بھینچے ہوئے ہیں اور سٹیئرنگ کو تھامے ہاتھوں کی گرفت اس قدر مضبوط ہوگئی ہے جیسے سٹیئرنگ کو پیس ہی ڈالیں گے نجانے اس کے ذہن میں انتقام کے کیسے کیسے آتشیں بگولے رقص کر رہے تھے جو کہ اس کا تن من جھلسائے دے رہے تھے۔

سارہ سہم سی گئی اور اسکے دل میں وسوسے سر اٹھانے لگے۔ اچانک ہی ناصر نے بریک لگا کر کار روک دی اور سارہ کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ سارہ نے ہلکی سی چیخ ماری اور سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

(جاری ہے)